بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر ل ۴۷۸

رسالہ ۱۵

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ر مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اردوی معلّی
- عود ہندی
- دیوان غالب جیبی
- مکمل دیوان غالب

سرسید مرحوم

- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند ۸
- سیرت فریدیہ ۱۰

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- التقلید عمل بالحدیث ۱۲
- کتاب المحبت والشوق ۱۲
- مکاتیب
- آیات بینات ۲ حصہ

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- الحجاز النفیس
- سفرنامہ سر نیر ۲ جلد

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فاتن
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- نصیحت کا کرن پھول ۸
- جانورستان ۱۰
- بیاض آزاد
- تذکرہ علماء ۵
- نعت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم

- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- تشنیع حسن ۸

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- مرأۃ العروس ۱۰
- بنات النعش ۹
- توبۃ النصوح ۹
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر ۱۰
- مجموعہ نظم بے نظیر
- کمل مجموعہ لکچر
- منتخب الحکایات ۶
- چند پند ۶
- مبادی الحکمۃ

مولانا شرر مرحوم

- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہاں بیگم ۸
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب
- حیات سعدی
- حیات جاوید
- مقدمۂ شعر و شاعری
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات ۲
- شکوۂ ہند ۲

مولوی بشیرالدین احمد

- داستان دارالحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلان
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دولہن
- شمع ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی ۱۲
- شعرالعجم جلد اول
- شعرالعجم جلد دوم
- شعرالعجم جلد سوم
- شعرالعجم جلد چہارم
- شعرالعجم جلد پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام ۸
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱۰
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- کرزن نامہ
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم ۸
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲
- جغرافیہ طبعی ۸
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ ۶
- رسالہ علم تناسب ۶
- معاون الحساب ۱۲
- مساحت ۱۲

سید محمود مرحوم

- کتاب الاطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر ۱۲
- شرح قانون شہادت

مولوی نذیر احمد ناصر

- المدنیۃ الاسلام
- تحریر المرأۃ

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۶۹ — جلد ۲۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۹ جلد ۲۹   جولائی سنہ ۱۹۲۵ء

حسین شریف مکہ

(سلسلۂ الناظر ماہ جون ۲۵ء)

میں نے اپنے خیالات قلمبند کر کے ایک کرمفرما کے واسطہ سے عربی میں ترجمہ کرائے اور اُنھیں سے عبد النبی کشمیری کا پتہ حاصل کیا۔ جنکو آیندہ ترجمان بنانا منظور تھا۔ تلاش کر کے عبد النبی سے ملا تو اُنھوں نے کہا کہ اگر حکومت کی طرف سے طلبی ہو تو میں حاضر ہو جاؤنگا ورنہ اندیشہ ہے کہ مجھے نقصان پہونچ جائے گا۔ چنانچہ میں نے فواد خطیب سے ملکر پھر ملاقات کا وقت مقرر کرایا۔ اور اُنھوں نے میرے سامنے ایک شخص کو ہدایت بھی کر دی کہ عبد النبی کشمیری کو ترجمانی کی غرض سے بُلا رکھنا۔ میں وقت مقررہ پہ پہونچا تو فوراً شریف صاحب کے پاس بٹھادیا گیا۔ عبد النبی نہیں آئے تھے لہذا اُن کے لیے فواد خطیب نے ایک آدمی روانہ کیا۔ شریف صاحب اسوقت فارغ تھے اور ترجمان کے انتظار میں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جب عبد النبی آئے، تو میں جس کوچ پر بیٹھا تھا شریف صاحب خود اپنے مقام سے اُٹھ کر وہیں میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور ایک کرسی منگا کر عبد النبی کو قریب ہی بٹھا لیا۔ مگر جب میں نے اپنی یادداشت دینا چاہی تو شریف صاحب نے مجھ سے کہا کہ جو شکایت ہو زبانی کہو تاکہ اُسکا تدارک کیا جائے۔ میں نے ہرچند چاہا کہ شریف صاحب کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ

میں اپنی کوئی ذاتی شکایت نہیں بیان کرنا چاہتا بلکہ عام طور پر حجاج کو جو تکالیف ہیں اُن کو قلمبند کر دیا ہے تاکہ مناسب توجہ سے رفع ہو جائیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جسکے تدبر و دانشمندی کی دھاک بندھی ہوئی تھی، تھوڑی دیر کے لیے لاعقل محض ہو گیا تھا کہ اُسکی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی۔ کچھ دیر تک رد و قدح کے بعد ناچار میں نے عنان گفتگو دوسرے مباحث کی طرف پھیری اور خود حکومتِ ہاشمیہ کے حالات اور ارادوں کے متعلق سوالات شروع کر دیئے پھر کیا تھا، شریف صاحب کے سمند زبان و عقل میں سمندر کی سی روانی پیدا ہو گئی۔ میرے ایک ایک جملہ کے جواب میں وہ مسلسل دیر تک تقریر کرتے رہتے۔ اس اثنا میں میرٹھ کے شیخ علاء الدین کو لیکر فواد خطیب بھی آ گئے۔ شریف صاحب نے اُن سے کچھ باتیں کیں، کچھ مجھ سے۔ جب دیر ہو گئی تو فواد خطیب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے اُٹھنا چاہا، مگر شریف صاحب نے سلسلۂ گفتگو شروع کر دیا اور مجھ کو رُکنا پڑا۔ یہاں تک کہ فواد خطیب نے تنگ آ کر شیخ علاء الدین کو توجہ دلائی اور اُنھوں نے مجھ سے اُردو میں کہا کہ بادشاہوں کے یہاں اتنی دیر نہیں بیٹھتے۔ میں نے پھر اُٹھنا چاہا مگر شریف صاحب نے پھر سلسلۂ سخن شروع کر دیا اور مجھے روکا۔ فواد خطیب اور علاء الدین تو رخصت ہو گئے مگر ہماری گفتگو کا سلسلہ ختم نہ ہوا تا آنکہ اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ "آپ عالم الغیب تو نہیں کہ جو کچھ ہونا ہو اُس سب کا علم آپ کو ضرور ہو جائے۔ مترجم بیچارہ تھر تھرا کر گفتگو کرتا تھا اور جگہ جگہ جب شریف صاحب رعایا کے ساتھ اپنے حُسنِ سلوک اور حجاج کی خدماتِ عظیمہ کا ذکر کرتے اور اُس سے تصدیق کرنا چاہتے تو وہ غریب دیر تک اُنکی تائید کرتا رہتا، مگر جیسے ہی میری زبان سے یہ جملہ نکلا اور اُس نے رُک رُک کر اپنے الفاظ میں ادا کیا، شریف صاحب کا رنگ رخ متغیر ہو گیا۔ غصہ سے مُنہ تمتما اُٹھا اور کھڑے ہو گئے۔ اُن کے کھڑے ہو جانے کی وجہ سے میں اور عبد النبی بھی کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہی کھڑے شریف صاحب نے نہایت غصہ کی حالت میں اور کسی قدر بلند آواز سے کہا "میں اخبار نویسوں سے نہیں ڈرتا، آپ کو اختیار ہے جو چاہیے لکھیے۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" میں نے کوئی جملہ ایسا نہ کہا تھا جس سے یہ سمجھتا کہ یہ میرے تہدید آمیز فقرہ کا جواب ہے۔ اسلیے یہ خیال کر کے کہ غصہ نے شریف صاحب کی عقل میں فتور پیدا کر دیا ہے، مناسب سمجھا کہ ملاقات ختم کر دی جائے۔ اور بغیر ان باتوں کا کچھ جواب دیے فوراً ہی یہ ذکر چھیڑ دیا کہ میرے جانے کا وقت قریب ہے، جہاز آنے والا ہے ٹکٹ کا انتظام کر لیا گیا ہے لہذا ایک اونٹ کا حکم دیدیا جائے۔ اس ذکر سے شریف صاحب کا مزاج کسی قدر اعتدال

پر آگیا اور اُنھوں نے عبد النبی سے کہا کہ اِنکو یقین دلا دو کہ جیسے ہی جہاز بندرگاہِ جدہ میں لنگر انداز ہوگا مجھے اطلاع مل جائے گی اور میں سواری کا بندوبست کر دوں گا۔ اور میرے مزید اطمینان یا اپنے خلوص کا اظہار کرنے کے لیے یہ بھی اضافہ کیا کہ ان کا جہاز ہرگز نہ چھوٹنے پائے گا میں اسکی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔

ملاقات ختم کرکے جب میں نیچے کے کمرہ میں فواد خطیب کے پاس آیا تو اُنھوں نے بہت شکایت کی کہ آپ نے آج سارا وقت لے لیا جس سے ہمارے تمام ضروری کا غذات رہ گئے میں نے اپنی معذوری ظاہر کرکے اُن سے شکایت کی کہ میری روانگی کے لیے اونٹ کا انتظام تو شریف صاحب نے کیا ہی نہیں۔ فواد خطیب نے وعدہ کیا کہ میں خود صاحب الجلالۃ الہاشمیہ سے اس اس بارے میں گفتگو کرکے انتظام کرا دوں گا۔

دوسرے دن جب فواد خطیب سے ملا تو اُنھوں نے کہا کہ میرے ذکر کرنے سے پیشتر ہی صاحب الجلالۃ الہاشمیہ نے خود آپ کے قصدِ روانگی کا حال بیان کیا، اور مجھ سے فرمایا ہے کہ اگر وقت تنگ ہوگا تو میں اپنا موٹر دیدوں گا وہ اُس میں بیٹھ کر دو گھنٹے میں جدہ پہونچ سکتے ہیں۔ میں نے فواد خطیب سے کہا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں موٹر کی سواری کی حیثیت اور عادت نہیں۔ اسکے علاوہ میرے ساتھ وزنی سامان مثل آب زمزم وغیرہ کے ہے۔ بغیر اونٹ کے کام نہیں چلیگا۔ ورنہ ممکن تھا کہ جس طرح میں آیا تھا اُسی طرح ایک رات میں گدھے کی سواری پر واپس چلا جاتا۔ اور اسکے لیے حکومت کی اجازت بھی نہ درکار ہوتی۔ فواد خطیب نے اطمینان دلایا کہ اونٹ مل جائیگا جب جہاز جدہ پہونچ گیا تو میں نے پھر فواد خطیب اور شریف صاحب سے مل کر اونٹ کے لیے کہا، مگر دونوں صاحبوں نے اپنا وعدۂ سابقہ بھلا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاز مجھے نہ مل سکا۔

ایک دوست سے جب موٹر کے وعدہ کا ذکر کیا گیا تو اُنھوں نے ازراہِ محبت مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً چپکے سے جدہ چلا جاؤں۔ کیونکہ شریف بڑا ہی سفاک و ناپاک ہے وہ اپنے موٹر پر سوار کرا کے یہاں سے بھیجے گا اور راستہ میں مروا ڈالے گا۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ اس سے بڑھ کر میری کیا خوش قسمتی ہوگی کہ سرزمینِ مقدسہ حجاز پر درجۂ شہادت حاصل ہو۔ لیکن اگر وقت نہیں آیا ہے تو شریف کی شرارت سے انشاء اللہ محفوظ رہوں گا۔ میرے دوست کا اندیشہ غلط ثابت ہوا، اور شریف صاحب نے ایک حقیر شخص پر دستِ ستم دراز کرنے کا ارادہ ہی نہ کیا۔

شریف صاحب سے جو بات چیت ہوئی، اور حج کے بعد مکہ معظمہ و جدہ میں تقریباً چھ ہفتے

کے قیام میں جو حالات میرے علم میں آئے اُن سب نے مجھ کو یقین دلا دیا کہ میرے اُن دوستوں کی رائے جو شریف سے صدرجہ بیزار تھے' حرف بحرف صحیح ہے - اور جو کچھ حسن ظن بعض دوسرے احباب کی رایوں کو سنکر میرے دل میں پیدا ہوا تھا وہ یکسر رخصت ہو گیا -

شریف حسین کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ ترکی حکومت کے ارکان حل وعقد چونکہ لا مذہب ہیں اس لیے وہ کسی مسلمان کی ہمدردی و اعانت کے مستحق نہ تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی امداد میں جو روپیہ صرف کیا ہے' یہی نہیں کہ وہ قطعاً رائیگاں گیا' بلکہ اُنھیں کسی قسم کے ثواب کے بجاے خدا کے یہاں روزِ حشر میں اسکی جوابدہی کے لیے تیار رہنا چاہیے -

مسلمانان ہند ترکوں کی تو باوجود لا مذہب ہونے کے اعانت اور امداد کرتے ہیں مگر حجازیوں کی کچھ مدد نہیں کرتے جو دنیا میں سب سے بہتر مسلمان ہیں اور جنکی خدمت و اعانت کا اُنکو ثواب ملنا یقینی ہے -

حجاز میں شریعت اسلامیہ کا پورا احترام کیا جاتا ہے - ہم لوگ حجاج کو خدا کا مہمانِ عزیز سمجھتے اُن کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتے اور اُنکی خدمت کو اپنے لیے باعث سعادت جانتے ہیں -

مجھے خدا کے سوا کسی کا نہ ڈر ہے نہ بھروسہ - میں نہ انگریزوں سے ڈرتا ہوں نہ اہل ہند کی مخالفت کی پروا کرتا ہوں - بلکہ جس بات کو حق سمجھتا ہوں اُسی پر قائم ہوں -

میرے پاس ظاہری قوت اگرچہ نہیں ہے مگر جس خدا نے اصحاب فیل کے مقابلہ میں ابابیلوں کو بھیجا تھا وہ میرا مددگار ہے اور اُسی کی مدد میری قوت ہے -

میں اپنے ملک میں عدل و انصاف کرتا ہوں' غریبوں اور لاچاروں کی مدد کرتا ہوں' اور بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم نہیں کرنے دیتا اور ہر وقت شریعتِ اسلامیہ کے احکام کی تعمیل و ترویج میں کوشش کرتا رہتا ہوں - خدا اور رسول کے احکام کے خلاف میں اُن ترکوں سے کیسے اتحاد کر سکتا ہوں جنکی حکومت میں عورتوں کا دخل ہے اور جو مذہب کو چھوڑ چکے ہیں - (اس موقع پر شریف نے اپنے وزیر اعظم قاضی القضاۃ عبداللہ سراج کے پاس سے انگورہ کی مجلس ملیہ کا ایک عکسی فوٹو منگا کر مجھے اُن عورتوں کی تصویریں دکھائیں جو مجلس انگورہ کی رکن اور حکومت انگورہ میں نیز اعہدوں پر ممتاز ہیں) اور مجھ سے ہنس کر کہا کہ آپ اِن لوگوں سے اتحاد کرنے کی جو دعوت دیتے ہیں میں اُسکو کیونکر قبول کر سکتا ہوں -

میں نے خدا کے فضل سے اپنے ملک کو ترکون کے ظالمانہ پنجہ سے نکال لیا ہے اور میں

اُسکی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان تک قربان کردوں گا۔ حسین کی جان خدا، اُسکے رسول اور اس ملک کے لیے وقف ہے۔

آپ لوگوں کو اگر اسلام سے محبت اور خدا کا خوف ہے تو آپ کو چاہیے کہ حجاز کی خدمت کریں اور اپنے روپے سے یہاں کے لوگوں کی غریبی اور پریشانی کو رفع کریں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے بعض قومی لیڈر یہاں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میں اُنکے لیے چشم براہ ہوں وہ آئیں اور دیکھیں کہ حسین اسلام اور مسلمانوں کی کیسی خدمت کرتا ہے۔

حجاج کے متعلق میں نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کی مجھ کو خبر ہوتی رہتی ہے۔ اور میں ہر چھوٹی سی چھوٹی بے عنوانی کا تدارک کرتا رہتا ہوں۔ آپ کو اگر کچھ تکلیف ہوئی ہو یا کسی سے کچھ شکایت ہو تو مجھ سے کہیے اور اُس شخص کو پیش کیجیے، میں اُسکو سزا دوں گا۔

میں نے سنا ہے کہ کھنڈوانی (بمبئی کے ایک تاجر جو جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان موٹر رائج کرنا چاہتے تھے اور جنکو شریف صاحب کی عنایت سے بہت نقصان کے بعد اس خیال سے دستبردار ہونا پڑا) نے ہندوستان میں لوگوں سے کہا ہے کہ میں کافر ہوں، دائرۂ اسلام سے خارج ہوں، وہ جھوٹا ہے، بے ایمان ہے، دغا باز ہے اور خباثت سے اُسکا نفس لبریز ہے (شریف حسین کا جوش وخروش اور طلاقت لسانی کہاں سے لاؤں جو اُنکے اس حصہ تقریر کو بیان کرسکوں) شریف صاحب نے جو باتیں خود نہیں کہیں وہ فواد خطیب نے مختلف صحبتوں میں ظاہر کیں۔ جس سے مجھپر روشن ہوگیا کہ وفد خلافت کے لیے وہ کیوں چشم براہ ہیں۔ یہ سنکر کہ اہل ہند نے تیس لاکھ روپیہ ترکوں کو بھیجا، شریف حسین کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور اُس نے خیال کیا کہ اہل ہند کو بیوقوف بنا کر کسی صورت سے روپیہ حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ فواد خطیب نے ایک دن مجھ سے یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس کافی فوج اور اعلیٰ درجہ کے سردار جمع ہیں مگر روپیہ کی کمی کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کرسکتے، اگر اہل ہند ہمکو دس ہزار پاؤنڈ ماہوار ہم پہونچاتے رہیں جس سے کافی سامان حرب مہیا کیا جاسکے تو ہم تھوڑے ہی دنوں میں شام کو فرانسیسیوں سے اور عراق و فلسطین کو انگریزوں سے خالی کرالیں اور سارے عرب کو ایک متحد حکومت کے تحت لے آئیں۔ اس قسم کے چکموں سے شریف حسین اور اُنکے نبھارچوں کا خیال تھا کہ مسلمانان ہند کو لوٹنے کا خوب موقع ملے گا۔

شریف حسین نے اگرچہ پوری احتیاط برتی مگر فواد خطیب نے کبھی اس بات کے اظہار میں

کوتاہی نہ کی کہ ہم انگریزوں سے دلی نفرت رکھتے ہیں اور ہر ممکن طریقہ پر انکو زک دیکر تمام عرب کو خالی کرانا چاہتے ہیں۔

فواد خطیب، مصر میں تاریخ کے معلم رہ چکے ہیں، اسلیے تاریخی حوالوں سے اُنکی گفتگو لبریز رہتی تھی۔ اور اُنھوں نے مختلف تاریخی شہادتوں سے مجھے یہ باور کرانا چاہا کہ ترکوں نے تمام عربی حکومتوں کو برباد کیا۔ اور کبھی اتحاد اسلام کی پروا نہ کی۔ بلکہ ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد و ترقی کو پیش نظر رکھا اور اس بنا پر ترکوں اور عربوں کے درمیان کبھی اتحاد نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ عربوں کی ایک مستحکم حکومت جب قائم ہوجائے تو ترکی حکومت کے ساتھ دوستانہ رابطہ قائم کرلیا جائے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ عرب کی مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے اتحاد باہمی کی کیا صورت ہوگی؟ فواد خطیب نے کہا کہ جس وقت عراق، فلسطین اور شام ملک الحجاز کے قبضہ میں آجائیں گے اُسوقت بقیہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی ہمارے تحت میں رہنا قبول کرلیں گی اور نہ قبول کرینگی تو ہم اُنکو اپنی قوت سے رام کرلیں گے۔ شریف حسین اور اُنکے وزیر خارجہ نے جو کچھ کہا تھا اُسکی صداقت پر اگرچہ ایک لمحہ کے لیے مجھے اعتماد نہیں ہوا اور میں برابر سمجھتا رہا کہ یہ سب شاعری ہے۔ مگر زیادہ مدت نہ گزرنے پائی کہ اُن کا کذب عالم آشکارا ہوگیا۔ سلطان نجد کی چھوٹی سی ریاست کے مقابلہ میں اُنکے سپاہی اور ماہران فن حرب جنکی تعریف میں خطیب صاحب نے اپنی ساری خطابت صرف کردی تھی ایک مورچہ پر بھی نہ ٹھہرسکے۔ فرانس اور برطانیہ کا مقابلہ تو کیا خاک کرتے۔

دراصل شریف حسین نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ برطانیہ یا فرانس کوئی براہ راست حجاز پر حملہ آور نہ ہوں گے۔ اسلیے وہ اپنی انتہائی کمزوری کے باوجود ان حکومتوں کے مقابلہ میں اپنے تئیں ایک مدت تک محفوظ سمجھتا تھا۔ اور بعض مواقع پر دلیر اور اُنکے قابو سے باہر ہوجاتا تھا۔

اسی سال حج کے ختم ہونے پر ایک واقعہ پیش آیا۔ شام کا ایک تاجر حجاج کو جدہ سے عراق لیجانے کے لیے دو جہاز لے کر آیا اور دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں کم کرایہ کا اعلان کرکے اُس نے اپنے دونوں جہازوں کو بھر لیا۔ شریف کی طرف سے جو صاحب جدہ کے قائم مقام یا گورنر ہیں وہی ٹرنر مارسین اور نمازی کمپنیوں کے ایجنٹ ہیں۔ اُن کا اس میں خسارہ تھا لہذا اُنھوں نے شریف صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع دی اور اس معاملہ میں اعانت چاہی۔ شریف صاحب فوراً موٹر پر جدہ پہونچے اور کشتی پر سوار ہوکر اُن جہازوں پر گئے۔ اور تمام مسافروں کو جہازوں پر سے اُتروا دیا۔ اور کپتان کو بھی سخت سست کہا۔ مگر اُس نے کچھ پروا نہ کی اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اسکے بعد ساحل پر واپس آکر حسین نے اُس تاجر کو گرفتار کرا یا اور حراست میں لے لیا۔ جب فرانسیسی قنصل کو اس واقعہ کی اطلاع پہونچی تو اُس نے برطانوی قنصل کو درمیان میں ڈالا۔ برطانوی قنصل نے شریف صاحب کو بہت سمجھایا اور ڈرایا کہ آپ اپنے لیے کانٹے بو رہے ہیں فرانس سے اُلجھنا اچھا نہیں۔ تو حسین نے بیباکانہ جواب دیا کہ حسبی اللہ ونعم الوکیل۔ اور بڑی گفت وشنید کے بعد اُس تاجر کو رہا کیا۔ مگر اُسے اپنے جہاز خالی واپس لیجانا پڑے۔ اسی طرح بے ٹکٹ والے ہندوستانیوں کی جب کثیر تعداد جدّہ میں جمع ہو گئی تو اُس نے جہازی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ دس فیصدی بے ٹکٹ والوں کو مفت لیجائیں۔ کمپنیوں نے انکار کیا تو اُسنے فوراً دھمکی دی کہ ہم اپنے بندرگاہ میں تمہارے جہازوں کا داخلہ بند کر دیں گے۔ آخر کمپنی والوں نے برطانوی قنصل سے اعانت طلب کی اور حکومت ہند کو مجبوراً بین الاقوامی قانون جہازرانی کے علی الرغم کمپنیوں کو اجازت دینا پڑی کہ جتنے مسافروں کو چڑھانے کی اُنکو اجازت ہے اُتنے تو ٹکٹ والے چڑھائیں اور اُنکے علاوہ دس فیصدی کے حساب سے بے ٹکٹ والے مسافروں کو سوار کریں۔

شریف حسین نے جو باتیں کہیں اور جس قدر دعاوی کیے اگر واقعی حالات سے اُن کی تصدیق ہو سکتی تو یقیناً شریف کے متعلق بالکل دوسری ہی رائے کا اظہار ممکن ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ شریف کا قول وعمل بالکل متضاد تھا۔

سب سے پہلے شریف کی مذہبیت اور اسلامیت کو دیکھا جائے۔ اُسکا راتوں کو اُٹھکر کعبہ شریف کے گرد طواف کرنا، اول وقت میں نماز فجر ادا کرنا، خلافِ شرع لباس اور سامان آرائش سے احتراز کرنا اور ترکوں کی لامذہبیت پر اعتراض کرنا اگر مذہبیت کی علامت ہے تو کیا ترکی گورنر کے سامنے حرم محترم میں خلیفہ کی وفاداری کے حلف لیکر پھر خلیفہ سے بغاوت کرنا، ترکوں کو بلد الامین کے اندر اور مسجد الحرام میں ذبح کرانا، مسجد الحرام کے حجروں پر جنکی زمین مسلمہ طور پر حرم محترم میں داخل ہے مالکانہ قبضہ وتصرف کرنا، اُنکے بیع وشرائے اور اُنکے کرایہ پر چلانے کو جائز رکھنا، ملک الحجاز ہونے کے باوجود، اپنے اونٹ اور مکانات کو کرایہ پر چلانا، تجارتی کاروبار کرنا، نہر زبیدہ کے چندہ کو ذاتی کاروبار میں لگانا، غیر مسلموں کو مکہ معظمہ اور حرم محترم میں داخل کرنا، (برطانوی اسپتال کے عملہ کو سیر کی غرض سے مکہ معظمہ آنے کی اجازت دیگئی تھی) اور عراق، فلسطین وشام کو غیر مسلموں کے اقتدار میں دیدینا وغیرہ بھی مذہبیت واسلامیت کی نشانیاں کہی جاسکتی ہیں؟

اب ملک عرب سے محبت و ہمدردی کے دعاوی کو دیکھنا چاہیے - عرب کو ترکوں کی غلامی سے آزاد کرکے ایک عرب بادشاہت قائم کرنا یقیناً حب وطن اور قومی دردمندی کہی جاسکتی ہے لیکن بادشاہ وقت کا غریب بدووں کی واحد تجارت یعنی حجاج کے اونٹوں کے کرایہ میں سے نصف سے زائد (چودہ میں سے نو گنی) بطور حق حکومت لے لینا، چُنگی کے محصول میں یکلخت (ایک لاکھ سے کم کے بجائے پانچ لاکھ پاؤنڈ) اضافہ کرنا، نئے محصول جاری کرنا، شہر کے دوکانداروں کو شاہی تجارت کے مقابلہ کی زد میں لاکر تباہ کرنا، سیکڑوں برس کے رائج الوقت سکوں کو یکقلم منسوخ کردینا اور اُن کا بدل نہ دینا، ایک پیسہ سے چھوٹے تانبہ کے سکہ کو چاندی کی دوآنی کے مساوی قیمت پر چلانا، کیا یہ سب باتیں بھی وطن اور اہل وطن سے ہمدردی و دلسوزی کا نتیجہ ہیں ؟

اس سے بھی بڑھیے اور رعایا کے تحفظ حقوق، اور اُسکے ساتھ عدل و انصاف کے دعاوی کو دیکھیے - بے شبہہ عدالتوں میں باقاعدہ مقدمات فیصل ہونا، چور کو قطع ید کی نہیں تو تازیانہ کی سزا، شہر میں اور جدہ اور مکہ کی درمیانی شاہراہ پر قیام امن اور عام ملکی نظم و نسق سے ایک حد تک رعایا کے حقوق کا تحفظ بھی ہوتا ہے اور اُنکے ساتھ عدل و انصاف بھی کیا جاتا ہے۔ پر کیا دوکانوں میں بے سبب قفل لگوا دینا، بغیر کسی عدالتی کارروائی کے محض شاہی ناخوشی کے باعث لوگوں کو گبوہ (قید خانہ) میں ڈال دینا، تاجروں اور دوکانداروں کا مال بغیر قیمت دیے اور معاملہ کیے اُٹھا لینا اور صرف کر ڈالنا، لوگوں سے اُنکی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ حسب تشخیص خود چندہ وصول کرنا (جیسا کہ مسجد الاقصیٰ کی مرمت کے لیے ہماری موجودگی میں واقع ہوا) چندہ دینے میں عذر کرنے والوں کو ملک سے اخراج کی دھمکی (یہ بھی ہماری موجودگی کا واقعہ ہے) سکہ کی تبدیلی کے احکام سے ناراضی کی پاداش میں معززین کو تازیانوں سے پٹوانا اور اُن سے سڑکوں پر ذلیل کام لینا وغیرہ بھی تحفظ حقوق اور عدل و انصاف میں داخل ہے ؟

یہ بھی نہ سہی زائرین و حجاج کی خدمت کی سعادت تو حاصل تھی - اس سے انکار کرنا انصاف اور صداقت کا خون کرنا ہے کہ زمانۂ سابق کے مقابلہ میں حاجیوں کے متعلق جو انتظامات شریف حسین نے کیے اُن میں بہت کچھ تنظیم و باقاعدگی تھی مگر کیا حجاج کی جیب پر سوا سو سے زائد ٹیکس بار ڈال دینا، محض قرنطینہ کی فیس کو مبنی بر حق قرار دینے کے لیے انھیں ایک شبانہ روز تک ایک ایسے جزیرہ میں مقید رکھنا جہاں نہ بارش اور دھوپ سے پناہ ملنے کے لیے کافی مکانات ہوں،

نہ کھانے کی ضروری اشیا ہوں، نہ بیماروں کی تیمارداری اور علاج کا کوئی سامان ہو، نہ ایک پیر فرتوت بھٹیارہ کے سوا کوئی سرکاری عہدہ دار اُن کا محافظ، نگراں یا پُرسانِ حال ہو۔ محصول خانہ کے عمال کے ہاتھوں اُنکو پریشان کرانا (جسکا تجربہ ہر حاجی کو ہو چکا ہے) بدوؤں کو جنگلے ہاتھوں میں حجاج کا جان و مال ہوتا ہے اپنی حرص و طمع کی بدولت اس درجہ تنگ کر دینا کہ وہ آدھے راستہ پر چھوڑ کر بھاگ جائیں (جیسا کہ ۱۳۲۴ھ میں عملاً پیش آیا) اور غریب زائرین مدینہ کو اپنی ہردلعزیزی قائم رکھنے کے لیے پیدل جانے کی اجازت دیکر اخبار القبلہ میں اسکا اعلان کرنا اور پھر اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر عین روانگی قافلہ کے وقت اُنھیں بجبر روکنا اور جاہل بدوؤں کے ہاتھوں زد و کوب کرانا اور مویشی خانہ میں بند رکھنا، فوت شدہ حجاج کے اموال کا غصب کرنا، کیا یہی وہ سب خدمتیں ہیں جنکی سعادت پر فخر کیا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ شریف حسین جفاکشی و چالاکی، خود غرضی و بے اصولی، ظلم و سفاکی، عیاری و مکاری، بیباکی و دلیری، بیدارمغزی و اُولوالعزمی اور قابلیت و ذہانت کا معجونِ مرکب ہونے کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہمارے ایک دوست جو تاریخ کے بڑے عالم اور ایک باکمال انشا پرداز ہیں ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی گذرے ہیں یا اب موجود ہیں اُن سب کے اعمال و کردار کی اگر صحیح جانچ کیجائے تو یہ سب باتیں کم و بیش اُن میں بھی ملینگی۔ ممکن ہے کہ اُنکی تشخیص درست ہو اور شریف حسین واقعی ایک بڑا آدمی ہو مگر ہمارے سامنے تو عظمت کا معیار وہی ہے جو قرآن شریف نے بتایا ہے اور جسکا نمونہ حضرت خیر البشر (روحی فداک)، انبیاے کرام علیہم السلام، خلفاے راشدین اور سلف صالحین کی زندگیوں نے پیش کیا ہے اس لیے ہم مجبور ہیں کہ شریف حسین کی بزرگی کو اگر تسلیم بھی کریں تو اُسی قدر جس قدر حضرت معلم الملکوت اور اُنکی ذریات کی بزرگی کو مانتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "طمع راسہ حرف ست وہرسہ تہی" شریف حسین کے تمام اعمال و کردار اور کل اقوال و افعال سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بدنصیب شخص صرف طمع کا بندہ تھا۔

عرب کی آزادی کا اُسکے نزدیک اگر کوئی مفہوم تھا تو یہ کہ اُسکے اور اُسکے بیٹوں کا نام خلفا و سلاطین عرب کی فہرست میں درج ہو جائے اور سارا عرب اُسکی اور اُسکے فرزندوں کی غلامی کا پٹہ لکھ دے۔ مذہبیت و اسلامیت کے جملہ دعاوی کا اگر کوئی مقصد تھا تو یہ کہ اہل مکہ کو حجاز کے باشندوں کو، کُل عربوں کو اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو مذہب و اسلام کا نام لے لے کر

دھوکا دیا جائے اور اُنکے روپیہ اور قوت کو اپنے حصول مدعا کے لیے کام میں لایا جائے۔

رعایا کے تحفظ حقوق اور اُنکے ساتھ عدل و انصاف کے زعم باطل کی اگر کوئی غرض تھی تو یہ کہ اُنکو اپنے قابو میں رکھنے، اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے اور اُن کے خون اور پسینہ کی کمائی کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کی یہی بہترین ترکیب تھی - اور حجاج و زائرین کی خدمت کا سارا اہتمام و انصرام اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا تھا کہ اپنی فریب کاریوں اور ستم آرائیوں کو دنیا میں مشتہر ہونے سے بچانے اور حجاج و زائرین کی جیبوں اور کیسوں کو انتہائی حد تک خالی کرانے کی اس سے بہتر تدبیر نہیں ممکن تھی۔

لیکن خداوند عالم و عالمیان جو چارہ ساز بیکساں ہے کب تک شریف حسین کی رسی دراز رہنے دیتا اور اُم القریٰ کے بسنے والے اور جوار رسول اللہ کے رہنے والے نیک بندوں کو اُسکی دراز دستیوں اور مکاریوں کا شکار بنائے رکھتا - شریف حسین کے کرتوتوں اور نالائقیوں کا نتیجہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے - ابن سعود کے ایک ہی حملہ نے جناب ملک الحجاز کو نہ صرف تخت و تاج اور ملوکیت و بادشاہی سے محروم کردیا، بلکہ حجاز کی مقدس سرزمین کو اُنکے وجود نامسعود سے ہمیشہ کے لیے پاک کردیا - اور آج وہ جزیرۂ قبرص میں اُسی طرح برطانی مہمان ہیں جس طرح خود اُنکے جور و ظلم کی بدولت اب سے چند سال قبل حضرت شیخ الہند جناب مولوی محمود الحسن مرحوم جزیرۂ مالٹا میں سرکاری مہمان بنائے گئے تھے - اور جو کچھ مال و متاع (اسی لاکھ اشرفیوں کی روانگی تو اخباروں میں چھپ چکی ہے) اہل حجاز اور زائرین و حجاج کو لوٹ کر جمع کیا گیا تھا اُسکا بڑا حصہ شرق اردن کے اجیر فوجیوں، ملک علی کے چالباز افسروں اور چالاک مشیروں، اور یورپ کے لٹیرے سامان حرب بیچنے والوں کے ہاتھوں غائب ہوا ہو چکا ہے اور جو باقی رہ گیا ہوگا وہ انشاء اللہ اپنے میزبان مہربان اور یار غار کی عنایت و توجہ پر نثار ہو جائے گا - فاعتبروا یا اولی الابصار

ہندوستان میں جو اصحاب حسین و علی کی امارت کے حامی ہیں اُن کے بھولے پن پر ہنسی آتی ہے - کاش وہ اُس انگریز اہل قلم ہی کی یہ بات یاد رکھیں جس کا راوی اخبار پاینیر ہے کہ "جب خود اُن کی قوم نے ساتھ نہیں دیا تو کوئی دوسرا اُنکی کیا مدد کرسکتا ہے"

ظفر الملک

ہکسلے کے حالات

جنوری نمبر میں "تصوفِ اسلام" کا دیباچہ شایع کیا گیا تھا اور اُسکے ضمن میں وعدہ
کیا گیا تھا کہ شفیقی عبدالماجد صاحب کا ایک نامکمل مضمون جو اُنکے دورِ فلسفیت کا تحریر
کیا ہوا شایع کیا جائے گا۔ وہ مضمون اب ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے۔ ہکسلے اور اُسکی عظمت
سے عزیز موصوف کی بےتعلقی و براءت کا اُس موقع پر اعلان کیا جا چکا ہے اس لیے
غالباً اب اُسکے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔
ایڈیٹر

(۱) واقعاتِ زندگی

اُنیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں، مضافاتِ لندن میں بمقام ایلنگ، جارج
ہکسلے، ایک اسکول ماسٹر سکونت گزیں تھا، جسکے گھر میں ۴- مئی ۱۸۲۵ء کو ایک لڑکا تولد ہوا
جسکا نام ٹامس ہنری ہکسلے رکھا گیا۔ جارج کو نقشہ کشی سے خاص دلچسپی تھی، اور یہ طبعی
ذوق، توارث کے ذریعہ سے ٹامس میں بھی منتقل ہوا۔ لیکن کچھ اتفاقات ایسے پیش آئے،
کہ ابھی اس تخم کو بارآوری کا موقع بھی نہ ملنے پایا تھا، کہ ٹامس ہکسلے مقامی مدرسہ میں داخل
کردیا گیا، اور تقریباً دو سال تک وہاں تعلیم پائی۔ لیکن اُس زمانہ کے انگریزی مدارس کی
عموماً وہی حالت تھی، جو ہمارے موجودہ دیسی مکاتب کی ہے۔ نہ اساتذہ میں ہمدردی تھی،
نہ کسی باقاعدہ اصول پر تعلیم ہوتی تھی، اور نہ طلبا میں علم کا حقیقی شوق پیدا کرنے کی کوشش کی
جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود ہکسلے اس مدت تعلیم کی حالت کو "خوش نصیبی" سے تعبیر کرتا ہے، اور
اپنی سوانحعمری میں لکھتا ہے، کہ "اگرچہ مجھ کو اپنی زندگی میں اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک ہر قسم و طبقہ
کے لوگوں سے واقفیت کا موقع حاصل ہوا ہے، لیکن میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کہ
جو سوسائٹی مجھکو اسکول میں ملی، وہ بدترین قسم کی تھی"۔ ہکسلے نے ابھی اپنی عمر کے دسویں سال
میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ اسکول، متواتر بدنظمیوں کے بعد شکست ہوگیا۔ اور اُس وقت
سے ہکسلے اسکول کی قید سے آزاد ہوگیا۔

اسکے بعد اُسنے بطور خود کتب بینی شروع کردی۔ اس کمسنی میں شوقِ مطالعہ کا یہ عالم

تھا، کہ بڑی سی بڑی ترغیبات بھی اسکی توجہ کو کتاب کی جانب سے ہٹانے میں ناکام رہتی تھیں، اور بارہ سال کی عمر میں تو یہ انہاک پیدا ہوگیا تھا، کہ باوجود دن کا اکثر حصہ نذر مطالعہ کردینے کے نصف شب تک طبقات الارض جیسے خالص علمی مضامین کی تصنیفات پیش نظر رہا کرتی تھیں۔ اسی زمانہ میں اُس نے مشہور انگریز فلاسفر، سر ولیم ہملٹن کی کتابیں منطق اور مابعد الطبیعیات پر مطالعہ کیں، اور اسی وقت سے اُسکا دماغ فلسفیانہ مسائل پر غور کرنے کا خوگر ہوگیا۔

یوں تو اُس نے اس سن میں بکثرت تصانیف کا مطالعہ کیا، لیکن جس مصنف کا اثر اُس پر سب سے زیادہ پڑا وہ کارلائل تھا۔ آگے چل کر وہ بار بار کارلائل کا ذکر ممنونیت کے ساتھ کرتا ہے، اور علانیہ اعتراف کرتا ہے، کہ ہر قسم کے تکلف و تصنع سے اُسے جو نفرت تھی، اس کی بنیاد کارلائل ہی کی تحریریں تھیں۔ اسی مصنف کی دیگر تصنیفات کے شوق مطالعہ میں اُس نے جرمن زبان سیکھنی شروع کی، جو آیندہ اُسکو سائنٹفک تحقیقات میں بہت مفید ثابت ہوئی۔

سنہ ۱۸۴۰ء میں ہکسلے نے ایک روزنامچہ لکھنا شروع کیا، جسکی خانہ پُری وہ پانچ سال تک کرتا رہا۔ اس روزنامچہ میں وہ وقتاً فوقتاً اُن خیالات، واقعات، واقتباسات کو درج کرتا تھا، جو علمی یا اخلاقی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت رکھتے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ روزنامچہ عرصہ تک محفوظ رہا، اور ہکسلے کی مفصل سوانح عمری میں اسکے لڑکے نے اُسکا کچھ حصہ نقل کردیا ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ طبیعیات و دیگر اصناف سائنس کے علاوہ فلسفہ کے دقیق مسائل پر بھی وہ اسی زمانہ سے غور کرنے کا، کافی طور سے، عادی ہوچکا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ، اُن اخلاقی مقولہ جات کا اندراج ہے، جن سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ اس کم عمری میں اُس نے اپنا اخلاقی معیار کتنا اعلیٰ قرار دے لیا تھا۔ اس قسم کے چند اقتباسات کا ترجمہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں[۱]:۔

"میں اُن تمام لوگوں سے نفرت کرتا ہوں، جو فرقہ بندی کیا کرتے ہیں، اسلیے کہ جس شے نے نوع انسان کو مبتلائے آزار بنا رکھا ہے، وہ غلط روی نہیں، بلکہ فرقیانہ غلط روی، یا شاید فرقیانہ صداقت پسندی ہے۔"

"انسان میں عمر کی زیادتی کے ساتھ، درگزر و عفو کا مادہ بھی بڑھتا جاتا ہے، اس لیے کہ سن رسیدہ ہوکر اُسکو کوئی جرم ایسا نہیں نظر آتا، جسکا مرتکب وہ خود نہ رہ چکا ہو۔"

[۱] لائف، جلد ۱ صفحہ ۱۸۔

"افلاس کی حالت میں ایک فلاسفر، اپنی عظمت، اپنا اخلاق، اور اپنی راحت قائم رکھ سکتا ہے، لیکن ساری قوم کے لیے یہ ممکن نہیں"

۱۸۳۹ء میں ہکسلے کی دو بہنوں کی شادی ہوئی، اور اتفاق سے دونوں کے شوہر ڈاکٹر تھے - ان میں سے ایک، یعنی ڈاکٹر کک نے ہکسلے کو کچھ طبی مسائل کی زبانی تعلیم دینی شروع کی۔ علم طب کی جانب ایک تو اُسکو طبعی رجحان تھا، اُس پر جو یہ صحبت ملی، تو اُس نے باضابطہ طور پر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا قصد مصمم کرلیا - چنانچہ جنوری ۱۸۴۱ء میں یہ ڈاکٹر چینڈلر کے پاس بمقام روورہاتھ گیا، اور وہاں کچھ عرصہ تک دواخانہ میں کام کرنے کے بعد اپنے دوسرے بہنوئی ڈاکٹر اسکاٹ کے پاس، جو خاص لنڈن میں طبابت کرتے تھے، چلا آیا - یہاں عملی تعلیم کے علاوہ، اُس نے سڈنہم کالج میں لکچروں کی شرکت بھی شروع کردی، اور متعدد اسناد کے علاوہ علم النباتات میں انعام حاصل کیا - اکتوبر ۱۸۴۲ء میں باضابطہ طبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہکسلے، چیرنگ کراس ہاسپٹل میں داخل ہوا - یہاں آکر، فزیالوجی کے قابل پروفیسر ڈاکٹر ہوارٹن جونس کے زیر نگرانی، جو ہکسلے پر خصوصیت کے ساتھ شفقت کرتے تھے، اس نے نہایت مستعدی و جفاکشی کے ساتھ اپنی توجہ علمی مشاغل کی جانب مبذول کردی، اور گو وہ خود اس زمانہ کی کم توجہی پر بعد کو افسوس کرتا تھا، لیکن اگر اسکے ہم جماعت طلبا کا بیان صحیح ہے، تو اس میں شبہہ نہیں رہتا، کہ وہ اس زمانہ میں ایک نہایت جفاکش و محنتی طالب علم خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ اُنکے بیان کے مطابق، جب اساتذہ کے درس کے بعد، دیگر طلبا، اسپتال کے صحن میں، تفریح کرتے ہوتے تھے، تو ہمیشہ وہ لوگ ہکسلے کو کمرہ کے اندر خردبین لیے ہوے معائنۂ اجسام میں مشغول پاتے - [۱]

یہ محنت و مشقت رائیگاں نہیں جا سکتا تھا - ابھی ہکسلے نے اپنی عمر کی اُنیس ہی بہاریں دیکھی تھیں، کہ اُسکی دقیقہ رس نگاہ نے جلدِ انسانی کی ایک باریک تہ کا انکشاف کیا، جو اُسوقت تک دُنیاے سائنس کی نظروں سے یکسر نہاں تھی - ۱۸۴۵ء میں اُس نے اس انکشاف کو لنڈن میڈیکل گزٹ کے ذریعہ سے پبلک کے روبرو پیش کیا، ماہرین فن نے سندِ قبول عطا کی، اور اس خاص (شے) کو ہکسلے ہی کے نام سے موسوم کردیا [۲] - نکتہ شناس اسی وقت سے تاڑ گئے

[۱] لائف، جلد ۱، صفحہ ۲۰

[۲] فزیالوجی کی اصلاح میں Huxley's layer کہتے ہیں۔

کہ جس تخم میں یہ استعداد موجود ہے، وہ معلوم نہیں، شجر بنکر، کیا برگ و بار پیدا کرے گا۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُسوقت ایک مستمر الحرکت مشین تیار کرنے کا سودا، اکثر سروں میں سمایا ہوا تھا۔ ہکسلے کو بھی اس جانب توجہ ہوئی، اُس نے ایک کاغذ پر پوری اسکیم مع نقشوں کے تیار کی، اور یہ غالباً ۱۸۴۳ء کا واقعہ ہے، کہ وہ اسکو ڈرتے ڈرتے، اُس زمانہ کے سب سے بڑے انگریز سائنس داں، فیرڈے کے پاس لے گیا۔ فیرڈے نے گو اس اسکیم میں علم الآلات والحیل اور جرثقیل کے اصول کی بنا پر متعدد نقائص نکال کر واپس کر دیا، تاہم اس واقعہ سے اس امر کا پتہ چلتا ہے، کہ اس کمسنی میں ہکسلے میں ایجاد و اختراع کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔

یہ عموماً دیکھا گیا ہے، کہ جو طلبا اپنا زیادہ وقت خارجی کتب کے مطالعہ اور معلومات عامہ کے حصول میں صرف کرتے ہیں اُنکی توجہ درس معینہ کی طرف سے کم ہو جاتی ہے، اور درجہ میں اُنکو کم نمبر ملتے ہیں، لیکن ہکسلے کی حالت اس قاعدہ کے ماتحت نہ تھی۔ وہ اپنی جماعت کے ممتاز ترین طلبہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں، اسکو علم تشریح اور افعال الاعضا میں اول انعامات ملے۔ اسی سال کیمسٹری میں بھی اُس نے اول انعام حاصل کیا، اور پروفیسر نے اسکی سند پر تحریر کیا، کہ "اسکی غیر معمولی محنت و کامیابی نے سائنس کی اس صنف میں اُسکو غیر محدود اعزاز کا مستحق بنا دیا ہے"۔ ۱۸۴۵ء میں اس نے لنڈن یونیورسٹی سے، علم تشریح و افعال الاعضا میں طلائی تمغہ حاصل کرنے کے ساتھ، ایم۔ بی کا امتحان، جو علم طب کا آخری امتحان تھا، پاس کیا۔

تکمیل تعلیم کے بعد فکر معاش کا دامنگیر ہونا لازمی تھا۔ اور گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ایک طبیب کو کسی دوسرے پیشہ کی کیا حاجت ہے؟ لیکن ہکسلے طب پڑھکر طبابت پیشہ ہونا نہیں چاہتا تھا، اسکی دلچسپی ابتدا ہی سے تشریح و افعال الاعضا کی جانب تھی، وہ بجائے علاج و معالجہ کے، ایسی ملازمت کا خواہشمند تھا، جس میں اُسکو اپنی تعلیم کے خالص سائنٹفک اجزا کے نشو و نما کا موقع ملے۔ چنانچہ ایک دوست کی تحریک پر، اُس نے امیر البحر کی خدمت میں ایک درخواست اس مضمون کی روانہ کی، کہ بحری ملازمت کے طبی صیغہ میں اُسکو ایسی جگہ دی جائے، جس میں اُس سے سائنٹفک خدمات لیے جائیں۔ یہ درخواست منظور ہوئی، اور کچھ روز ایک اسپتال میں ملازمت کے بعد، اُسکو بالآخر، اسکے حسب مذاق، ایک جہاز پر جگہ مل گئی۔ اس جہاز کا نام رٹیل اسنیک تھا، اسکی منزل مقصود آسٹریلیا تھی، اور اسکے سفر کی علت غائی،

آسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان، بجائے عام، طویل پیچیدہ راستہ کے، ایک مختصر اور سیدھا
راستہ دریافت کرنا تھا۔ ہکسلے اس پر اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوا۔ دسمبر ۴۶ء میں جہاز روانہ ہوا، اور
چار سال تک عالم آب پر رواں رہا۔ ہکسلے کا مشغلہ، اس مدت میں حیوانات آبی کا مطالعہ،
اُن پر اعمال جراحی کرنا، وغیرہ نہایت دلچسپی و محنت کے ساتھ جاری رہا۔ اس سفر میں علم الحیوانات
کے متعلق اُسے جو بصیرت حاصل ہوئی، اور جس سے اُس نے سائنٹفک پبلک کو مستفید کیا، اُسکی
تفصیل کسی دوسرے عنوان کے تحت میں ملے گی۔ یہاں مختصراً اتنا بتا دینا کافی ہے، کہ ہکسلے
نے آیندہ زندگی میں جو سائنٹفک تحقیقات و انکشافات کیے، اُنکی بنیاد ایک بہت بڑی
حد تک، اسی سفر کے اثرات پر تھی۔ دوران سفر میں حیوانات آبی پر اُس نے متعدد مضامین لکھے،
جو اُسی زمانہ میں مختلف سائنٹفک سوسائٹیوں میں پیش ہوے، اور آخری مضمون تو، جو اُس نے
قریص البحر پر لکھا تھا، دنیاے سائنس میں اس قدر عزت و پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا، کہ
اسکے صلہ میں وہ، جبکہ اسکی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی، رائل سوسائٹی کا ممبر منتخب ہو گیا، اور
خیال رکھو، کہ اس سے ممتاز تر کوئی سائنٹفک سوسائٹی تمام انگلستان میں نہیں۔

۵۰ء میں ہکسلے نے سرزمین انگلستان پر پھر قدم رکھا، لیکن اب وہ معمولی اسسٹنٹ سرجن
نہ تھا، بلکہ بقول جرمنی کے مشہور سائنس داں ورشو کے، وہ "علم الحیوانات کا ماہر اور علم الانسان
کا دقیقہ رس عالم ہو کر واپس آیا"۔ آوین، فالبس، ٹنڈل، ہوکر، وغیرہ سے، جو اُس وقت علی الترتیب
تشریح، طبقات الارض، طبعیات، اور علم النباتات کے جلیل القدر علما تھے، اُس سے خصوصیت
کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اور سائنس داں طبقہ میں علی العموم اُسکا فضل و کمال
مسلّم ہو چکا تھا۔ لیکن یہ چیزیں، خواہ بجاے خود کتنی ہی وقیع ہوں، در رزق کی کلید نہیں ہو سکتی
تھیں، اور شہرت و اعزاز، جسمانی بدل ما یتحلل کا کام نہ دے سکتے تھے۔ بعض مرتبہ تو یہ نوبت
ہوتی، کہ جن کثیر التعداد ضیافتوں اور جلسوں میں ہکسلے مدعو کیا جاتا، اُن میں پہونچنے کے لیے
گاڑی کا کرایہ تک اُسکے پاس نہ نکلتا۔ بہرحال ذریعۂ معاش کی تلاش ناگزیر تھی۔ ستم بالاے ستم
یہ کہ اسی اثنا میں والدہ نے انتقال کیا، والد، بستر مرض پر لیٹے، اور متواتر خانگی مصائب پیش
آتے گئے۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر ہکسلے کی جبین استقلال پر شکن تک نہ آئی۔ بعض ہوا خواہوں نے
طبابت وغیرہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی صلاح دی، لیکن ہکسلے تو دلربائے سائنس کا
مفتون تھا، اُس نے دوسری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

آخر کار، چار سال کی صبر آزما مدت کے بعد، جسکو اُس نے اپنے بحری سفر کے تجربات و معلومات کے مرتب کرنے اور دیگر علمی مشاغل میں صرف کیا، جولائی ۱۸۵۴ء میں اُسکو معدنیات کے اسکول میں علم الموجودات کی پروفیسری، ڈھائی سو روپیہ ماہوار کے مشاہرہ پر ملی۔ یہ مشاہرہ ہندوستان کے لحاظ سے معقول معلوم ہوتا ہے، لیکن ہکسلے کی اعلیٰ قابلیت، اور انگلستان کی زندگی کے عام اخراجات کی مناسبت سے، یہ تعداد نہایت قلیل تھی۔ مگر یہ حالت عرصہ تک نہ رہی، چند روز میں ساوی تعداد کے اضافہ سے ہکسلے کا مشاہرہ دوگنا ہوگیا۔ اسی زمانہ میں رائل سوسائٹی نے بھی اُسکو ساڑھے چار ہزار روپیہ کی مالی امداد دے کر اپنے اُس وعدہ کو پورا کیا، جو اُس نے ہکسلے کے ساتھ اسکے بحری تجربات کی اشاعت میں مدد کرنے کی غرض سے، ایک عرصہ ہوا، کیا تھا۔

جولائی ۱۸۵۵ء میں ہکسلے نے مس ہیتھارن، ایک آسٹریلین لیڈی سے شادی کی جس سے اسکو، چند سال قبل، آسٹریلیا کے دوران قیام میں محبت ہوگئی تھی۔ ہکسلے کو تشریح و افعال الاعضا سے خاص مناسبت تھی، علم الموجودات و طبقات الارض سے چنداں دلچسپی نہ تھی، لیکن اتفاق سے کام انھیں چیزوں سے پڑا، اس بنا پر یہ خیال ہوتا تھا، کہ شاید ان فرائض کو وہ زیادہ خوبی سے انجام نہ دے سکے، مگر اُسکی مستعدی و ہمت مردانہ نے ان خطرات کو باطل کردیا۔ اکتیس سال تک اُس نے، جس دیانتداری، جس خوش اسلوبی، اور جس جفاکشی سے پروفیسری کی خدمات کو انجام دیا، وہ علمی تاریخ میں فرض شناسی کی ایک اعلیٰ اور قابل تقلید مثال ہے۔ پروفیسری کی ذمہ داریوں کے علاوہ، اُسکو نہایت کثرت سے مضامین لکھنے ہوتے، تقریریں کرنا ہوتیں، لکچر دینے پڑتے، اور کتابیں شایع کرنا ہوتیں۔ یہ محنت ہر شخص، اور خصوصاً اُس شخص کی، جو خلقتاً ضعیف القویٰ ہو صحت برباد کردینے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ہکسلے بھی متعدد بار بیمار پڑا، اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے وقتاً فوقتاً باہر جانا پڑا۔

نومبر ۱۸۵۹ء میں ڈارون کی شہرۂ آفاق کتاب "اصل الانواع" جو شریعت ارتقاء کا صحیفہ ہے، شایع ہوئی۔ ہکسلے کی زندگی میں اسوقت سے ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۹ء تک اُس نے اس مسئلہ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، نہ اسکے اثبات کا قائل تھا اور نہ نفی کا مدعی، لیکن اس سال سے اسکے خیالات اس مسئلہ کے بارے میں ایک خاص نہج پر متعین ہوگئے۔ ارتقاء کی تائید میں اُسکے جو خاص کارنامے ہیں، انکی تفصیل مسئلہ ارتقاء کے زیر عنوان ملیگی۔ مختصر یہ کہ وہ تا زیست عسکر ارتقاء کا ایک پرجوش علمبردار رہا۔

اسی ضمن میں ہم ایک واقعہ ذیل میں نقل کرتے ہیں، جو غالباً دلچسپی سے پڑھا جائے :-

۱۸۶۰ء میں انگلستان کی سالانہ سائنٹفک انجمن "برٹش ایسوسی ایشن" کا جلسہ بمقام آکسفورڈ منعقد ہوا۔ اُس زمانہ میں ڈارون اور ارتقاء کی مخالفت کا عالمِ شباب تھا۔ علماے مسیحیت، اور قدیم طرز کے سائنس داں دونوں تُلے ہوے تھے، کہ کسی پبلک جلسہ میں اس مسئلہ کی تردید نہیں، بلکہ خوب تضحیک کی جائے۔ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے برٹش ایسوسی ایشن سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا؟ ہکسلے کو جب اس سازش کی خبر پہونچی، تو اُس نے چاہا، کہ ایسے جلسہ کی شرکت، جس میں بجاے دلائل وبراہین کے جذبات کو مخاطب کیا جائیگا، ٹال دے، لیکن بعض احباب کے اصرار سے، کہ ایسے نازک موقع پر، جبکہ حامیان ارتقاء کا کوئی سربرآوردہ فرد نہ موجود ہو، اُسکا موجود ہونا ضروری ہے، شرکت پر راضی ہوگیا۔ ۲۸- جون کے اجلاس میں، آوین نے، جو اُسوقت انگلستان میں تشریح کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا، اور جو ارتقاء کا سخت مخالف تھا، نہایت بلند آہنگی سے یہ جھوٹا دعویٰ کیا، کہ "انسان اور بوزنہ کے دماغوں میں اُس سے کہیں زیادہ وسیع فرق موجود ہے، جتنا کہ بوزنہ اور رباعیۃ الایدی کے ادنیٰ ترین فرد کے دماغوں میں ہے"۔ اتنے بڑے شخص کی زبان سے یہ سنکر، عوام پر جو اثر پڑا ہوگا، وہ محتاجِ بیان نہیں، لیکن ہکسلے اُٹھ کھڑا ہوا، اور اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر کہا، کہ "میں اس غلط دعوے کی صریح اور کُلّی تکذیب کرتا ہوں"۔ اسکے بعد مباحثہ ملتوی ہوگیا اور ۳۰ جون کو پھر معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ڈریپر، مصنف "معرکۂ مذہب وسائنس" نے ایک مضمون پڑھا، جس میں درپردہ ڈارون کے خیالات پر چوٹیں تھیں۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے، متعدد اربابِ کلیسا، پلیٹ فارم پر آئے، اور اصل مسئلہ کو سائنٹفک نقطۂ خیال سے ہاتھ لگائے بغیر، ڈارون اور اُسکے نظریہ کو سخت سست کہکر چلے گئے۔ سب سے آخر میں آکسفورڈ کا مشہور پادری، ولبرفورس، جو زباں آوری وطلاقتِ لسانی میں خاص شہرت رکھتا تھا، اور عوام الناس کے خیال میں سائنس بھی جانتا تھا، تقریر کے لیے اُٹھا، اور اُسکے اُٹھنے کے ساتھ ہی تمام ہال خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ بشپ موصوف نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ کامل نصف گھنٹہ تک تقریر کی، جس میں ڈارون پر متعدد ذاتی حملوں کے علاوہ، اُس نے ایک مدعیانہ لہجہ میں کہا، کہ ارتقاء کا خیال بے بنیاد، مہمل، وبیمعنی ہے، اور خاتمہ پر ہکسلے کی جانب مخاطب ہوکر ایک استہزاآمیز پیرایہ میں سوال کیا، کہ "حضرت، میں آپکے شجرۂ نسب کے متعلق اتنا دریافت کرنا چاہتا ہوں، کہ بندر تک

آپ کا جدی سلسلہ پہونچتا ہے یا مادری؟" اسکے جواب میں ہکسلے اُٹھا، اور بشپ موصوف کے خلاف ایک متین تقریر کے بعد، جس میں سائنٹفک حیثیت سے بشپ کی تقریر کے نقائص بتائے گئے تھے، اُس نے کہا کہ "ہاں! میں اُس غریب جانور، بندر کی نسل سے ہونا، بہ نسبت اسکے ہزار درجہ زیادہ پسند کرتا ہوں، کہ اس قسم کے لوگوں کا شمار اپنے اسلاف میں کروں، جنھوں نے اپنی فصاحت، اپنی قابلیت، اور اپنے اثر کو عامیانہ تعصبات کی پاسداری پر نثار کردیا ہے، اور جو سائنس کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے، خطابیات سے کام لیکر، اور مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرکے، پبلک کو اُنکی جانب سے بدگمان بناتے ہیں۔" اسپر نعرۂ تحسین بلند ہوا، اور پادری صاحب خفیف ہوے۔ چند اور تقریروں کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اس قسم کے اور بہت سے دلچسپ واقعات موجود ہیں، لیکن یہاں اُنکی گنجایش نہیں۔

سنہ ۶۱ء میں اُس نے لنڈن، اور اڈنبرا فلاسفکل انسٹیٹوشن میں انسان اور حیوانات کے تعلقات باہمی پر متعدد لکچر دیے، جو عموماً مسئلۂ ارتقاء کی تائید و توضیح میں تھے، یہی لکچر، دو سال بعد "فطرت میں انسان کی جگہ" کے عنوان سے شایع ہوکر، نہایت مقبول ہوے۔ سنہ ۶۲ء میں رائل کالج آف سرجنز نے اسکو اعزازی پروفیسر منتخب کیا، اس سے پانچ سال پیشتر، وہ رائل انسٹیٹیوشن میں تشریح کا پروفیسر، اور لنڈن یونیورسٹی میں افعال الاعضا اور تشریح کا ممتحن مقرر ہوچکا تھا۔ سنہ ۶۶ء میں افعال الاعضا پر اسکی کتاب کا پہلا اڈیشن شایع ہوا۔ اسی سنہ میں، ایشیاٹک سوسائٹی کے ذریعہ سے ڈاکٹر فیرر نے ہندوستان میں ایک انتھراپالوجیکل سوسائٹی (علم الانسان کی انجمن) قائم کرنے کی تجویز کی، جسکو گورنمنٹ بنگال نے بھی پسند کیا۔ اس سوسائٹی کے متعلق اعلیٰ مشورہ حاصل کرنے کی غرض سے ہکسلے، کلکتہ میں مدعو کیا گیا، لیکن کثرت کار کی وجہ سے اُس نے افسوس کے ساتھ معذرت لکھ بھیجی۔ اسکے دوسرے سال، اُس نے رائل انسٹی ٹیوشن کی پروفیسری سے، ڈاکٹر فاسٹر کو اپنا قائم مقام بناکر، استعفا دیدیا۔ اس علٰحدگی کی وجہ کچھ تو کثرت کار، کچھ خرابی صحت، اور کچھ اس عہدہ سے بددلی تھی۔ اس بددلی کا بڑا باعث سامعین کی اُسکے لکچروں کی جانب سے بے توجہی تھی، اور ہکسلے کے لیے کوئی شے اس سے زیادہ حوصلہ شکن اور رنجدہ نہ تھی۔ سامعین کی بے توجہی کا ایک نمونہ سننے کے قابل ہے، جسکو ہم خود ہکسلے کی زبان سے نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، کہ "اپنے لکچروں کے ابتدائی زمانہ میں گو مجھے

اپنے عام قوٰے پر اعتماد نہ تھا، لیکن ایک شے میں مَیں اپنے تئیں خصوصیت کے ساتھ ممتاز سمجھتا تھا، اور وہ بیان کا صاف و قریب الفہم ہونا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے، کہ ایک کثیر مجمع کے سامنے لکچر دیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ سامعین میرے بیان کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔ لیکن تھوڑے غور کے بعد، مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا، کہ سارے مجمع میں کم از کم ایک عورت ایسی ہے، جو میرے لکچر کو بہ غایت دلچسپی سُن رہی ہے۔ میں نے بھی دیگر حاضرین سے قطع نظر کرکے، براہ راست اُسی کی جانب مخاطب ہو کر تقریر شروع کر دی۔ خاتمہ پر مجھے اُسکی توجہ و دلچسپی کا مزید ثبوت یہ ملا، کہ وہ میرے قریب آ کر کہنے لگی، کہ مجھے آپ کی تقریر میں صرف ایک مسئلہ کی بابت شبہہ رہ گیا ہے، اور اُسکو میں صاف کر لینا چاہتی ہوں" میں شوق سے اُسکی طرف متوجہ ہوا، اور اُس نے پوچھا کہ "جناب، میں صرف اتنا نہیں سمجھی، کہ دماغ کھوپڑی کے اندر ہوتا ہے یا باہر؟"[۵]

۱۸۶۹ء میں رسالہ نائن ٹینتھ سنچری کے عالم ایڈیٹر مسٹر جیمس نولز نے ایک "میٹافزیکل سوسائٹی" (فلسفیانہ انجمن) کی بنیاد ڈالی، جسکے ممبر نہایت مختلف خیالات و عقائد کے لوگ تھے، اور جسکا مقصد یہ تھا، کہ ہر نوعیت کے فلسفیانہ مسائل پر اُس میں نہایت بے تعصبی و خلوص کے ساتھ غور کیا جائے، اور ہر طبقہ و فرقہ کے افراد کو آزادی کے ساتھ اظہار خیال کا موقع حاصل ہو۔ ہکسلے بھی اس میں شریک ہوا، اور جب تک سوسائٹی قائم رہی، اُسکا سرگرم ممبر رہا۔ اسی سال وہ انگلستان کی جیولاجیکل سوسائٹی کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔

۱۸۷۰ء سے ہکسلے کی زندگی میں کسی قدر تغیر ہوتا ہے۔ اسوقت تک اُسکی زندگی تقریباً خالص علمی تھی، بجز سائنٹیفک مشاغل کے، اُسکو اور کسی چیز سے خاص تعلق نہ تھا۔ لیکن اب جبکہ خیالات پختگی کو پہونچ چکے تھے، اور جوانی کی اُمنگ سرد ہو چلی تھی، اُس نے میدان عمل میں قدم رکھا، اور کثرت کے ساتھ مختلف تعلیمی، سیاسی، اخلاقی، اور رفاہ عام کی مجلسوں میں حصہ لینے لگا۔ چنانچہ اسوقت سے ۱۸۸۴ء تک نصف درجن رائل کمیشنوں میں شریک ہوا۔[۶] ۱۸۷۱ء میں رائل سوسائٹی کا سکرٹری، اور ۱۸۸۳ء میں پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ انکے علاوہ، اور بیسیوں مختلف النوع انجمنیں تھیں، جو اسکی شرکت سے مشرف اندوز ہوئیں۔ ہکسلے کے اس طرز عمل سے جہاں ایک طرف یہ فائدہ ہوا، کہ بہت سی علمی اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں، وہاں دوسری جانب یہ نقصان بھی ہوا، کہ اب اسکو خاص فنی مشاغل کے لیے بہت کم وقت ملتا، چنانچہ اُس وقت

[۵] لائف، جلد ۱، صفحہ ۴۲۳

تک اُس نے جس قدر خالص سائنٹفک مضامین لکھے تھے، اُنکے مقابلہ میں آئندہ مضامین نہایت قلیل التعداد ہیں۔

اس زمانہ میں کثرتِ کار کی وجہ سے اُسکی صحت اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ تبدیلِ آب و ہوا کے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن اُسکی مالی حالت ایسی نہ تھی، جو سفر و سیاحت کے مصارف کے بارگراں کی متحمل ہوسکتی۔ یہ دیکھ کر چند ہمدرد احباب نے دستِ اعانت بڑھایا، اور اس باموقع امداد کو شکریہ کے ساتھ قبول کرکے، اسکے سہارے سے ہکسلے اس قابل ہوا، کہ منازلِ سفر طے کرسکے۔ سنہ میں جبرالٹر ہوتا ہوا مصر گیا، اور ایک مختصر قیام کے بعد اٹلی کے راستہ سے واپس آیا۔ چار سال کے بعد ایک تعلیمی ضرورت سے امریکہ مدعو کیا گیا، وہاں اُس نے متعدد لکچر دیے، جو بعد میں ایک کتاب کی صورت میں شایع ہوے۔ سنہ، سنہ تک وہ اپنے تمام اشغال میں نہایت جفاکشی کے ساتھ مصروف رہا، یہاں تک کہ صرف چھ سال کے عرصہ میں نصف درجن کتابیں شایع کیں، اور اسی کے ساتھ دوسرے مشاغل کو بھی پوری مستعدی سے جاری رکھا۔ سنہ میں صحت زیادہ خراب رہنے لگی، اور ثقلِ سماعت کا قدیم مرض ترقی کرگیا۔

جوانی کے زمانہ میں وہ کہا کرتا تھا، کہ علماے سائنس کو ساٹھ سال کی عمر میں دُنیا سے علٰحدہ ہو جانا چاہیے، تاکہ وہ اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے رفتار ترقی میں حائل نہ ہوں، لوگ اس قول کو مذاق سمجھا کرتے تھے۔ اب خود ہکسلے کا سن ساٹھ سال کا ہو چکا تھا، اور اس مقولہ کی ظرافت وسنجیدگی کی جانچ کا موقع آگیا تھا۔ مگر اسکے طرزِ عمل نے ثابت کردیا، کہ یہ کوئی ظریفانہ خیال نہیں، بلکہ اُسکا سچا عقیدہ تھا۔ اس سال، اُس نے مختلف سائنٹفک انجمنوں سے اپنے تعلقات قطع کرلیے، اور فیوڈِ ملازمت سے آزاد ہوکر ایک معقول پنشن پر کنارہ کشی اختیار کی۔ لیکن یہ کنارہ کشی محض ملازمت وغیرہ کی ذمہ داریوں سے تھی، ورنہ جس شخص کی ساری عمر معرکہ آرا علم کے سر کرنے میں صرف ہوئی ہو، وہ جب تک کہ اُسکی دماغی زندگی کچھ بھی قائم ہے، کیونکر علمی خدمات سے دستبردار ہو سکتا ہے؟ چنانچہ مضامین وتقریروں کا سلسلہ، گو نسبتاً ادنٰی پیمانہ پر، برابر جاری رہا۔ اس سلسلۂ مضامین میں سب سے زیادہ قابل الذکر وہ بحث ہے، جو گلیڈاسٹون کے مقابلہ پر، رسالہ نائن ٹینتھ سنچری میں مذہب و سائنس کے تعلقات پر عرصہ تک قائم رہی۔ اسوقت تک اگرچہ ایک علمی شخص کو اُسکے ہمچشم جتنے خطابات واعزاز دے سکتے ہیں،

وہ تقریباً کُل، ہکسلے کی ذات میں جمع تھے، لیکن اُنکی دستارِ علم پر دنیاوی وجاہت کی کلغی اب تک نہ تھی، مگر ۱۸۹۲ء میں یہ کمی بھی پوری ہو گئی، یعنی اسکو پریوی کونسلر کا عہدہ مل گیا، اور وہ پروفیسر ہکسلے سے، رائٹ آنریبل ہکسلے ہو گیا۔

۱۸۹۳ء میں ہکسلے کے مخلص دیرینہ پروفیسر ٹنڈل نے وفات پائی، اس حادثہ نے اُسکے جھلملاتے ہوے چراغ زندگی کے حق میں بادِ صرصر کے ایک جھونکے کا کام دیا۔ ایسے خالص دوست کی موت نے دنیا کی بے ثباتی کا مرقع آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا، اور زیست کی طرف سے طبیعت پھیکی کر دی۔ لیکن دماغی کام، بقدر امکان جاری رہا۔ ۱۸۹۵ء کی ابتدا میں مسٹر بالفور کی کتاب "اصول اعتقاد" پر شایع ہوئی۔ ہکسلے نے اسپر ایک مفصل تنقید لکھنے کا قصد کیا، اور اسکا پہلا حصہ نائن ٹینتھ سنچری کے مارچ نمبر میں نکل چکنے کے بعد، ابھی باقی حصہ زیر تحریر تھا، کہ دفعتاً موت کے زبردست ہاتھ نے قلم کو روک دیا۔ انفلوانزا کا شدید حملہ ہوا، اور اُس نے پھیپھڑہ، جگر، اور قلب کو متاثر کر دیا۔ ہکسلے نہایت استقلال و پامردی کے ساتھ کئی ماہ تک مقاومتِ مرض کیا کیا، لیکن ضعیف قوے زیادہ ساتھ نہ دے سکے۔ لشکر امراض نے بالآخر سلطنتِ جسم پر کامل تسلط حاصل کر لیا، اور حرارت غریزی کو اُسکے مستقر سے خارج البلد کر دیا۔ ۲۹ - جون ۱۸۹۵ء کو ساڑھے تین بجے دن کے وقت، یہ آفتاب کمال، افق ہستی سے ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، اور ۴۔ جولائی کو بمقام فنچلے پیوند خاک کیا گیا۔

دفن کے وقت انگلستان کے تمام مشاہیر علماے سائینس اور مختلف سائنٹفک انجمنوں کے وکلا، موجود تھے، بعض افراد، جو کسی مجبوری سے خود نہ آسکے، اُنھوں نے اپنی جانب سے کسی دوسرے کو نیابتہً بھیجکر شرکت کی۔

ہکسلے نے اپنی وفات کے وقت سات اولادیں چھوڑیں، جن میں سے تین لڑکے، اور چار لڑکیاں تھیں۔ لیکن درحقیقت وہ جن لوگوں کو داغِ یتیمی دے گیا، اُنکی تعداد غیر محدود ہے، اس لیے کہ اُسکی معنوی اولاد، علمی فرزندوں کا شمار کرنا، کسی فرد بشر کے علمی امکان میں نہیں۔

(۲) اخلاق و عادات، معاصرین پر اثر، وغیرہ

موجوداتِ عالم کے کسی خاص جزو کے باہمی تعلقات منضبط کرنا، اور واقعاتِ فطرت کے

کسی صنف پر علت و معلول کے رشتہ کو قائم کرنا، اسی کا نام سائنس ہے۔ اور اس فرض کے انجام دینے کی جس قدر قابلیت کسی شخص میں موجود ہوگی، اسی نسبت سے وہ سائنس میں کمال حاصل کرسکیگا۔ لیکن اس فرض کی انجام دہی کے لیے، انسان کو جن خصوصیات کا جامع ہونا چاہیے، اُنکی بڑی تعداد ایسی ہے، جسکو عرف عام میں محاسن اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ راستبازی، دیانتداری، انہماکِ علمی، تحقیق پسندی، اِن چیزوں سے بڑھکر، اور کون شے ایک متلاشی حقائق کے لیے طغرائے امتیاز ہوسکتی ہے؟ مگر یہی وہ اوصاف ہیں، جنکا وجود، کسی فرد کو اخلاقی حیثیت سے، انسان کامل کے لقب کا مستحق بنادیتا ہے۔ اسی لیے ایک ماہر سائنس کو بدرجۂ اولیٰ لباس اخلاق سے آراستہ ہونا چاہیے۔ ہکسلے کی سوانحعمری میں بھی ہم ان خصوصیات کی تلاش کرتے ہیں، جس سے اُسکی زندگی پر، خواہ بحیثیت انسان کے یا بحیثیت سائنس داں کے، کافی روشنی پڑیگی۔

حق گوئی

حقیقت شناسی کے میدان میں قدم رکھنے والوں کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے، کہ اظہار حق و استقلال کو تمام چیزوں پر مقدم رکھیں، اور ہم دیکھتے ہیں، کہ ہکسلے میں یہ اوصاف بدرجۂ غایت موجود تھے۔ وہ اگرچہ عموماً نہایت ذی مروت تھا، لیکن حق کے مقابلہ میں وہ کسی دوستی، کسی طمع، اور کسی خوف کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ڈارون کی کتاب کے شایع ہونے پر وہ جس آزادی و دلیری کے ساتھ اُسکی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا، اُس نے بعض طبقات کو عرصۂ دراز تک اسکا مخالف بنائے رکھا، اُسکی شہرت و ناموری کو سخت صدمہ پہونچایا، لیکن وہ اعلان حق میں بلا خوف و خطر مشغول رہا۔ ۱۸۶۳ء میں جب اُس نے مسئلۂ ارتقا کی تائید و توضیح میں اپنا رسالہ "انسان کا درجہ، فطرت میں" شایع کرنا چاہا، تو بعض نیک نیت احباب نے اُسکو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، اسلیے کہ یہ رسالہ اُسوقت کے عام معتقدات و خیالات سے اس قدر مخالف تھا، کہ اُسکی ناکامی یقینی تھی، لیکن ہکسلے نے نہ مانا، اور اپنے احباب کے علی الرغم اُسکو شایع کردیا۔ اس پر، جس مخالفت کا اندیشہ تھا، اُسکا ظہور شدت کے ساتھ ہوا۔ اُسکی تردید متعدد رسالوں میں شایع ہوئی، پنچ اخبارات میں خوب مضحکہ اُڑایا گیا، سخت کلامی کا دروازہ اُسکے اوپر کھول دیا گیا، غرضکہ حوصلہ فرسائی کے جتنے طریقے ہوسکتے ہیں، وہ سب اُسکے ساتھ برتے گئے، لیکن استقلال کا دامن اُسکے ہاتھ سے نہ چھوٹا، یہاں تک کہ مخالفین کے سلح خانہ میں کوئی حربہ باقی نہ رہا، اور اُنکو تھککر خود ہی سکوت اختیار کرنا پڑا۔

ڈارون کے ساتھ ہکسلے کو جو محبت و عقیدت تھی اُس سے زیادہ نوع انسان کے دو

افراد میں ہونا مشکل ہے ۔ باایں ہمہ ہکسلے، علمی مسائل میں ہمیشہ یہ نکتہ ملحوظ رکھتا تھا، کہ یہ محبت اُنکی حقیقت شناسی کی آنکھ پر پردہ نہ ڈال دے، چنانچہ، گو وہ بحیثیت مجموعی ارتقاء کا نہایت زبردست وکیل و حامی تھا، مگر اس مسئلہ میں اُسکو جابجا جو خامیاں نظر آتی تھیں، اُسکا اعلان بھی وہ ڈارون کے مقابلہ میں اُسی وضاحت و بلند آہنگی کے ساتھ کردیتا تھا، جس طرح اُسکے تائیدی دلائل و واقعات کا ۔ ہربرٹ اسپنسر سے بھی ہکسلے کے مراسم اتحاد نہایت خالص و عمیق تھے، لیکن ۱۸۸۹ء کے آخری حصہ میں جب ہکسلے نے دیکھا، کہ اسپنسر ایک ایسے پولیٹکل مسئلہ کی تعلیم دے رہا ہے، جو اُسکے نزدیک اصولاً غلطی پر مبنی تھا۔ تو اُس نے اُسکی بیباک تردید میں مطلق تامل نہ کیا۔ اسپنسر کو یہ فعل ناگوار گذرا، اور تقریباً چالیس سال کی محبت و دوستی منقطع ہوگئی، لیکن ہکسلے نے اظہار حق کے سامنے اسکی کچھ پروا[1] نہ کی ۔

بے تعصبی، انصاف پسندی، رواداری

اخلاق حسنہ کا سب سے زریں اصول یہ ہے، کہ انسان تمام تعصبات سے پاک ہو، کسی گروہ سے اُسکو بغض و نفرت نہ ہو، اور سچ جہاں نظر آئے، اُسے قبول کرے ۔ اس وصف کا، کلی طور سے حاصل کرنا، نہایت دشوار، بلکہ بظاہر تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے ۔ درحقیقت، انسان، کچھ تو توارث کے اثر سے، اور کچھ ابتدائی تربیت کے باعث، مُلکی یا قومی تعصبات میں ایسا جکڑ جاتا ہے، کہ بعد کو لاکھ ہاتھ پیر مارے، اس بندش سے کامل خلاصی نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے تئیں قید تقلید سے بالکل آزاد سمجھتے ہیں، اور اپنے نزدیک کسی طبقہ و فرقہ سے تعصب نہیں رکھتے، اکثر ایک غیر محسوس طریقے سے ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں، جو دوسرے گروہ کی دلآزاری کا باعث ہوتے ہیں، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ انسان، ایک خاص حد تک مذہب و ملت، ملک و قوم، نسل و رنگ کے امتیازات کو مٹا سکتا ہے، اور اپنے علم و یقین کے مطابق، ایسا موقع کبھی نہیں آنے دیتا ہے، کہ مختلف افراد یا گروہوں کے درمیان عدم مساوات کا طریقہ برتے ۔

پس جہاں تک طاقت بشری میں ہے، ہم دیکھتے ہیں، کہ ہکسلے نے اپنے جامۂ عمل کو پاسداری و تعصب کی آلودگی سے تمام عمر پاک رکھا ۔ وہ اگر ایک جانب اپنے وطن انگلستان کو اپنی اعلیٰ تجاویز سے ترقی دیتا ہے، تو دوسری طرف، دیگر ممالک یورپ، بلکہ مصر و ہندوستان تک کو اپنے مفید سائنٹفک مشوروں سے محروم نہیں کرتا ۔ وہ جس طرح اپنے عقاید و خیالات

[1] یہ واقعہ "لائف اینڈ لٹرز آف اسپنسر" مرتبہ ڈاکٹر ڈنکن میں بہت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

کی اشاعت فرض جانتا ہے، اُسی طرح اپنے مخالفین کو بھی جائز ذرایع سے منتقید ہونے کا پورا موقع دیتا ہے، اور اُنکے خیالات کو کامل رواداری، بلکہ خندہ جبینی کے ساتھ سنتا ہے۔ وہ اگر اپنے مخالفین کی بدزبانی پر کسی وقت جھنجلا اُٹھتا ہے، تو خود اپنے موافقین کی سخت کلامی پر بھی اظہار نفرت کرتا ہے، چنانچہ جب مسٹر فوٹ پر، جو اسکا ہمنواں تھا، بدزبانی کے الزام پر مقدمہ قائم ہوا، تو ہکسلے نے محض اسی بنا پر، کسی قسم کی امداد سے صاف انکار کردیا، کہ زبان درازی اور درشت گوئی کی حمایت کرنا، خواہ وہ اپنے ہی عقیدہ کی اشاعت کے لیے ہو، اصولاً ناجائز ہے۔

وہ، گو مذہبًا لا ادری ہے۔ مسیحیت کا شدت کے ساتھ مخالف ہے، عہد نامجات عتیق و جدید کے اغلاط کی نہایت بیدردی سے پردہ دری کرتا ہے، تاہم "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" کا سر رشتۂ اصول ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ بائبل کے محاسن سے اغماض نہیں کرتا، بلکہ علانیہ اُنکا اعتراف کرتا ہے، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں، جبکہ ابتدائی مدارس میں بائبل کی تعلیم لازمی کیے جانے کا مسئلہ پیش ہوتا ہے، وہ اس تجویز کی تائید میں کوشاں ہوکر، اپنی غیر معمولی وسیع النظری سے مخالفین و موافقین، دونوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

علم تشریح کے عالم، سر رچرڈ آوین اور ہکسلے کے درمیان مدت سے بدمزگی چلی آتی تھی، آوین انسان و بوزنہ کے دماغ کے باہمی تعلقات کے بابت پیہم غلط گوئی سے کام لیتا، اور ہکسلے اُسکی پردہ دری کرتا، تحریر و تقریر میں متعدد بار ہکسلے کو اُسکی تردید کے لیے اُٹھنا پڑا، مگر باوجود ان سب باتوں کے ہکسلے نے اُسکی جائز عزت میں کبھی کمی نہ کی، بلکہ اُسکی وفات پر جب اُسکے پوتے نے اپنے دادا کی سوانحعمری لکھتے وقت، ہکسلے سے اُسکی سائنٹفک خدمات درتبہ کے متعلق ایک باب لکھنے کی درخواست کی، تو ہکسلے بخوشی راضی ہوگیا۔ ہکسلے کی زندگی کا ایک بڑا حصہ، علماے سائنس، مذہب، اور پالٹیکس، سے مباحثہ و مناظرہ میں صرف ہوا، اور اکثر اُسپر نہایت سخت اور بیدردانہ اتہامات لگائے گئے، لیکن اُسکی عالی ظرفی نے کبھی گوارا نہ کیا، کہ دشنام کا جواب دشنام سے دے۔ ہم پیشہ ارباب فن کی طعنہ زنی، عوام پسند پولٹیکل لیڈروں کے خندہ ہاے تحقیر، اساطین مسیحیت کا سب وشتم، اِن میں سے کوئی شے ایسی نہ تھی، جو جادۂ تحمل سے اُسکے پاے تحمل کو منحرف کرسکتی۔ وہ اپنے مخالفین کے محاسن کا اعتراف اسی طرح کرتا، جیسے کوئی اپنے ہمدرد و دوست کا کرتا ہے۔

انکسار، دتواضع، اور حلم — اوج کمال پر پہونچنے کے ساتھ ہی، عموماً انسان کو اپنے متعلق جو تجربہ

ہوتا ہے، وہ من حیث الاکثر ایسا ہوتا ہے، کہ اُس میں خاکساری و فروتنی کے جذبات نہیں قائم رہنے دیتا۔ چاروں طرف سے نعرہ ہائے تحسین، قبول عام کے اسناد، پبلک کی قدردانی، شہرت و اعزاز کے متعدد شواہد، معاصرین کی داد، یہ چیزیں انسان کو اُسکی صحیح حالت کے اندازہ کا موقع نہیں دیتیں۔ وہ اپنے اصلی مرتبہ سے اپنی قدر و قدرت کو زیادہ سمجھنے لگتا ہے، اور خودداری اپنے حدود سے متجاوز ہوکر خودپرستی کے درجے تک پہونچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب کمال اکثر فخار، متکبر، اور خودپرست ہوتے ہیں۔ لیکن اس کلیہ میں استثناء بھی ہوا کرتا ہے، اور ہکسلے کے واقعات زندگی پر نظر کرنے سے ماننا پڑتا ہے، کہ اُسکا شمار بھی انھیں مستثنیات میں ہونا چاہیے۔

ہکسلے کے دامنِ اخلاق پر خودبینی، کبر و غرور کے گرد و غبار کا خفیف سے خفیف دھبہ بھی نہیں، بلکہ اسکے برعکس، وہ انکسار و تواضع کے نقوش سے آراستہ ہے۔ اسکے تمام شناسا اور احباب متفق اللفظ ہیں، کہ اُسکا عام برتاؤ، ہر شخص کے ساتھ منکسرانہ ہوتا تھا۔ وہ جس شخص سے ملتا، اُس سے اس قدر خوش اخلاقی و تپاک سے ملتا، کہ وہ شخص اپنی جگہ یہ گمان کرنے لگتا، کہ شاید وہی اسکا سب سے بڑا دوست ہے۔ وہ اپنے طرزعمل سے کسی موقع پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتا، کہ وہ اپنے تئیں، معمولی آدمیوں سے کسی بات میں افضل و برتر سمجھتا ہے۔ تقریر و تحریر، پرائیوٹ و پبلک، ہر جگہ وہ اسکا لحاظ رکھتا، کہ کوئی جملہ، ادعا و تفاخر کے لہجہ میں اُسکی زبان سے نہ نکلے۔ وہ گو بہت سے مسائل کا موجد اور مجدد تھا (جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں مفصل بتائینگے) لیکن خود اپنی زبان سے اُسنے کسی اجتہاد یا انکشاف کا دعویٰ نہیں کیا۔ اُس میں عفو و درگزر کا مادہ بہت تھا۔ اُسکو غصہ بہت کم آتا، اور جب کبھی آتا، تو حدِّ اعتدال سے متجاوز نہ ہوتا۔ دنیا کے مختلف حصص سے اُسکے پاس بیشمار اشتعال انگیز خطوط آیا کرتے، اور بعض مراسلات میں تو محض سب و شتم اور لعن طعن ہوتا، لیکن سیلابِ مخالفت و بدزبانی کی یہ لہریں، اُسکے حلم و ضبط کی چٹان سے ٹکریں کھا کر ناکام واپس جاتیں۔

ہمدردی و رفاہِ خلق

ہکسلے کے اخلاقی مرقع میں سب سے زیادہ دلکش اسکی وہ تصویر ہے جس میں وہ ہمدردی اور رفاہ خلق کا لباس پہنے ہوے نظر آتا ہے۔ خواہش بہبودیِ انام کی قبا، اُسکے قامتِ اخلاق پر اس قدر راست آئی تھی، کہ گویا خیاطِ فطرت نے اُسکو اسی کے واسطے تیار کیا تھا۔ خالص علمی مشاغل کے علاوہ، اُسکے وقت کا بڑا حصہ

پبلک کاموں کے لیے وقف تھا۔ وہ جس انجمن، جس جماعت، جس مجلس کی فہرستِ مقاصد میں نفع رسانیِ عامہ کی دفعہ پاتا، اُس میں شریک ہونے سے حتی الامکان کبھی انکار نہ کرتا، خواہ اس شرکت سے اُسکے ذاتی نفع، آسایش، اور صحت کو کتنا ہی نقصان پہونچتا ہو۔ یہی رفاہ خلائق کی حرص تھی، جس نے سائنس کی خاص انجمنوں کے سوا، اُسکو متعدد تعلیمی و سیاسی مجلسوں کا رکن بننے پر مجبور کیا، اور جس سے بالآخر اُسکی صحت کو سخت صدمہ پہونچا۔

انگلستان میں اُسکو، جن افراد یا جماعات کے متعلق علم ہو جاتا، کہ اُنکے ساتھ ناانصافی یا حق تلفی کی گئی، وہ اپنے امکان کے مطابق، اُنکو امداد دینے کے لیے اور اُنکے واسطے چارہ جوئی کے لیے فوراً کمربستہ ہو جاتا۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں جب مسٹر آئر گورنر جمائیکا (امریکہ) نے وہاں کے حبشی باشندوں کے ساتھ، اُنکی بغاوت کی پاداش میں، ایک وحشیانہ برتاؤ کیا، اور انگریزی پبلک نے اس جابرانہ طرزِ عمل پر اُس سے بازپرس کے لیے ایک کمیٹی قائم کی، تو ہکسلے نے نہایت خوشی سے اپنا نام کمیٹی کے ابتدائی ممبروں میں دیدیا۔ اس پر بعض انگریزی اخبارات (مثلاً پال مال گزٹ) نے، جو ملکی تعصب کے رنگ میں رنگے ہوے تھے، یہ طعنہ دیا، کہ ہکسلے، مسئلۂ ارتقاء کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ایک انگریز اور حبشی کی جان کو مساوی سمجھتا ہے!! ان طنز آمیز اعتراضات کے علاوہ، ہکسلے کے بعض خالص احباب اور واجب التعظیم مصنفین، مثلاً ٹنڈل، لارڈ ٹینیسن، کارلائل وغیرہ گورنر آئر کی تائید کر رہے تھے، لیکن وہ عام انسانی بہبودی کا دلدادہ، ملکی تعصبات سے لاپروا، اپنی رائے پر مستقل رہا، اور ڈارون و مِل کے ساتھ آئر کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح ۱۸۸۳ء میں، جب یونیورسٹی کالج، لندن، سے مسِ بریڈلا اور مسز اینی بسنٹ کا اخراج ہوا، جنکے خیالات اُسوقت سخت ملحدانہ تھے، تو ہکسلے نے اپنے دستخط و تائید سے اُنکے ڈفنس کے میموریل (عرضداشت) کو کافی تقویت دیدی۔

دیگر علماے سائنس کی مالی حالت کی خرابی سے جب وہ مطلع ہوتا، تو اگر امکان میں ہوتا، وہ خود اعانت کرتا، ورنہ دوسرے اربابِ وجاہت سے سفارش کر دیتا۔ ۱۸۸۰ء میں جب ایک جرمن سائنس داں مقیم انگلستان نے اپنی مفلوک الحالی سے اُسکو آگاہ کیا، اور ہکسلے کے ذہن میں کوئی دوسری فوری تدبیر نہ آئی، تو اُسکو اپنے بچوں کو جرمن زبان سکھانے کے لیے ملازم رکھ لیا، باوجودیکہ اس خدمت کے لیے ایک معلمہ پیشتر سے موجود تھی[1]۔

[1] لائف، جلد ۲، صفحہ ۲۳۱ - ۲۳۲

انسان کو جو تمغے ملا کرتے ہیں، وہ ممکن ہے، کہ قیمت کے لحاظ سے قابل قدر نہ ہوں، لیکن ایک اعزاز خاص کی علامت اور یادگار سمجھ کر انسان اُنکو نہایت عزیز رکھتا ہے، اور انکی مفارقت آسانی سے گوارا نہیں ہوسکتی۔ لیکن ایک دفعہ جب ہکسلے نے دیکھا کہ اُسکی معمولی آمدنی سے بیوہ بھاوج کی پرورش نہیں ہوسکتی، تو اُس نے رایل مڈل جیسے معزز تمغہ کو بلا تامل فروخت کر ڈالا۔ اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں، جن کو ہم طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔

احسان مندی، دوست پروری

انسان کی اخلاقی زندگی جن عناصر سے مرکب ہے، منجملہ اُنکے ایک خاص عنصر، دوسروں کے احسانات کا احساس اور منت پذیری ہے۔ جن لوگوں نے مسائل علمی پر کچھ اضافہ کیا ہے، یا جنھوں نے ذاتی طور پر کسی کے ساتھ اپنے وقت و محنت کو صرف کیا ہے، اُن کے احسانات کا جائز اعتراف جو افراد نہیں کرتے، وہ حق شناسی کی نگاہ سے محروم ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے افراد کی دنیا میں کمی نہیں۔ غالباً ہر شخص کے تجربہ میں ایسے تلامذہ آچکے ہیں، جو اپنے اساتذہ کے، اور ایسے متاخرین آچکے ہیں، جو متقدمین کے، حقوق کا اعتراف کرنا اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ لیکن ہکسلے کے سوانح نویس کو اس موقع پر بھی آنکھ نیچی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہکسلے اپنے پیشرو محققین کے فضل و کمال کو تسلیم کر لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتا، اور حسب موقع، اسکا علانیہ اظہار کرویا کرتا۔ وہ جب کسی عنوان پر کوئی لکچر یا مضمون تیار کرتا، تو عموماً یہ تصریح کے ساتھ بتا دیتا تھا، کہ اسکے قبل، اس مسئلہ کے متعلق دوسرے لوگ کس حد تک تحقیقات کر چکے ہیں۔ اور جب کبھی اُن سے اختلاف کی ضرورت پڑتی، تو وہ ایسا بہت متانت، اور اُنکے واجبی کمالات کے اعتراف کے ساتھ کرتا۔ وہ اپنے معاصرین کی محنت و کاوش کو بھی نظر انداز نہ کرتا، اور اُسکو جس کسی سے مدد ملتی، اُسکے اعتراف میں بخل نہ کرتا۔ یہی برتاؤ اُسکا اپنے اساتذہ کے ساتھ تھا۔ اپنے آخری حصۂ زندگی میں بھی وہ قدیم اساتذہ کا نام پورے احترام کے ساتھ لیتا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ کوشش کرتا، کہ مالی امداد یا کسی اور ذریعہ سے اُنکے احسانات کا عملی معاوضہ دے، چنانچہ...... کو جو پنشن ملی، وہ ہکسلے کی کوشش کا ثمرہ تھی۔

عمیم الاخلاقی کے ساتھ، ہکسلے اپنے احباب کی خوشی کا خاص طور پر لحاظ رکھتا، اور بجز حق کے، دنیا کی کسی اور چیز کے مقابلہ میں اُنکی خاطر شکنی کو روا نہ رکھتا۔ وہ اُنکو ہر قسم کی امکانی

مدد دینے کے لیے تیار رہتا، اور جہاں تک اُسکی اصول شکنی نہ ہوتی، اپنے احباب کی خاطرداری کے لیے وہ تمام باتیں گوارا کرلیتا- وہ اپنے مختلف احباب کی اعانت، اُنکی سائنٹفک تصنیفات کی اصلاح و نظرثانی کے ذریعہ سے کرتا، اور دوسروں کا کیا ذکر ہے، ہربرٹ اسپنسر جیسا مشہور فلسفی اپنی خالص سائنٹفک تحریروں کی تیاری میں ہکسلے کی اصلاح و ترمیم کا شرمندۂ احسان تھا۔ تحریر کے علاوہ، اسکی پرائیوٹ گفتگو سے جو احباب متاثر ہوکر اُسکے خیالات کو اپنی تصانیف میں اپنی جانب منسوب کردیتے، اُنکا تو شمار ہی نہیں-

خالص علمی ذوق، تحقیق پسندی،

منزل حقیقت شناسی کے مسافر کو جس راہ میں ہوکر گذرنا پڑتا ہے، وہ علم پرستی کا کوچہ ہے- اور مدعیانِ تحقیق کی قدر و قیمت کا کوئی معیار اس سے بہتر نہیں، کہ اُنکے افعال کو دیکھا جائے، اور جانچا جائے کہ اُنکا طرزعمل کو اُنکے دعاوی سے کہاں تک توافق ہے؟ ہم کو خوشی ہے، کہ ہکسلے اس معیار پر بھی پورا اُترتا ہے- لڑکپن سے لیکر مرض الموت تک جو واحد خصوصیت اُسکی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں رہی، وہ اُسکی علم پرستی تھی- خواہ وطن ہو یا عالم مسافرت، افلاس ہو یا فارغ البالی، اطمینان ہو یا پریشانی، وہ طلب علم سے کسی موقع پر دست بردار نہ ہوتا- اس علمی ریاضت کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اُسکو متعدد بار اپنی صحت کو خیرباد کہنا پڑی، لیکن شوقِ علم کی آگ ایسی نہ تھی، جسکو کوئی بیماری سرد کرسکتی- کئی بار ایسا ہوا، کہ ڈاکٹروں نے اُسکو تمام دماغی مشاغل کے ترک اور تبدیلِ آب و ہوا کا مشورہ دیا، اس قسم کے مشوروں کے صرف ایک جزو پر وہ عمل کرتا تھا یعنی کسی غیر ملک یا پہاڑ پر وہ چلا جاتا تھا، مگر علمی مشاغل نہیں ترک ہوتے تھے- کبھی اُس مقام کے جغرافیۂ طبعی کی تحقیقات کرتا، کبھی طبقات الارضی حیثیت سے اُسپر نظر کرتا- غرض اسی طرح کوئی مشقت طلب شغل جاری رہتا-

بذلہ سنجی، حاضرجوابی،

باایں ہمہ، ہکسلے خشک مزاج بالکل نہ تھا، تعبّس و تقشف اُس میں نام کو نہ تھا، بلکہ اسکے برخلاف، وہ نہایت زندہ دل، خندہ جبیں، اور خوش طبع تھا- وہ غمگینی کی حالت میں بھی اپنی زندہ دلی قائم رکھتا، اور جس طلبہ میں موجود ہوتا، اُس کے حاضرین کو اپنی لطیفہ گوئی سے محظوظ کرتا- یہ خصوصیت کچھ زبانی گفتگو تک محدود نہ تھی، بلکہ اسکا

ٹ اسپنسر کی جو تحریریں ہکسلے کی نظر اصلاح سے گزر چکی تھیں، وہ حسب ذیل ہیں:- (۱) فرسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) (۲) پرنسپلز آف بیالوجی (اصول علم انبیات)، اور دو اور مضامین-

اظہار، سب سے زیادہ اُسکے پرائیوٹ خطوط میں ہوا کرتا تھا، اور پبلک مضامین بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔

ہکسلے میں حاضر جوابی انتہا کی تھی، جو دراصل، ذہانت و ذکاوت کا ایک دوسرا مظہر ہے۔ وہ جس برجستگی کے ساتھ مُسکت جواب دیتا، اُس سے خود مخالفین حیرت میں پڑجاتے اس قسم کا ایک واقعہ ہم پہلے باب میں، ۱۸۶۰ء کی اکسفورڈ میٹنگ کے ذیل میں لکھ چکے ہیں، پرائیوٹ گفتگوؤں کے علاوہ، اس قسم کے واقعات اسکو میٹا فزیکل سوسائٹی میں پیش آتے جسکے ایک رکن ڈاکٹر وارڈ تھے۔ ڈاکٹر وارڈ، بہت بڑے مقرر، بہت بڑے مُناظر ہونے کے ساتھ ہی مذہبی معاملات میں سخت متشدد تھے۔ تمام سوسائٹی میں اگر کوئی شخص اُنکا مدِمقابل تھا، تو وہ ہکسلے تھا۔ مسیحی تعصبات کی پاسداری اور سائنس کی مخالفت میں جو چست تقریریں وہ کرتے، اُنکی برجستہ تردید ہکسلے کرتا، اور کامیابی کے ساتھ کرتا۔

اخلاقی تصویر کا دوسرا رُخ

لیکن باوجود ان تمام خوبیوں کے، اور دیگر متعدد محاسن (مثلاً انضباطِ وقت، پابندیٔ عہد، استغنا، صاف گوئی، اہل خاندان کے ساتھ حسنِ سلوک، وغیرہ) کے ہمکو یہ لکھنے میں مطلق عار نہیں، کہ ہکسلے بہرحال آدمی تھا، فرشتہ نہ تھا، اور جو کمزوریاں یا فروگذاشتیں، کہ لازمۂ بشریت ہیں، اُن سے وہ بالکل معصوم نہ تھا۔ وہ اگرچہ عموماً کسی جماعت یا فرد کے متعلق نہایت احتیاط سے راے ظاہر کرتا، تاہم بعض مواقع پر اُسکے قلم سے ایسے جملے نکل گئے، جو دلآزار ہونے کے علاوہ، واقعیت سے بھی کسی قدر دُور ہیں۔ مثلاً ایک پرائیوٹ خط میں وہ اپنی لڑکی کو افغانوں کے متعلق لکھتا ہے، کہ "قومِ افغان، ایک بدانتظام دغاباز، و خونخوار، چوروں اور ڈاکوؤں کا گروہ ہے"[1]۔ گو پورے خط کے دیکھنے کے بعد اُسکی نیک نیتی میں شبہہ نہیں رہتا۔ اسی طرح اور چند مقامات پر ایسے جملے ملتے ہیں، جو کم از کم خلافِ احتیاط ضرور ہیں۔ یا مثلاً وہ بعض عادات سے اس قدر مغلوب ہوگیا تھا، کہ باوجود اُنکی مضرت کے علم کے، اُنکے ترک پر کسی طرح قادر نہ تھا۔ چنانچہ تمباکو نوشی کے ضرر سے وہ خود واقف تھا، اور اُس نے اسکی صحت کو سخت صدمہ پہونچایا، لیکن اُسے نہ چھوڑ سکا۔ اسی طرح زیادہ تحقیق و تفحص کے بعد، چند دیگر جزئی اخلاقی لغزشوں کا وجود بھی پایا جاتا ہے۔

عام اخلاقی زندگی پر ریویو

الغرض اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ ہکسلے میں معائبِ بشری کا وجود تھا۔ لیکن کیا آفتاب میں، باایں ضیاگستری، اور ماہتاب میں باایں

[1] لائف، جلد ۲ صفحہ ۲۴۲۔

نور افشانی، داغ نہیں ہوتے؟ یا انہمہ کیا سطح موجودات کا کوئی نقطہ، گلشنِ ہستی کا کوئی تپا، بحرِ عالم کا کوئی قطرہ، صحرائے کائنات کا کوئی ذرہ، ان دونوں کے وجود سے بے نیاز رہ سکتا ہے؟ پھر جب حقیقی آفتاب و ماہتاب کی فضیلت کا ہم یہ معیار قرار دیتے ہیں، تو کیا وجہ ہے، کہ آسمان کمال کے مہر و ماہ کے لیے ہم یہی اصول نہ قائم رہنے دیں؟

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی اشیاء ہیں، سب کا حُسن و قبح اضافی ہے، مطلق کوئی شے نہیں۔ ہم جس شے کو حسین کہتے ہیں، اسکے معنی یہ ہیں، کہ اسکے اجزاء، من حیث الاکثر، ایسے ہیں، جن میں حُسن کا شائبہ پایا جاتا ہے، ورنہ کوئی نہ کوئی قبیح عنصر اس میں بھی شامل ہوگا۔ پس کسی شخص کی زندگی پر تبصرہ عامہ کرتے ہوے بھی ہمکو اکثریت کے لحاظ سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ اور اس اصول کی بنا پر ہم جب ہکسلے کی زندگی کے روشن و تاریک دونوں پہلوؤں کا موازنہ کرتے ہیں، تو غیر محدود محاسن کے مقابلہ میں، چند گنے ہوے معائب کا پلہ آسمان سے لگ جاتا ہے۔ اور تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ بحیثیت مجموعی، اسکی زندگی، قابل تقلید نہیں بلکہ قابل رشک ہے۔ جس بے غرضانہ طریقہ سے اُس نے علم کی خدمت کی، جس محققانہ طرز سے اُس نے اپنی ذات کو مسائل سائنس کے لیے وقف کر دیا تھا، جس مخلصانہ انداز سے اُس نے اپنی راے کے مطابق معارف حقیقی کی اشاعت کی، اسکی نظیر، تاریخِ عالم، چند افراد سے زاید نہیں پیش کر سکتی۔

انسان اپنی پبلک تحریر و تقریر میں اپنے اصلی خیالات کو چھپا کر دنیا کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے، لیکن پرائیوٹ تحریریں، جن تک نہ محتسب لے تازیانۂ تعزیر کی زد پہونچ سکتی ہے، اور نہ ناقد کی نگاہ، انسان کے صحیح جذبات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آؤ، اور اس آئینہ میں ہکسلے کا عکس دیکھو! وہ اپنے پرائیوٹ روزنامچہ میں، جسکی خانہ پُری کو اشاعت سے کوئی تعلق نہ تھا، اپنے مقاصدِ زندگی کی تصریح، خود اپنی زبان سے اِن الفاظ میں کرتا ہے:-

> "تمام غیر واقعی خیالات و رسوم کو، خواہ وہ کتنے ہی عظیم الشان ہوں، مٹا دینا؛ سائنس کی رفتار کو زیادہ شریفانہ بنانا؛ ذاتی مخالفتوں سے اجتناب کی نظیر قائم کرنا؛ بجز جھوٹ کے، اور دنیا کی ہر شے کے لیے روادار رہنا؛ اور جس وقت تک کوئی کام ہو جائے، اسکی پروا نہ کرنا کہ وہ میری جانب منسوب کیا جاتا ہے، یا نہیں؛ کیا یہ میرے مقاصد ہیں؟"

ان الفاظ کو پڑھو، اور غور کرو، کہ ان میں کہیں سے تصنع کی جھلک نظر آتی ہے؟ پھر فیصلہ کرو، کہ کیا ان سے شریف تر، ان سے اعلیٰ تر، ان سے پاکیزہ تر، مقاصدِ زندگی کسی انسان کے ہو سکتے ہیں؟

یہاں تک ہکسلے کی اخلاقی زندگی کا خاکہ تھا، ذیل میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ اُس کی پوزیشن (درجہ)، اور مختلف طبقات میں اُسکی مقبولیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

ہکسلے کے لیے مقبولیت عام کی راہ میں قدرۃً چند موانع تھے۔ مثلاً اسکی بیحد آزاد خیالی اُسکے غیر مذہبی خیالات، لیکن انکے مقابلہ میں وہ مندرجۂ ذیل اوصاف سے بھی متصف تھا:۔

(۱) اُسکا طرز تحریر اس قدر صاف، واضح، اور قریب الفہم تھا، کہ لوگ اُسکی تصانیف کو دیگر علماے سائنس کے مقابلہ میں بہت کثرت کے ساتھ پڑھتے تھے۔

(۲) اُسکی تحریر میں خالص علمی مسائل سے قطع نظر کر کے ادیبانہ رنگ اس قدر غالب تھا، کہ ایک بڑی جماعت اُسکی تصنیفات کو محض حُسن زبان و لطف انشاپردازی کی غرض سے پڑھتی۔

(۳) اُسکی نیک نیتی و خلوص سے وہ لوگ بھی عموماً متأثر ہوتے، جو اُس سے مختلف عقائد و خیالات رکھتے۔

ان ہی اسباب کا یہ نتیجہ ہوا، کہ ہکسلے کی تحریروں کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ بہ استثناء شاذ، دنیاے سائنس میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ سائنٹفک طبقات میں اُسکو جو مقبولیت حاصل تھی، اُسکا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے، کہ وہ انگلستان، جرمنی، فرانس، روس، اٹلی، مصر، امریکہ، و دیگر اقطاع عالم کی جن اعلیٰ سائنٹفک سوسائٹیوں کا رُکن تھا، اُنکی تعداد پون سَو سے متجاوز تھی!! اور ان میں سے بعض نامور انجمنوں کی کرسی صدارت کی زیب وہ بھی اُسی کی ذات تھی؛ لنڈن، کیمبرج، آکسفورڈ، اڈنبرا، ڈبلن، اور دیگر ممالک یورپ کی جن یونیورسٹیوں نے اُسکو مختلف و متعدد اعلیٰ ڈگریاں دی تھیں، اُنکی تعداد بھی دس سے کم نہ تھی۔ اسکے علاوہ جن رائل کمیشنوں میں وہ شریک ہوا، وہ بھی شمار میں دس تھے۔ رائل سوسائٹی، انگلستان میں سب سے زیادہ ممتاز، سائنس کی مجلس ہے، ہکسلے اس سوسائٹی کا پریسیڈنٹ تین سال تک، اور سکرٹری نو سال تک رہا۔ سالانہ سائنٹفک مجالس میں سب سے بڑی انجمن، برٹش ایسوسی ایشن ہے، ہکسلے کو اسکے تقریبًا ہر اجلاس میں شرکت کرنی پڑتی، اور ایک سے زائد بار اُسکو صدارت دی گئی۔ اسکے علاوہ ملک میں اور بیسیوں انجمنیں تھیں، جو ہکسلے کی شرکت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتیں؛ بیسیوں معزز رسالہ ایسے تھے، جو اُسکے ایک مضمون کے لیے ہر قسم کا معاوضہ دینے کے لیے طیار رہتے؛ دور و دراز ممالک سے لوگ مسائل سائنس میں اُس سے استصواب راے کرتے، اسکے ہمعصر مشاہیر علما میں سے متعدد افراد ایسے تھے، جو گو دیگر اوقات

میں اُس سے ہمسری بلکہ برتری کا دعوے کرتے، لیکن اُس کے درسی لکچروں سے استفادہ حاصل کرنے میں مطلق شرم نہ کھاتے، مثلاً ہربرٹ اسپنسر، پروفیسر میوارٹ، وغیرہ؛ اور ایسے مصنفین تو بہت سے تھے، جو اپنی کتاب کو ہکسلے کی نظر سے گزران لینا، اسکے استناد و اعزاز کی سب سے بڑی دلیل سمجھتے تھے۔ اسی مرجعیت انام کا یہ اثر تھا، کہ اسکی وفات پر سائنٹفک جماعتیں اور انجمنیں، مدتوں نوحہ گاہ بنی رہیں؛ بیشمار جلسوں کے پریسیڈنٹ مرثیہ خوان رہا کیے؛ صدہا درسگاہوں میں عرصۂ دراز تک صفِ ماتم بپا رہی؛ اور تقریبًا تمام مشہور اخباروں اور رسالوں کے کالم، ہفتوں، مہینوں، بلکہ برسوں تک اسکے تعزیتی نوٹس کے لیے وقف رہے۔

ہکسلے کی جو اعلیٰ وقعت اور پوزیشن اسکے معاصرین کی نگاہ میں تھی، اسکا مزید ثبوت اُن لاتعداد مدحیہ اقوال سے بھی ملتا ہے، جو دیگر اعاظم علمائے سائنس نے وقتاً فوقتاً اسکے متعلق استعمال کیے۔ ذیل میں ہم، اُن میں سے صرف چند، مثال کے طور پر درج کرتے ہیں۔ مشہور عالم الحیات پروفیسر کوالویسکی، بین الاقوامی زولاجیکل کانگریس کے موقع پر کہتا ہے:-

"ہکسلے کی وفات سے سائنس کو عظیم الشان نقصان پہونچاہے۔ ہمارے نزدیک اس صدی کے محققین میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوا ہے، جس میں اُسکے مساوی پیش بینی کا مادہ موجود ہو۔ سچ تو یہ ہے، کہ وہ ہکسلے ہی تھا، جس نے علم الجنین کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ ہکسلے ہی تھا، جس نے ڈاروِن کی اصولی کتاب "اصل الانواع" کی اشاعت میں اُسکی مدد کی، اور وہ ہکسلے ہی تھا، جو اصول مندرجۂ کتاب مذکور کا پُرجوش وکیل تھا۔ درحقیقت، دنیائے سائنس کی تاریخ کے مصنف یہی دو شخص، یعنی ڈاروِن، اور ہکسلے ہیں۔" [پرچہ "نیچر" جلد ۵۳، صفحہ ۱۵۶]

زمانۂ حال کا سب سے بڑا عالم الموجودات، ارنسٹ ہیکل کا قول ہے، کہ ہکسلے نے جو غیرخودغرضانہ کام کیے، اُنکی انجام دہی کے لیے،

"نہ صرف علم الحیات کے تمام اصناف کے کامل و وسیع علم کی، اور ایک اعلیٰ قوتِ فیصلہ کی ضرورت تھی، بلکہ انکے لیے، وہ عظیم الشان اخلاقی جرأت بھی لازمی تھی، جو نتائج سے بےخوف ہو کر لاکھوں سال کے قائم شدہ تعصبات کا مقابلہ کرتی ہے اور حق کو محض حق کی وجہ سے تلاش کرتی ہے۔ جس وقت تک علم الحیات کی تاریخ میں ڈاروِن کا نام بحیثیت ایک مجدد کے زندہ ہے، اُسوقت تک ہکسلے کا نام بھی

اُسکے خالص ترین دوستوں، اور کامیاب ترین علم پرداروں میں یادگار رہیگا[۱]۔"

پروفیسر ڈیوس، جو ہکسلے کا سوانح نویس ہونے کے ساتھ ہی، علم الحیوانات کا ماہر ہے، کہتا ہے :-

"ہکسلے کے مجتہدانہ کارنامے، علم الجنین اور علم تشریح نمائندہ کے متعلق، بجائے خود اس قدر دقیع ہیں، کہ اسکے معاصرین کی صف میں اُسکو ایک ممتاز جگہ دے سکتے ہیں۔ اور جب ہم اس پر، علم الاخلاق و علم المعاشرت میں اسکے کارناموں، مسئلہ ارتقاء کی وکالت، اور تعلیمی مسائل میں اسکی محنتوں کا اضافہ کرتے ہیں، تو ہمکو انیسویں صدی کے اُس سائنٹفک انقلاب میں، جو اُسوقت تک یادگار رہیگا، جب تک نسل انسانی کا وجود ہے، اُسکی ذات یکتا و لاثانی نظر آتی ہے[۲]۔"

علم النبات کے نامور عالم سر جوزف ہوکر کا مقولہ تھا، کہ "وہ جب ہکسلے کی تحریروں کو پڑھتا ہے، تو ذہنی حیثیت سے اپنے تئیں اس کے مقابلہ میں بچہ سمجھتا ہے" اور ہکسلے کی عزت افزائی اس سے بڑھکر کیا ہوسکتی ہے، کہ ڈارون تک اس مقولہ کی تائید کرتا ہے۔

اسکے علاوہ، اسی نوعیت کے اقوال صدہا دیگر ماہرین سائنس، مثلاً لارڈ کیلون، ہربرٹ اسپنسر، پروفیسر ٹنڈال، ڈاکٹر ہشل، سر آلیور لوج، الفرڈ والس، سر جان لبک، سر تھسلٹن ڈائر، سر میکال فاسٹر، پروفیسر لنکسٹر، اڈورڈ کلاڈ، وغیرہم کے قلم و زبان سے نکلے ہوے موجود ہیں، لیکن ہم اس سوانح عمری [illegible] کا قصیدہ نہیں بنانا چاہتے۔

ہکسلے کی یہ مقبولیت، سائنٹفک طبقات میں محدود نہ تھی، بلکہ عام پبلک میں بھی اسکو یہی ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ مزدور، پیشہ اور دستکاروں کے گروہ، اسکے گرویدہ، بلکہ بقول پروفیسر میوارٹ کے، اُس پر عاشق تھے۔ چنانچہ مسٹر لیتھومیٹ یہ واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک روز اہل حرفہ میں سے ایک شخص اُنکے نام ایک خط لیکر آیا، اور اُسکو اُنکے حوالہ کرکے، وہ نہایت لجاجت سے اسکے لفافہ کا طالب ہوا۔ اُنکو اس عجیب درخواست پر حیرت ہوئی۔ اس پر وہ کہنے لگا، کہ "جناب، اس لفافہ پر پروفیسر ہکسلے کے دستخط موجود ہیں، اور یہ ایسی چیز ہے، جسکو اپنے ساتھیوں اور اہل و عیال کو دکھانا میرے لیے باعث فخر ہے۔ ہکسلے نے ہماری جماعت کی بہبودی کیلیے جتنی کوشش کی ہے، اتنی کسی دوسرے شخص نے نہیں کی۔"

پروفیسر میوارٹ نے جو دوسرا واقعہ بیان کیا ہے، وہ بھی کچھ کم پُر اثر نہیں۔ وہ نقل کرتے

[۱] رسالہ نارث امیلی ریویو، جلد ، صفحہ ۲۵۹ [۲] پروفیسر ہکسلے" صفحہ [۳] [illegible]، جلد ۲، صفحہ ۴۴

ہیں، کہ ایک مرتبہ، جب ہکسلے ایک لکچر کے بعد کرایہ کی گاڑی کرکے مکان واپس آیا، اور گاڑی والے کو کرایہ دینے لگا، تو اُس نے انکار کیا، اور یوں گویا ہوا۔ "حضور، مجھے آپ کے لکچر سے اس قدر لطف و نفع حاصل ہوا، کہ میں آپ کی جیب پر بار نہیں ڈال سکتا۔ میرے لیے یہی کیا کیا کم ہے، کہ مجھے آپ کی خدمتگذاری کا فخر نصیب ہوا"

اس قسم کے اور بکثرت واقعات موجود ہیں، جن سے اُنکی ہر دلعزیزی و مرجعیت عام کی شہادت ملتی ہے۔

الغرض یہ ہے اُس شخص کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کا خاکہ، جو علم کا فدائی تھا، جسکی عمر تمامتر علمی خدمات کے لیے وقف تھی، اور جو اپنے وجود کا واحد مقصد علمی تحقیقات قرار دے چکا تھا۔ اسکو، اور اسکے ساتھ تالیف ہذا کے دوسرے حصہ کو بھی پڑھ کر، انصاف سے کہو، کہ کیا ذہنی و اخلاقی، علمی و معاشرتی، اوصاف کی یہ جامعیت، دنیا کے شاذ واقعات میں نہیں۔

ہکسلے کی وفات پر، انگلستان کے سب سے معزز سائنٹفک پرچہ نیچر نے جو مفصل مضمون لکھا تھا، اُسکے مندرجۂ ذیل ٹکڑے کا ایک ایک نقطہ، راستی و واقعیت کے دائرہ کا مرکز ہے:-

"ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے، جو مثل ہکسلے کے سائنس کے حدود میں تحقیقات و تشریح کے ذریعہ سے اضافہ کریں گے، لیکن ایک محقق و مفسر کے اوصاف، اُس سے زیادہ دلکش شخصیت کے ساتھ شاذ و نادر ہی جمع ہونگے" (جلد ۵۲، ص ۲۲۸)

علم کی اس سے بڑھکر اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے!!

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب،
کسکے گھر جائے گی یہ سیلِ بلا میرے بعد،

یہ اجزا ہیں ہکسلے کی اُس سوانحعمری کے جو کتابی صورت میں پیش کی جانیوالی تھی۔ دو باب قلمبند ہوچکے تھے کہ سلسلۂ تحریر کسی وجہ سے رُک گیا اور مسئلۂ ارتقا کی تاریخ، اس مسئلہ میں ہکسلے کی موشگافیاں اور اُسکی جملہ علمی کوششوں پر مفصل تبصرہ وغیرہ سب رہ گیا۔ ۱۹۱۱ء میں یہ کتاب شروع ہوئی تھی۔ اور مسودہ میں جابجا اقتباسات، حوالوں اور مناسب ترجمہ کے الفاظ کے لیے جو جگہیں چھوٹی ہوئی ہیں اُنسے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حصہ بھی مکمل نہ تھا۔ اور اب کہ ہمارے عزیز دوست نے فلسفہ سے موالات ترک کردی ہے اور سارا وقت دینی خدمت میں صرف کر رہے ہیں، کیا امید ہوسکتی ہے کہ کبھی اسکی تکمیل کی نوبت آئیگی۔ جن دیگر اہل قلم کو فلسفہ اور فلسفیوں سے دلچسپی ہو، وہ اگر اسکے بقیہ اجزا تحریر فرمائیں تو الناظر نہایت شکریہ کے ساتھ اُنکی اشاعت کریگا۔

ایڈیٹر

لاماے تبت کی تاریخی شخصیت

تبت دنیا کا ایک عجیب ملک ہے۔ کہیں لق و دق میدان ہیں، جہاں کوسوں تک دم و آدم زاد کا نشان نہیں ملتا۔ کہیں پہاڑی جالوں کی بھول بھلیاں ہیں، کہ ایک دفعہ آدمی ان میں چلا جائے تو دنوں سر ٹکراتا پھرتا ہے۔ کہیں چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں اور تنگ درے ہیں؛ شب دیجور کی طرح تیرہ و تار کہ دن کو بھی انسان ان میں جاتے ڈرے۔ کہیں ایسے گھنے جنگل اور وادیوں کے ایسے سرپوش سلسلے ہیں کہ وہاں رات اور دن کا مفہوم ہی کالعدم ہے کہیں بلند و بالا پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں ہیں، اور ایسے سرسبز و شاداب قطعات کہ تا حد نگاہ سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔

قدرتی مناظر کی طرح یہاں کا موسم بھی صد رنگ ہوتا ہے۔ کہیں بہت گرمی کہیں انتہائی سردی، اور کہیں موسم کی ناگواری سے زندگی دو بھر۔ غیر ممالک کے باشندے یہاں بہ مشکل تندرست رہ سکتے ہیں۔ اس ملک کے ریتیلے حصے گرمیوں میں عربستان کا نمونہ ہوتے ہیں۔ جب ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں تو ریت کے ذرے تیروں کی طرح چبھتے اور آنکھوں میں گھستے کف دست میدانوں میں ٹیلے اور پہاڑیاں کھڑی کر دیتے ہیں۔

یہاں کی قدیم تاریخ بالکل تاریکی میں ہے۔ ۴۰۰ ق م سے ہلکی ہلکی روشنی پڑنی شروع ہوئی اور ۶۰۰ بعد مسیح سے خد و خال کسی قدر ابھر کر ساتویں صدی مسیحی سے بالکل نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس گفتگو کا موضوع ان خد و خال کے ایک خاص حصہ؛ لامائیت کا ذکر ہے۔

تحقیق نے اب تک صرف اتنا پتہ چلایا ہے کہ یہاں کی حکومت ایک زمانۂ دراز سے لاماؤں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ "وہ بغیر لاماؤں کے خدا تک نہیں پہونچ سکتے۔ جو کام لاماؤں کی رہنمائی میں نہ کیا جائے وہ شیطانی کام ہوتا ہے اور ایسا شخص کبھی نہیں بخشا جا سکتا۔" وہ ایمان رکھتے ہیں کہ لاما خدا رسیدہ انسان ہوتا ہے، الٰہی قوتیں اسکے ساتھ ہوتی ہیں، اور یہ منصب خدا اپنے خاص خاص بندوں ہی کو عطا فرماتا ہے اسی وجہ سے ملک کے تمام سیاہ و سفید کے مالک لاما ہوتے تھے۔ ہر ضلع کا مالک ایک لاما

ہوتا، اور سارے ملک کا مالک ڈلائی لاما ہوتا تھا۔ جو ان سب کے متفقہ عقیدہ میں سب سے زیادہ
مقدس، پاک و برتر، خدائی قوتوں کا مالک، سب کا آقا، سب کا مالک، اور سب کا آسمانی پیشوا
تھا، اسکے آگے موت بھی عاجز ہو جاتی تھی۔ دینی حیثیت سے ان لوگوں کا وہی درجہ تھا جو اسلامی
تصوف نے ابدال و اَوتاد کا رکھا ہے۔ لیکن حقیقۃً مذہبیت ان لوگوں میں نام کو بھی نہیں ہوتی
تھی، خواہ .... مذہبیت کو کسی معنوں میں استعمال کیا جائے۔ ان کی پوری تاریخ "جسکی لاٹھی
اُسکی بھینس" کی تاریخ ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ قبیلہ میں جو زیادہ شہزور ہوتا وہی اُسکا سردار بن جاتا۔
جو اُس سے زیادہ شہزور ہوتا کہ پوری بستی مع آس پاس کے قبیلوں کے اُسکا لوہا مان جاتی، وہ
لاما کہلاتا، اور جو سب پر غالب آجاتا، ڈلائی لاما کے لقب سے موسوم ہوتا۔

۳۰۰ ق م میں جن چینی سیاحوں کا اس طرف گذر ہوا ہے وہ ان لوگوں کو انسان نہیں سمجھتے۔
کہتے ہیں: یہ لوگ صورت شکل، وضع قطع، گفتار و کردار میں بالکل جانور ہیں۔ جانوروں میں رہتے
ہیں، تن پر کپڑا نہیں ہوتا، درختوں کے پتے روٹیوں کی طرح کھاتے، اور جب شکار نہ ملے تو اولاد کے
خون سے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرتے ہیں۔ قتل و خون انکی فطرت ہو گیا ہے۔ کوئی دن، کوئی گھڑی
ایسی نہیں گزرتی کہ ایک دوسرے کے کھانے کو نہ دوڑتا ہو۔ شادی بیاہ کے مفہوم سے بھی یہ لوگ
ناآشنا ہیں۔ بیٹا ماں پر، باپ بیٹی پر، بھائی بہن پر ہاتھ صاف کرتا ہے، اور اس پر فخر کرتا ہے کہ ہم
کسی کے پابند نہیں ہیں، ہماری اولادیں مختلف قوتوں کی جامع ہوتی ہیں۔ وہ انکی وحشت، بربریت
کے ثبوت میں انکے بیانات بھی پیش کرتے ہیں، لیکن یہاں صرف ایک سردار کی گفتگو کا خلاصہ کافی
ہوگا۔ سیاح کہتا ہے :- میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا: ہمارا سلسلہ اُن بندروں سے
ملتا ہے جو ہمالہ کی طرف سے آئے تھے۔ ان بندروں نے ایک پہاڑی کھتنی کے ساتھ "شادی" کی،
اُس سے بے دُم بندروں کی اولاد پیدا ہوئی، اس اولاد کے ساتھ میں نے کچھ اور کمی کی، رفتہ رفتہ
بال بھی غائب ہو گئے۔ اور پھر ایک ایسا دَور آیا جس میں بندروں کی اولاد ایسی بن گئی کہ اس سے
ہم جیسی نسل چلی"۔ یہ باتیں سچ ہوں یا نہ ہوں، ان میں سیاح کی رنگ آمیزی ہو یا سراسر افترا پردازی،
مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ طور طریق، وضع قطع، صورت شکل، ہر بات میں بنے بنائے بندر ہوتے تھے۔
ابھی کوئی دن کی بات ہے کہ انسانوں کی جون میں آئے ہیں!

۴۰۰ ق م سے ۶۰۰ ب م تک واقعات کی کڑیاں مسلسل نہیں ہیں۔ اس ایک ہزار برس کی
مدت میں جہاں جہاں روشنی کی چمک پڑ جاتی ہے، وہاں چند وحشی مادرزاد ننگے مستقیم القامۃ حیوان ناطق

بکریوں کے ریوڑ، بھینسوں کے گلّے چَراتے، یا جانوروں کے ساتھ کھیلتے کودتے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی جگہ میں اُن جنگوں کا نقشہ نظر آتا ہے جو مختلف جماعتوں کے سُورما اپنی سرداری منوانے کو لڑتے ہیں، اور کبھی کسی گریزپا روشنی کی شعاع میں انکی وحشیانہ معاشرت کا وہ منظر دکھائی دیتا ہے جس میں مرد لِنگ کی پوجا کرتے اور عورتیں لنگ کے آگے جُھکتی اور اُسکو اپنے جسم سے مل کر برکت حاصل کرتی نظر آتی ہیں۔ غرض چھٹی صدی بھی اسی طرح گذر جاتی ہے، اور اُسکے طلوع و غروب میں بھی ناک نقشہ صاف طور پر نظر نہیں آتا۔ اس لیے تاریخی سیاح جلدی جلدی گذرتا ہوا ساتویں صدی کی شہر پناہ پر آکر دَم لیتا ہے۔ اس صدی میں لامائیت مختلف واقعات سے متاثر ہوتی ہے۔ وحشت کی شدت میں کمی ہوتی ہے، بڑھے ہوے بال کٹتے ہیں، لنگوٹی اُتر کر "دھوتی" بندھتی ہے، مذہبی چرچے شروع ہوتے ہیں، اور تبت میں چین کا سکّہ چلتا ہے۔

ساتویں صدی کے آغاز میں بعض جتھوں نے ہمسایہ علاقوں پر حملے کرکے نئی زندگی شروع کی۔ چند سال بعد ان ہی لٹیروں نے اپنے اور ساتھیوں کو جمع کرکے ہندوستان کی طرف چڑھائی کی، اور مُنہ کی کھا کر چین پر دھاوا کیا۔ اتفاق سے فتح ہوگئی، بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ دارالسلطنت تک پہونچ گئے، اور قلعہ شاہی پر قبضہ کرکے قتل عام شروع کیا چینیوں نے اسکی کچھ روک تھام کی، محلسرا میں سے بیگمات کا ہلڑ نکلا، تبتی پھر جھپٹے، مگر ڈلائی نے روکا، وہ گھائل ہوچکا تھا۔ سب گرفتار کرکے اُسکے سامنے لائی گئیں، اُس نے اُن میں سے اپنی گھائل کرنے والی کو لیکر سب کو چھوڑ دیا۔ یہ چینی بادشاہ کی اکلوتی بیٹی تھی، اور سارے ملک میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ ڈلائی نے اس سے خواہش کی، اُس نے کہا ہمارے ہاں بغیر شادی کے کسی غیر مرد سے نہیں ملتے، جو ایسا کرتا ہے خدا اُسے بڑا عذاب دیتا ہے۔ ڈلائی کا وحشی فاتحانہ جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا، بڑھے ہوے ہاتھ روک لیے، بادشاہ کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا، اُس نے اول اول انکار کیا، مگر مغلوب تھا، آخر طوعاً و کرہاً شادی کی۔ ڈلائی بیحد خوش تھا، شہزادی پر سو سو جان سے فدا تھا، اور تمام تبتی اسکو اپنی عظیم الشان فتح سمجھتے تھے۔ لیکن نادانوں کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی فتحمندی غلامی کی زنجیر بننے والی ہے۔ شاہزادی بہت ہوشیار تھی، اُس نے تھوڑے ہی دن میں ان پر ایسا اثر جمایا کہ انکو خبر تک نہ ہوئی اور تبت کو چین کی عملداری میں داخل کر لیا۔

اس عمل دخل کی ابتدا مذہب اور رسم و رواج سے ہوئی۔ چینی عہدیداروں نے اسکو پختہ کیا، اور آخر یہ اعلان کر دیا گیا، اور یہ شہزادی کی زندگی ہی میں ہوا کہ تبت چین کا باجگزار ہے۔ اُس

زمانہ میں چین کا شاہی مذہب بُدھ مت تھا۔ شہزادی کی وجہ سے ڈلائی پہلے ہی سے اس مذہب کو قبول کر چکا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ عوام بھی پیرو ہوتے گئے، اور محبت نے یہ زور باندھا کہ ڈلائی حکومت و ریاست چھوڑ کر سنیاس کی کملی اوڑھے شہر شہر، گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ مذہبی تبلیغ کرتا پھرنے لگا۔ اُدھر شہزادی نے ہندوستان سے بُدھ علما کو بُلا کر جگہ جگہ معابد و مکاتب قائم کرائے۔ سارے ملک میں مذہبی کتابیں پڑھنے پڑھانے کا رواج ہو گیا۔ گھر گھر میں بدھا کے مجسمے نصب ہو گئے۔ اور لاسہ بُدھ مت کا تیرتھ گاہ بن گیا۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب بُدھ مت خود اپنے گھر —— ہندوستان —— میں آخری سانس لے رہا تھا، اور بدعات و ممنوعات کے ساتھ کھلم کھلا بت پرستی ہونے لگی تھی۔ یہاں اسکی اشاعت اسی بگڑی ہوئی صورت میں ہوئی، جو اس ملک کی فطری اوہام پرستیوں کی آمیزش سے بُدھ مت سے مختلف ایک اَور چیز بن گیا۔ اسی وجہ سے مذہب بدل جانے کے بعد بھی مذہبی پیشوائی کے ارکان نہیں بدلے جو لوگ زمانۂ وحشت میں پیشوائی کرتے تھے وہی اب بھی پیشوا رہے، اور دنیوی حکومت بھی اُن ہی کے قبضہ میں رہی۔

تیرہویں صدی کا وہ مشہور تاتاری طوفان جسکی بلا خیز موجوں نے بغداد کو تباہ و برباد کیا تھا، اُسی نے منگولیا اور چین کو بھی زیر و زبر کیا۔ ہلاکو کا بھائی قوب لائی اس طوفان کا سردار تھا۔ اس نے اس ملک کی آب و ہوا سے متاثر ہو کر بُدھ مت اختیار کر لیا۔ اور جب اپنی تاج پوشی کا دربار کیا، تو ڈلائی کو بھی بلایا۔ سر دربار سرو قد کھڑے ہو کر اُسکو تعظیم دی، اور اُسی کے ہاتھ سے تاجپوشی کی رسم ادا کی۔ لیکن قوب لائی کے بعد جب اُسکی اولاد چین سے نکال دی گئی، تو اُس نے سانی بیریا کو آباد کرکے ڈلائی لاما کے لقب سے اپنا ایک رہنما و پیشوا مقرر کیا۔ اس تازہ دم تحریک کا تبت اور منگولیا پر بھی اثر پڑا۔ بہت لوگ یہاں سے سانی بیریا چلے گئے، اور وہاں کی محدود لامائیت نے یہاں کی غیر محدود لامائیت کے آسمانی اقتدار کو بہت کچھ کم کر دیا۔ گو کچھ زمانہ بعد بعض چالاک ڈلائی لاماؤں نے پھر وہی اگلی سی الٰہی سطوتیں حاصل کر لیں اور سترھویں صدی کے نصف اول تک بڑی شان کی حکومت کی۔ مگر اب لامائی عظمت کا ستارہ قطعاً ماند پڑ چکا تھا۔ ۱۷۲۱ء میں ایک ترک قبیلہ نے تبت پر حملہ کیا۔ یہ بُزدلے اُنکی ملیغار کی تاب نہ لا کر بھاگے۔ سیکڑوں تہ تیغ ہوئے، ڈلائی بھی قتل کر دیا گیا۔ اور جس طرح شمع بجھنے کو ہوتی ہے تو اک آن کی آن کو تیز روشنی ہو کر مدھم ہو جاتی ہے، اسی طرح لامائیت بھی دم بھر کو چمک کر ہمیشہ

کے لیے مبہم ہوگئی۔

اس انقلاب میں ایک نوجوان نے بڑی دانائی سے کام کیا، وہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہی ترکی فاتحوں سے مل گیا۔ لاسہ کی فتح میں اُنکو مدد دی۔ پھر خود ہی اپنی فوج لے کر امن و امان قائم کرنے کو نکلا۔ اسکے ساتھ فدائیوں کی ایک بڑی جماعت تھی، جو اُس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اُس لیے ترک اس سے بہت مرعوب ہوے۔ لیکن قبل اسکے کہ وہ اسکی زبردست قوت سے ڈریں، اس نے اُن ہی میں سے ایک کی بادشاہی کا اعلان کرکے اپنے تمام سپاہی اُس کے حوالے کردیے، اور خود اُنکے ایما سے ڈلائی لامہ کی مسند پر رونق افروز ہوا۔ اس نوجوان کا نام ہمزانگ تھا۔

مورخوں کا اتفاق ہے کہ لامائیت کی تاریخ میں مزانگ سے زیادہ ذہین و فطین، ہوشیار و چالاک، قابل و فرزانہ اور ہر رنگ میں کامل کوئی ڈلائی لامہ نہیں ہوا۔ خطابت میں اُسکو کمال تھا۔ وہ صرف اپنی زبان کے بل پر بڑھا، اور اپنے دشمنوں پر اس طرح چھاگیا کہ وہ کٹھ پتلی کی طرح اُسکے اشاروں پر حرکت کرنے لگے۔ اُس نے کہا: "میں اس مذہب کا آخری پیغمبر ہوں۔ میرے بعد اب اس ملک میں، اور اس مذہب کی تبلیغ کے لیے کوئی آسمانی انسان نہیں آئے گا۔ وہ پہلا پاک انسان گمپو جس نے اس ملک میں بُدھ مت کو رواج دیا۔ مقدس بُدھ کی صرف ایک اچٹتی ہی سی نظر پا سکا تھا۔ لیکن مجھ پر اُسکی خاص نظر عنایت ہے، اور اُسکی ساری قوتیں میرے اندر حلول کیے ہوے ہیں۔ میں نے ان ہی قوتوں کے زور سے دوست دشمن سب کے دلوں پر قبضہ کیا، اور غیر ملکی فاتحوں پر فتح پائی ہے، حالانکہ وہ ہمارے خون کے پیاسے اور ہمارے مذہب کے جانی دشمن تھے۔"

مورخ کہتے ہیں کہ وہ بہترین ادیب اور شاعر بھی تھا؛ اُس نے الہامی صحائف کے نام سے جو کتاب پیش کی، وہ قدیم تبتی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔ اُسکو تبتی زبان کے علاوہ سنسکرت، پالی، اور چینی زبان میں بھی ایسا عبور تھا کہ وہ ہر زبان میں ادیبانہ کمال رکھتا تھا۔ اسکے ساتھ ساتھ وہ بہت زیادہ علم دوست بھی تھا۔ اُس نے اپنے دربار میں چین اور ہندوستان کے بڑے بڑے عالم جمع کیے تھے، اور اُن سب کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔

مزانگ اگرچہ بظاہر صرف مذہبی پیشوا تھا، اور حکومت کلیۃً ترک سرداروں کے ہاتھ میں تھی، لیکن حقیقۃً تمام سیاہ و سفید کا یہی مالک و مختار تھا، وہ لوگ صرف برائے بیت تھے، یہ جو

چاہتا کرتا، اور وہ اسکی اُنگلیوں پر ناچتے۔ غرض اس نے ۳۵ برس نہایت شوکت و دبدبہ کی حکومت کی۔ اور آخر میں اپنے بیٹے (گینیٹو) کو جانشین کرکے گوشہ نشین ہوگیا، اور لامائیت کے اثر و اقتدار کو بھی اپنے ہی ساتھ لیتا گیا۔

یوں تو باپ کی طرح بیٹا بھی بہت لائق و ہوشیار تھا، مگر اُس میں عیب زیادہ اور ہنر کم تھے۔ عادتیں بہت نازیبا تھیں۔ پرلے درجہ کا بدچلن، آوارہ، عیاش، نشہ باز، اور بالکل کھُلا ہوا عیار و مکار تھا۔ نہ اُسکو اپنے منصب کا پاس تھا نہ قول و قرار کا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا لامائیت کے سے مقدس منصب کے ساتھ نبھنا مشکل تھا۔ عقیدت کے اندھے اگرچہ اب بھی اُسکے غلام تھے، اور یہ سب باتیں اُنکے نزدیک آسمانی بھید تھیں۔ لیکن وہ خود اپنا دشمن تھا سب کو ذلیل سمجھتا تھا، گالیاں نوکِ زبان تھیں۔ پھر طرہ یہ تھا کہ بے انتہا خشن، تندمزاج، ظالم، خودسر اور جلدباز بھی تھا۔ ان وجوہ سے ایک طرف حکومت سے کھٹ پٹ ہوئی، اور دوسری طرف گھات میں لگے دشمنوں کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے کھُلے بندوں ناراضی کی آگ بھڑکائی، اور "انتقام، انتقام" کے نعرے بلند کرتے محل میں گھُس گئے، اور اُسکو قتل کردیا۔

قتل ہونے کے بعد جب اُس کی اور بہت سی چھُپی ہوئی باتیں کھُلیں تو ملک کی رائے عامہ مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہوگئی۔ اور اُنھوں نے ایک سرے سے سب کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ لاماؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ خدا خدا کرکے اُنھوں نے اس آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اور اپنی جماعت کے ایک سب سے زیادہ معمر، سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ قابل و با اثر شخص کو ڈلائی لامہ بناکر عوام کے معتمد علیہ اشخاص کو بھی اپنی اہتمام و انصرام کرنے والی جماعتوں میں شریک کیا۔ اس نئے ڈلائی کا نام باتو تھا۔ اس نے پانچ برس نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیکر ڈلائیت کی مسند ہی پر جان دی۔

نئے انتخاب میں کسی ایک پر سب کا اتفاق نہ ہوسکا۔ ہر گروہ اپنے سردار کو ڈلائی بنانا چاہتا اور دوسری جماعت کے سرداروں کو ملاحیاں سناتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہم سخت لڑائی ہوئی۔ سپٹنے والے گروہ نے ترکی سرداروں کو اپنا حامی بناکر لاسہ پر قبضہ کیا۔ مخالف جماعت کے شوریدہ پشتوں کو دردناک سزائیں دیں، اور اپنے سردار کو ڈلائی لاما بنادیا۔ مقہور گروہ فریاد لیکر چین پہونچا۔ خاقان نے پچاس ہزار کے جرار لشکر سے اُسکی مدد کی۔ لاسہ کے نواح میں معرکہ کا رن پڑا، دونوں طرف کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ ترکی فوج کو

شکست ہوئی، اُسکے سردار کو پھانسی دی گئی، اور اس گروہ کے سردار کو ڈلائی لاما بنا کر، چینی رزیڈنٹ وہاں متعین کر دیا۔

مگر حالات نے بہت جلدی پلٹا کھایا۔ ڈلائی اور رزیڈنٹ میں ٹکر ہوئی۔ ڈلائی نے اُسے قتل کر کے چینیوں کی سرپرستی سے انکار کر دیا۔ خاقان یہ خبر سنکر بہت برہم ہوا، فوراً ایک بڑی فوج بھیجی، اُس نے یہاں آکر مہینوں تک قتل و خون کی ہولی کھیلی۔ چھ سات مہینے بعد جب ذرا امن و امان ہوا تو اغتائی ترا کن نام ایک تبتی، فاضل ڈلائی بنایا گیا۔ اور چینی حکومت نے بادشاہِ تبت کے نام سے ایک چینی عہدہ دار کو مالک و مختار کر دیا۔ مگر ان میں بھی لڑائی ہوئی بادشاہ نے ڈلائی کو مار ڈالا۔ اس سے تبتیوں کو بہت طیش آیا۔ اور اُنھوں نے چینیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ کئی مہینے سخت افراتفری رہی۔ چین سے پھر فوج آئی۔ اب غلامی کی بندشیں اور زیادہ سخت ہوگئیں۔ اور ڈلائی بننے کیلیے حکومت کا معتمد علیہ ہونا ضروری ہوگیا۔

غرض اس طرح ڈلائی لوگ ایک زمانہ تک نت نئی مصیبتوں کا شکار بنے رہے پہلے ڈلائی ہونا خدا ہوجانا تھا، اس جگہ کے لیے تمنائیں کی جاتی تھیں، مگر اب ڈلائی ہونا قیدی غلام ہونے سے بھی بدتر تھا۔ لوگ اس نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اور جو کمبخت ڈلائی ہوجاتا وہ اپنی موت ہر وقت سامنے دیکھتا۔ چنانچہ پے درپے دس بارہ ڈلائی لاما لوگوں کے آنکھوں دیکھتے قتل ہوے۔

آخری ڈلائی جینتا نگ تھا۔ حکومت کو اُس پر بڑا بھروسہ تھا، مگر یہی سب سے زیادہ اُس کا دشمن ثابت ہوا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے تبت کے چینی افسروں سے ساز باز کر کے حاکم اعلیٰ — بادشاہ کو قید کیا، اور یہ اعلان کر دیا، کہ: "اب ہم چین کے محکوم نہیں ہیں۔ جو چینی یہاں آباد ہیں وہ اس ملک کے باشندے ہیں، خاقان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے آج سے وہ تبتی شمار ہونگے۔ یہاں خاقان کے کسی حکم کی تعمیل نہیں کی جائے گی، جب تک ڈلائی اُسکی تعمیل کی اجازت نہ دیں"

خاقان کے پاس یہ اعلان پہونچا تو وہ بہت غضبناک ہوا۔ زاچون کے گورنر نے فوجیں طیار کر لیں، لیکن ...... حملہ نہیں کیا گیا۔ اور اس طرح تبت سے چین کے دیرینہ تعلقات تقریباً ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ باہر والوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ انکے مفاد ...

ملکوں کے ساتھ بہت کچھ وابستہ تھے، اور اُس کے لیے یہ ضروری تھا کہ یہ دونوں بے تعلق ہوں۔ یہ باہر والے روس اور انگلستان تھے۔ دونوں کی ان دونوں ملکوں پر نظر تھی، اور دونوں کے ایجنٹ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ چین میں تو دونوں کی سفارتیں موجود ہی تھیں۔ مگر کمال یہ تھا کہ روسی ایجنٹ تبت میں بھی پہونچ گئے تھے، جہاں غیر مذہب والوں کی آمد و رفت سخت ممنوع تھی، سیاحوں کو بھی نہیں آنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اور جو بھیس بدل کر آتا گرفتار کر لیا جاتا۔ روسی ایجنٹوں میں ایک نے تو ایسا رسوخ حاصل کیا کہ ڈلائی بالکل اس کی مٹھی میں تھا۔ لوگ اسے ڈلائی سے زیادہ مقدس سمجھتے تھے۔ اس نے ڈلائی اور تبتی سرداروں کو انگریزوں کے خلاف اتنا بھرّوں پر چڑھایا کہ وہ انگریزوں کے نام کے دشمن ہوگئے اور روس کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ لیکن جب مدد کا وقت آیا تو روس نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا ڈلائی کو شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ لاسہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ سب لاماؤں نے بطیب خاطر انگریزی اطاعت قبول کر لی اور ڈلائی کا عہدہ توڑ دیا گیا۔ اب تبت کے اضلاع برطانی نوآبادیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

"ناظر"

افکارِ اصغر

ترکِ مدعا کر دے عینِ مدعا ہو جا
شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا
اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا

اُسکی راہ میں مٹ کر بے نیازِ خلقت بن
حسن پر فنا ہو کر حسن کی ادا ہو جا

تو ہے جب پیام اُسکا پھر پیام کیا تیرا
تو ہے جب صدا اُسکی آپ بے صدا ہو جا

سازِ دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہے جب
جانِ مضطرب بنکر تو بھی لب کشا ہو جا

اصغر گونڈوی

خلط بحث

(از پروفیسر رشید احمد صدیقی علیگ)

مجھے اکثر کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ بعض جانوروں کی شکل بعض آدمیوں کی شکل سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے - میرا یہ عقیدہ اُس وقت سے ہے جب میں "فلسفۂ میمونی" سے قطعاً ناآشنا تھا۔ اس معذرت کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ کوئی صاحب اس کلیہ کی تطبیق میں غیر معمولی ذہانت یا ستم ظریفی کو دخل نہ دیں گے -

یہ تمہید (اگر اسکو تمہید کہہ سکتے ہیں) مختصر بھی ہے اور نامکمل بھی - اور میری عادت ہے جب تک کسی مضمون پر ابتدائی دو چار اوراق سیاہ نہ ہولیں طبیعت میں روانی نہیں پیدا ہوتی - بدقسمتی سے میں سوچنے کا عادی نہیں ہوں، اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے تو مفید نتائج نہیں برآمد ہوئے ہیں - ایسی حالت میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ موضوع زیر بحث پر کافی غور و خوض کے بعد قلم اُٹھایا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا ہے کہ جو کچھ سوچا تھا وہ تو ذہن میں رہ گیا اور جو ضبطِ تحریر میں آیا وہ کچھ اور ہے - اسے میں یادش بخیر "مرشد" (ذاکر حسین خاں صاحب بی اے علیگ) کا فیضان سمجھتا ہوں - مرشد کو ایکبار ڈرائنگ کا شوق ہوا، فرماتے تھے میں نے نہایت کوشش کے ساتھ گھوڑے کی تصویر بنانی شروع کی لیکن جب بنا چکا تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کے بجائے اچھا خاصا گدھا موجود ہے - مرشد دل برداشتہ ہوگئے - میں نے کہا آپ نے غلطی کی، آپکو گدھے سے شروع کرنا چاہیے تھا - کہنے لگے اب میں ہرگز اس واہیات میں نہ پڑوں گا لیکن میرے مزید اصرار پر چیں بجبیں ہوکر فرمایا " اور کیوں جناب گدھا بنانے میں کسی آدمی کی شکل نکلی تو میں کیا کروں گا، خواہ مخواہ کھنچا کھنچا پھروں گا، یہ آسیبی فن آپ ہی کو مبارک!

اس طریقۂ کار کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تمہید بے معنی یا غیر متعلق رہ جاتی ہے لیکن مضمون چل نکلتا ہے - اس لیے میں اسے یہیں ختم کردینا چاہتا ہوں - بہت ممکن ہے مضمون مکمل ہوجانے پر اسے حذف کردوں - پھر یہ بھی توقع ہے، شاید کھینچ تان کر کوئی مفہوم نکال لیا جائے - آخر تصوف کے زور سے بعض ذی فہم، بے معنی یا پیچیدہ اشعار سے بھی تو معنی نکال ہی لیتے ہیں -

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ آپ اکثر ایسے لوگوں کو بھی پائیں گے جنکو دیکھنے کے ساتھ ذہن

کسی خاص چیز یا جانور کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ ہمکو اکثر ایسی خوشبو سونگھنے کا اتفاق ہوتا ہے جس سے وہ باتیں یا واقعات تازہ ہو جاتے ہیں جو مدت ہوئی کبھی اُسکے ساتھ نسبت رکھتی تھیں۔ اسکے ثبوت میں میں خود اپنا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اُردو کے ایک بے پناہ مضمون نویس یا بجٹ نگار کے انداز سے جسنے اُردو داں حضرات غالباً واقف ہونگے - وہو ہذا

۱- "یوکلپٹس آئل" سے انفلوانزا کی یاد تازہ ہوتی ہے
۲- "نیپتھلین" کی گولیوں سے پلیگ " " "
(۱ و ۲:) یا پھر کافور سے جنازہ کی
۳- ایڈو فارم سے اسپتال " " "
۴- "والدین" سے علیگڈھ کالج پر ترک موالات کی یورش کی
۵- شلجم کے اچار سے نمائش علیگڈھ کی
۶- اپنے موجودہ مکان مسکونہ سے کسی کہنہ سال مفلس عیالدار عیسائی کے ریلوے کوارٹر کی!

میرے مکان کا ایک فلسفہ تاریخ ہے - یورپ میں تاریخ کا کچھ ہی مفہوم ہو، ایک قدامت پرست ہندوستانی کی حیثیت سے تو میں تاریخ کے معنی یہ سمجھتا ہوں کہ کب اور کتنے لوگ، جان لینے یا دینے پر آمادہ ہوے - اس کلیہ کے تحت میں مہابھارت، تیسرے درجہ کے مسافر، انجمن بین الاقوام، میونسپلٹی کے الکشن، میرا مکان (جو میرے ورود سے قبل یونانی شفاخانہ یا ہندوستانی دواخانہ تھا) آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں یونانی شفاخانہ اور اُسکے متعلقات اور متعلقین سب کا وصال ساتھ ہی ہوا -

میں نہیں سمجھ سکتا اس پر اظہار تاسف کروں یا مسرت، ممکن ہے دونوں خطرہ سے خالی نہ ہو - اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آتا ہے - کسی بادشاہ کی وفات پر اسکا لڑکا وارث تاج و تخت ہوا - نئے حکمراں سے اسکی تخت نشینی پر کوئی اظہار مسرت کرتا تو اس قصور پر سزا پاتا کہ اس نے والد مغفور کی وفات پر اظہار تعزیت کیوں نہ کیا، اور اظہار تعزیت کرتا تو یوں قابل تعزیر قرار پاتا کہ موجودہ حکمراں کی تاجپوشی پر اظہار تہنیت کیوں نہ کیا - بالآخر مسخرہ کی باری آئی - بادشاہ نے دیکھا کہ یہ اپنا منہ انتہائی پہنائیوں اور گہرائیوں تک کھولے ہوے خاموش کھڑے ہیں۔ خطاب ہوا کیا ماجرا ہے - یہاں آواز کے بجاے مُنہ سے مکھیوں کی درآمد و برآمد جاری تھی۔ سارا دربار متحیر تھا، مزید استفسار پر غائیں غائیں کرکے رہ گئے، بالآخر سب نے ملکر سخت اصرار کیا تو فرمایا، "جہاں پناہ، یہ دونوں واقعات کچھ ایسے مسلسل اور بے لاگ پیش آئے کہ مجھے "منہ بائی" (ایک

مرض جس میں منہ ایک دفعہ کھل کر پھر بند نہیں ہوتا) ہوگیا۔ اب حضور ہی سمجھ لیں مجھ پر کیا عالم گذرا!"

بہر حال اب یہ عالم ہے کہ ہم ہیں اور یونانی شفا خانہ۔ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہی جب ایک کمرہ میں حکیم صاحب بیٹھے رہتے تھے، دوسرے کمرہ میں مریض لڑکے اور تندرست بیرے کسی کے ہاتھ میں پڑیہ ہے اور کسی کی بغل میں گلاس یا پیالے۔ کوئی پڑیا سنبھال رہا ہے، کسی کو کٹہرہ کے اندر سے "حافظ جی" سفوف ملین پھنکار رہے ہیں اور اوپر سے غیر مالیدہ، المونیم کے گلاس میں کچھ اسی قسم کا جوشاندہ پلا رہے ہیں۔ حافظ جی کے ہاں ہر قسم کے حرکات ارادی یا غیرارادی کا ایک علٰحدہ محکمہ تھا اور اُس میں سے ہر ایک کو خود مختار نوآبادیوں کا اقتدار حاصل تھا۔ انکے ہاں کوئی محکمہ منتقلہ نہ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوعملی کے جھگڑوں سے پاک رہے۔ حافظ جی کے پانوں چلتے رہتے تو زبان خاموش رہتی، سنتے تو دیکھنے سے اغماض کرتے۔ غرض ایک وقت میں صرف ایک کام کرتے تھے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ واقعۃً وہ صرف ایک کام کرتے تھے، بلکہ جس طرح کسی ایک فعل کے سرزد ہونے میں سارا نظام عصبانی متحرک ہو جاتا ہے اور فی الحقیقت ایک فعل مختلف دوسرے افعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طور پر دیکھنے والے صرف یہ دیکھتے کہ حافظ جی مسلسل سفوف ملین اور جوشاندہ کا دَور کرا رہے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت فعل کہیں پہلے سرزد ہوچکا تھا صرف وقوع فعل ہمارے مشاہدہ میں آسکا۔ جس طور پر پرندکے شکار ہو جانے کے بعد بندوق کی آواز کان میں آتی ہے، ٹھیک اسی طور پر مریض دوا پینے سے پہلے ہی محسوس کرلیتا کہ وہ حافظ جی اور دوا دونوں سے عہدہ برآ ہوگیا۔ معمولی نگاہوں نے کبھی یہ نہ محسوس کیا کہ حافظ جی نے کب سفوف ملین کی طرف رخ کیا، وہاں سے جوشاندہ کی دیگ پر کیسے پہونچے اور ان دونوں کو مریض کے گلے سے کب اُتار کر وہ چلے گئے۔ بعضوں نے اُنکو صرف دوا پلاتے دیکھا، بعضوں نے مریض پر جھپٹتے دیکھا، اور زیادہ وہ ایسے ہیں جنھوں نے حافظ جی کا چہرہ بشرہ دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ یہ خود کوئی بدمزہ دوا استعمال کرچکے ہیں اور کلی کرنے کا پانی باوجود تلاش کے نہیں ملا ہے۔

یہ مکان فن عمارت وطب دونوں کا بہترین نمونہ ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں، لیکن غور کرنے سے کافی "انشراح صدر" ہوتا ہے۔ انجینیر مکان ایسے بناتا ہے جس میں دھوپ اور ہوا کی بہتات ہو، حفظان صحت کے لحاظ سے مکان کی چھت ایسی بنائی جاتی ہے کہ

دھوپ اور جراثیم کو تباہ کردینے کے لیے آسانی سے ہٹالی جاسکے۔ اطبا کشتہ پھونکتے ہیں معجون تیار کرکے اُسے کچھ عرصہ تک مدفون رکھتے ہیں، اور عرق کھینچنے کے لیے نل بھبکے کا استعمال کرتے ہیں۔ ان حالات کے ماتحت اس مکان کا جائزہ لیا جائے تو وجد میں آکر خودکشی کرنے کا جی چاہتا ہے۔ مکان کی چھت لوہے کی چادر کی ہے جسکے اوپر "محض خاک پاشیدہ" ہے۔ کوئی روشندان نہیں ہے۔ کواڑ بھی آہنی چادروں کے ہیں، رُخ بھی پچھم کا ہے۔ برآمدہ نہایت وسیع، کھپریل انگریزی۔ شام کے وقت کمرہ کی آخری اندرونی دیوار پر بھی چار چار فٹ اونچی دھوپ رہتی ہے یورپ میں عرصہ سے گیس اور بجلی کے مانند دھوپ کے محفوظ رکھنے کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ یہاں بھی اس پر طبع آزمائی ہوچکی ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ سورج کا دیوتا رتھ پر سوار ہوکر مشرق سے نکلتا ہے اور بقول ملٹن شام کے وقت اسکی گاڑی کا دُھرا بحرِ مغرب میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہاں یونانی اطبا نے کوشش کی تھی کہ جب وہ تھک کر، مغرب کے وقت یونانی شفاخانہ سے گذرے تو فوراً کمرہ کے دروازے (ٹاپے!) بند کرلیے جائیں۔ اگر وہ نہ نکل سکا تو پھر جس طور پر چاہیں گے دھوپ پیدا کرلیا کریں گے اور ساری دنیا میں کہرام مچا دیں گے۔ اور کشتہ پھونکنے، معجون دفن کرنے یا عرق کھینچنے میں کسی قسم کی زحمت نہ ہوگی، گرمی اور حبس کافی میسر آجایا کرے گا۔ معلوم نہیں عہدِ اولیں کی یہ ترکیب کبھی کارگر ہوئی یا نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عرصہ سے یہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے اور اسکی مختلف تاویلیں بھی کیجا رہی ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے یہاں گندھک کی کان عنقریب مشتعل ہونیوالی ہے۔ کوئی کہتا ہے سورج میں مشتعل گیس کا کوئی نیا آتش فشاں بھڑک اُٹھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اسکے متعلق اور شاید اسی سے متاثر ہوکر، میری تفتیش یہ ہے کہ خسروِ خاور واقعی کسی دن یونانی شفاخانہ میں مقید ہوگئے تھے، اور اُنھوں نے ضرورتاً یا اتفاقاً بعض ایسے مقویات اور کشتہ جات کھالیے جنکا بدرقہ اُنکو نہ مل سکا۔ اور نزلۂ حار اور تبخیر کی شکایت پیدا ہوگئی۔ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ جب ممدوح کی آمد و رفت اس درجہ مسلسل اور مرتب ہے تو پھر بجائے اسکے کہ دھوپ کی فراوانی سے ہم گھبرائیں، کیوں نہ علاجِ شمسی کا ایک محکمہ کھول دیں!

غور تو فرمائیے ایسے مکان اور ایسے موسم میں ماہِ صیام کی پذیرائی کس طور پر کیجا سکتی ہے داخلِ شفاخانہ ہونے سے پہلے میں گل منزل (کچی بارک) میں ہر موسم کے ساتھ کروٹیں لے چکا ہوں۔ کچی بارک میں برسات کا ایک ماہ ایسا بھی گذرا ہے جب "بارانِ رحمت" سے کوئی جائے پناہ نہ مل سکی،

تو میں نے ناچار بستر تہ کر کے میز پر رکھا، اور سر "بعقود" ہو کر میز کے تلے جا بیٹھا اور وہ بھی اس طور پر کہ دیکھنے والے یہ سمجھے کہ میز کو سر پہ اُٹھا کر جلا وطنی اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔ اسے پہلے ایک مصیبت سمجھتا تھا لیکن اس مکان میں آکر اپنی پہلی زندگی اور اُسکے تجربات کو تائید غیبی سمجھنے لگا ہوں۔ گرمی کی شدت میں جب لوہے کی چھت تاؤ پر آتی ہے اُسوقت اسکے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ زمین پر خوب پانی بہایا جائے، چارپائی پر بھیگی ہوئی چادر ڈال دی جائے، اور کُلی کرتے کرتے چارپائی کے تلے پہونچکر دراز ہو جائیں۔ ہم روزوں کی اور بیوی بچے اپنی اپنی خیر منائیں اور کوئی ستم ظریف اس گروپ کا" اسنیپ شاٹ" لیکر اسکے نیچے لکھ دے۔

"ہندوستان میں رمضان شریف"

مشکل یہ ہے کہ رمضان شریف میں دو چار باتیں کچھ عجیب قسم کی پیش آتی ہیں۔ روزہ نہ ہو تو دوسروں پر بیجا طور پر بھی غصہ کر لیجیے لوگ کچھ نہ بولیں گے۔ روزہ رکھ کر اور بجا طور پر بھی، اپنے اوپر غصہ کیجیے تو لوگ گوارا نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی ستم ظریفی ہے جس کی مثال تعزیرات ہند میں بھی نہیں ملتی۔ بالغ اور عاقل ہونے کا خمیازہ یوں تو اکثر اُٹھانا پڑا ہے لیکن دنیا میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہیں جو اس سے ہر قسم کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اسکی ادنیٰ مثال عید کا چاند دیکھنا ہے۔ میں کہتا ہوں عقل اور بلوغت کس کام کی اگر یہ صفات وقت پر برسر کار نہ لائی جا سکیں۔ ۲۹ دن کے روزوں کے بعد ریاستوں میں کم سے کم دو بالغ اور عاقل مسلمان ایسے مل جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر چاند دیکھ لیتے ہیں، اور عید منائے جاتے ہیں۔ لیکن ان ریاستوں سے کوئی پوچھے اگر تم ترک موالات نہیں کر سکتے تو کیا یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تم میں سے کوئی مرد خدا (یا بقول حاجی بلغ العلاء) "کیا نام کہ" عاقل اور بالغ مسلمان یہ کہدے کہ رمضان کوئی نیا چاند اپنے ساتھ نہیں لاتے بلکہ یہ شعبان ہی کے چاند کو کھینچ تان کر لیجاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو اس میں کیا قباحت آئی ہے اگر متذکرہ صفات کے دو سو بزرگ جائز طور پر قسم کھائیں کہ ابتک اُنھوں نے رمضان کا چاند ہی نہیں دیکھا!

رمضان میں بعض لوگوں کو مخصوص سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور بغیر کسی غیر معمولی کوشش کے دنیا پر ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام روشن خیال طبقہ میں بھی مقبول ہو رہا ہے، مثلاً وہ لوگ جو پان، تمباکو، سگریٹ، چائے غرضکہ ہر قسم کی منشیات و مقویات میں ایک پیشہ ور یا کامل الفن کی حیثیت سے دلچسپی نہیں لیتے اُنکو دیکھ کر پتہ ہی نہیں لگ سکتا کہ یہ روزہ کی ذمہ داریوں کے کس

حد تک حائل ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ خوش قسمتی سے جن لوگوں کو کام کرنا پڑتا ہے اور ذمہ داریاں بہت ہیں (بالفاظ دیگر بڑی بڑی تنخواہ پانے والے) وہ روزہ کی پابندیوں سے معذور سمجھے جا سکتے ہیں۔ زیادہ کام اکثر حارج نہیں ہوتا لیکن زیادہ ذمہ داریاں اس کی کبھی متحمل نہیں ہو سکتیں اور یہی سبب ہے کہ روزہ ہی نہیں بلکہ دوسری شرعی پابندیاں بھی عوام اور تنگ حال افراد کے لیے زیادہ ضروری ہیں، خواص اور آسودہ حال ان سے مستثنیٰ یا معذور رہیں۔

اتنا لکھنے کے بعد میں نے سوچا آخر طبیعت میں حدت اور وحشت کیوں پیدا ہونے لگی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو عنقریب کچھ ایسے الفاظ نکلنے والے ہیں جن کے غلط سمجھنے یا بالکل نہ سمجھنے کی سخت کوشش کی جائے گی۔ میں سنبھلا، کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھا کیا، آواز دی، معلوم ہوا کہ جس طور پر نصوح کو خواب آور دوا دے کر ڈاکٹر چلا گیا تھا اور بیوی بچے علیحدہ ہٹ گئے تھے وہی حشر میرا ہوا ہے۔ زبان خشک ہو گئی تھی اور سخت تپش محسوس ہو رہی تھی، میں نے خیال کیا اگر کوئی شعر اس وقت یاد آ جاتا تو گھر والوں کو مخاطب کرنے کے لیے کچھ یوں ہی پڑھ سا دیتا لیکن بدقسمتی سے جو شعر یاد آیا، "کباب سیخ ہیں ...... الخ" اس کے پڑھنے کے بجائے سر پھوڑ لینے کی طرف طبیعت زیادہ مائل نظر آئی، اس لیے محض لاحول ولا قوۃ پر اکتفا کیا۔

رفتہ رفتہ چارپائی کے نیچے سے برآمد ہوا، کلیاں کیں، چادر، چارپائی اور فرش پر پانی بہایا، تھوڑا سا سر سے بھی گزار لیا، اور ایک دفعہ پھر چارپائی کے تلے دراز ہو گیا۔ اب طبیعت کسی قدر موزوں ہونے لگی تھی، روزے بھی قابل برداشت معلوم ہو رہے تھے۔ خیال آیا شیطان نے کن وسوسوں میں ڈال دیا تھا، تھوڑی دیر اور نہ سنبھلتا تو خدا جانے کیا پیش آ جاتا۔ سوچنے لگا کہ انسان کو بے صبر نہ ہونا چاہیے۔ یہ عالم رنگ و بو ہے، کسی کو دوام نہیں، کیا تعجب ایک زمانہ ایسا آ جائے جب از منۂ جہالت کی کوئی سنت باقی نہ رہے، مذہب کے بجائے صرف تہذیب رہ جائے، مناکحت کے بجائے صرف جانبین کی روشن خیالی ہو، توالد و تناسل کا مسئلہ صرف فنون لطیفہ سے طے ہو سکے، قابلیت کے بجائے قسمت کی پرستش ہونے لگے، یونیورسٹی کی ڈگری کے بجائے جنم کنڈلی کا مطالبہ ......

خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہونچا تھا کہ میں ایک دوسرے عالم میں پہونچ گیا، معلوم ہوا
کہ سوراج قائم ہے، بڑے بڑے مقرر جمع ہیں، ایک بڑے زبردست چرخہ پر جلسہ کا پروگرام لگا ہوا
ہے، پہیے کی گردش کے ساتھ ساتھ پروگرام کی مختلف مدیں نکلتی آتی ہیں اور اسی اعتبار سے ہر مقرر
تقریر کے لیے آموجود ہوتا ہے، کارروائی کا زیادہ حصہ ختم ہو چکا تھا، چرخہ کو گردش دگئی، یہاں تک
کہ آخری کارروائی کی نوبت آئی۔ یہ مسلمانوں کا رزولیشن تھا۔ نحیف الجثہ صدر نے یہ کہکر کرسی صدارت
پر ایک مسلمان بزرگ کو بٹھا دیا کہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے جسکو مسلمان بھائی خود طے کریں۔ انکا مقرر
اٹھ کھڑا ہوا تو سب لوگ دم بخود ہو گئے، اور تقریر کا آغاز یوں ہوا،

"حضرات! میں جو تحریک پیش کرنے والا ہوں وہ کسی طویل مذاکرہ کی محتاج نہیں ہے۔
قومی نقطۂ نگاہ سے جو باتیں ضروری تصور کیجا سکتی تھیں وہ سب آپ نے منظور کر لیں۔ میں
مذہب کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اور اسکے لیے ضرورت ہے کہ آپ توجہ اور ہمت سے کام لیں،
مذہب میں چند اصلاحات کی سخت ضرورت ہے، اور اس مسئلہ کی اہمیت صرف اس حقیقت سے
محسوس ہو سکتی ہے کہ ہم نے حالت محکومی میں بھی جب تک ممکن ہو سکا اس میں اصلاح کی کوشش
کی اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے۔ آپ جانتے ہیں مسئلۂ جواز سود میں ہم نے ایک نمایاں
حد تک ترقی کی ہے، ہمارے بعض غیر ملکی مسلمان بھائیوں نے تعدد ازدواج کو بھی جرم قرار
دیدیا ہے، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد تعدد ازدواج کا مسئلہ بھی بے معنی
رہ جاتا تھا۔ ہندوستان میں ابھی پردہ کا جھگڑا باقی ہے اس لیے تعدد ازدواج کا مسئلہ خوش اسلوبی
سے طے نہیں ہو سکا ہے۔ خلافت کے اوراق پارینہ ہو چکے، حج کے مسئلہ میں اسمبلی کا فیصلہ آپ
کو یاد ہی ہے۔ زکوٰۃ کا مسئلہ بھی اس درجہ دقت طلب نہیں ہے جتنا ہم نے اُسے بنا رکھا ہے۔
اگر آپ غور فرمائیں تو سُود اور خیرات، دونوں میں ایک اقتصادی راز ہے۔ بعض مسلمان سود نہیں
لیتے لیکن سود دینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس طور پر سود نہ لینے سے نہ صرف مسلمان سراسر نقصان
میں رہتے ہیں بلکہ دوسرے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ خیرات کسی دوسری قوم میں اتنی
لازمی نہیں قرار دی گئی جتنی اسلام میں۔ اب اگر صرف مسلمان خیرات دیں اور خیرات نہ لے سکیں
تو قاعدہ سے وہی نقصان انکے حصہ میں آئے گا جو سود کے سلسلہ میں پیش آتا تھا، اسلیے اگر زکوٰۃ
کو ایک مستقل "لین دین" کی حیثیت دی جا سکے تو خیر ورنہ اسکا حذف کر دیا جانا ہی بہتر ہے۔ کیا
یہ "خسران مبین" نہیں ہے کہ مسلمان سود بھی دیں اور خیرات بھی، اور خود انکی آمدنی کا ذریعہ کچھ

اب لے دے کر صرف نماز اور روزہ رہ جاتے ہیں۔ نماز کے اوقات ضرورت سے زیادہ رکھے گئے ہیں، اور اسکے لوازم اور شرائط ایسے ہیں جنکو بیسویں صدی کا ایک مہذب انسان بجا لانے سے قاصر ہے۔ آپ جانتے ہیں نماز میں طہارت اور وضو کی کیسی سخت پابندیاں رکھی گئی ہیں، اور یہ چیزیں وہ ہیں جن کی قدم قدم پر پرسش ہوتی ہے۔ اور ہم کو خواہ مخواہ ہر ہر قدم پر اسکے متعلق اپنے نفس سے محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہیں شرعی پابندیاں عاقل اور بالغ مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں، لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ گرم ملکوں میں انسان ناقل ہونے سے کہیں پہلے بالغ ہو جاتا ہے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک عقل آئے بلوغ کی جولانیاں اور شرمساریاں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے بالغوں کو یا تو نماز سے معذور رکھا جائے یا پھر یہ طہارت وغیرہ کی پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیے جائیں۔ مجھے معلوم ہے آپ میں سے بعض حضرات یہ اعتراض پیش کریں گے کہ انگریزوں کا دورہ حکومت وہیبت ختم ہو چکا ہے اس لیے اب اس امر کا اندیشہ نہیں رہا ہے کہ کسی سفید پوش حکام اس بدرگ کو طہارت کی پابندیاں گراں گزریں۔ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ سوال انگریزوں کی ذات کا نہیں بلکہ اُنکے گذشتہ اثر و اقتدار کا ہے جو اب بھی ہم پر مسلط ہے اس لیے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نظر برآں، میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہفتہ میں صرف ایک بار جمعہ کی نماز ہوا کرے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی سلسلہ میں ایک اور امر کی طرف آپ کی توجہ مائل کراؤں۔ ہم میں سے بعض قدیم الخیال لوگ اب بھی 'پردہ' کے حامی نظر آتے ہیں، اُنکا خیال ہے کہ اسلام نے اسکی اجازت نہیں دی ہے، اور اگر عورتوں کو اس بارہ خاص میں آزادی دی گئی تو نہایت سنگین اور اندوہناک نتائج مترتب ہوں گے۔ مجھے ان حضرات سے کامل ہمدردی ہے۔ میں اسوقت آپ کے سامنے یورپ وغیرہ کی مثال نہیں پیش کرنا چاہتا، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جب تک ہندوستان میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش میدان حیات میں گام فرسا نہ ہونگی اُسوقت تک ہندوستان کو کامل نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میری رائے ہے کہ فی الحال عورتوں کو کم سے کم نماز جمعہ میں مردوں کے ساتھ صف آرا ہونے کی اجازت دی جائے۔ خدا کے حضور میں دونوں اپنی اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں گے، اگر خطبہ یا قرأت سننے میں طبیعتیں مائل نہ ہوں گی تو یہ کیا کم ہے، "دعا" زیادہ "رقتِ قلب" سے مانگی جا سکے گی۔

حضرات ، مجھے یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہے کہ آپ میں ایک روشن خیال طبقہ اس پر تلا ہوا ہے کہ خطبۂ جمعہ اُردو میں ہو ۔ یہ تحریک ابھی بالکل ابتدائی مدارج میں ہے ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ خصوصیت کے ساتھ مستحق ستایش ہے کہ اُسکے بعض اساتذہ نے انتہائی جرأت اور صاف گوئی سے کام لیکر بہت سے متشککین کیلیے راستہ صاف کردیا ہے ۔ مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ جامعہ کو دہلی منتقل ہونا پڑا ، ورنہ مجھے کامل یقین تھا کہ ہمسایہ مسلم یونیورسٹی جسنے اُردو کو لازمی مضمون قرار دیا ہے اس پیش قدمی سے شرمسار ہوتی ۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے اب اسکے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ خطبۂ جمعہ کے بجاے نماز جنازہ اُردو میں کرادے ...."

قابل مقرر کا سلسلۂ کلام جاری ہی تھا کہ کہیں دُور سے اذان کی آواز سنائی دی، کچھ لوگ پہلو بدلنے لگے ، اور مجمع میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہونے لگا تھا کہ پریسیڈنٹ نے یہ کہکر کہ یہ قابل مقرر کے ساتھ سخت ناانصافی ہے، آرڈر آرڈر کہکر مجلس کے اضطراب کو روکدیا مقرر نے کہنا شروع کیا ،

"حضرات ، نماز ، حج اور زکوٰۃ کے بعد میں روزہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اگر سُوت کاتنے کے بجاے کتوانے کی شرط بھی منظور کی جاسکتی تھی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ روزہ رکھنے کے بجاے رکھوایا نہ جائے ۔ آپ کو معلوم ہے ہندوستانی آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنے بعض محبوب و مقبول مشاغل کے اعتبار سے فاقہ کش رہا ہے ۔ اس فن میں ہندوستانیوں کو اب بھی وہ ملکہ حاصل ہے جو کبھی ڈھاکہ کو ململ بنانے میں حاصل تھا ، امرا کے مشاغل اور ذمہ داریاں اظہر من الشمس ہیں ۔ اگر اُنکو یہ رعایت حاصل ہو جائے گی کہ وہ فاقہ کش آبادی کو روزہ کے شغل میں لگا سکیں تو پھر آپ یقین مانیے نمک پر کتنا ہی محصول کیوں نہ بڑھا دیا جائے اُنکو کبھی محسوس نہ ہوگا ۔ آپ کو معلوم ہے روزہ میں لوگوں کو خواہ مخواہ غصہ آتا ہے اور یہ اصول عدم اشتداد کے منافی ہے ۔ اعلیٰ طبقہ میں روزہ کے باعث غصہ پیدا ہونا بعض اوقات نہایت المناک نتائج کا باعث ہوتا ہے ۔ اول تو اس سے زن و شو کے تعلقات میں اکثر ناخوشگواری پیدا ہوتی ہے اور بعض اخبار والے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ اس طبقہ پر روزہ کا بار ڈالنے سے بسا اوقات مذہب و ملت پر حرف آنے کی نوبت پہونچتی ہے ۔ یہ لوگ صاحب علم و اقتدار ہوتے ہیں اور خدانخواستہ کوئی بات اُنکو ناگوار طبع ہوئی پھر آپ یقین فرمائیں مذہبیا یہ اس قدر روشن خیال ہو جاتے ہیں کہ مذہب و معاشرت کی خیر منانی پڑتی ہے ۔

مفلوک الحال طبقہ، اس میں شک نہیں، اسکے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، لیکن ان کا غم وغصہ اتنے مہلک نتائج نہیں پیدا کرسکتا۔ آخر "تہرد ویش" کس کے لیے وضع کیا گیا ہے۔
حضرات، یہ تو ایک عام بحث تھی جسکے صحیح اور بجا ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔
اب میں اسکا دوسرا پہلو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں بیسویں صدی میں ایک زندہ اور ذہین قوم بغیر اجتہاد کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اجتہاد کی بہترین جولانگاہ، جو ابتک دریافت کیجا سکی ہے، انتخاب زوج یا مذہب ہے۔ آپ کو معلوم ہے، اسلام میں ہم نے اب تک کیسے کیسے نادر اور مفید اجتہاد کیے ہیں، جسکا اشارہ میں تقریباً قبل میں کرچکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ روزہ کے مسئلہ میں بھی آپ اپنی معاملہ فہمی اور زندہ دلی کا ثبوت دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسے سرے سے حذف کردیا جائے، لیکن جب نماز میں خطبہ جمعہ اُردو میں ہوسکتا ہے، موسیقی میں قوالی کا عنصر روا رکھا گیا ہے، قومی کاموں کے لیے بے پردہ ہونا بھی جائز ہے، تو کیا (گرج کر) سات کروڑ فاقہ کشوں کے لیے ہم ماہِ صیام میں ہر روز صرف ایک وقت کا ناشتہ نہیں منظور کرسکتے؟ (مجمع پر کچھ اثر نہ دیکھ کر، رقت آمیز لہجہ میں) اچھا ناشتہ نہ سہی، تو کیا آپ ایک آدھ سگرٹ، دو چار گلوریاں، دو ایک پیالی چائے (آپ چاہیں تو دودھ اور شکر حذف کرسکتے ہیں) ایک آدھ چھینٹے، دو چار چرسے اور کچھ ایسے لطائف وظرائف کے بھی، جو خلوت یا جلوت میں کہیں "نقض امن" کے موجب نہ ہوں، روا رکھ نہیں ہوسکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ روزہ میں جن حرکات وسکنات کی مذہباً ممانعت کی گئی ہے اُن سب کو آزادی دیدی جائے کیونکہ پھر یہ ایک ایسی رعایت ہوگی جس سے ہم باوجود کوشش کے بھی عہدہ برآ یا متمتع نہ ہوسکیں گے۔ پھر اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ لوگ جو ماہ صیام کے محض اس بنا پر شکر گزار ہوتے ہیں، کہ اس میں بعض جبری خدمات معاف کردی جاتی ہیں، اس پر اعتراض کریں گے، اور چونکہ ایسے لوگ بالعموم حکام رس ہوتے ہیں، ممکن ہے ہمارے خلاف ایک دفعہ پھر کوئی اسیٹ انڈیا کمپنی قائم کرادیں اس لیے سوراج نہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس طبقہ کو مکمل آزادی دیدیجائے۔
حضرات، مسئلہ نازک اور وقت تنگ ہے ...."

"وقت تنگ ہے" کا سننا تھا کہ یکلخت آنکھ کھل گئی۔ فوراً چارپائی کے اندر سے نکلا لیکن سرپائے سے ٹکرا گیا تھا، چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ میں سمجھا شام ہوگئی، افطار کا وقت بھی نکل گیا، لپک کر صراحی کی طرف بڑھا کہ اتنے میں ہائیں ہائیں کی آواز آئی۔ میں نے اپنی غلطی کا

احساس کیا، معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بارہ بجے ہیں۔ بہرحال ایسے موقعہ پر مجبوری ہو یا اتّفاقیہ کا کوئی الاٹ پادری، اضطراراً کوئی نہ کوئی حیلہ کرنا لازمی ہے۔ میں نے کہا، اور اس طور پر بس میں درد، خفت، غصہ، بےبسی، سب کچھ شامل تھا۔ کیا کسی کو کرنے کا ارادہ کرنا بھی کوئی جرم ہے۔ میں نے روکنے والے کے چہرہ کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا ورنہ ممکن تھا جرم بھی مستقین ہو جاتا!

یہ تو مکان کی اندرونی حالت تھی، باہر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کسی مفلس کی کہن سال سیاہ فام، نیم برہنہ، عیسائی نے جو ریلوے کی ادنیٰ ملازمت سے پنشن یاب ہو کر دوران جنگ میں ۱۶ آنے ۶ ... گیا تھا اور ایک ... آدی داد و گیری ... اپنی بساط کی سمیت اس مکان پر قابض ہے۔ برآمدوں میں کم خرچ بالا نشین چقیں پڑی ہیں۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ دروں میں گرد آلودہ پودوں کے گملے آویزاں کر دیے جائیں (میرے ہمسایہ دوست نے اسے بھی ملحوظ رکھا ہے) مکان کی آرائش مکمل ہو، پھر تو گویا متذکرہ صاحب خانہ ایک خاکی ہاف پینٹ پہنے ہوئے زینہ پر بیٹھے ہیں، بائیسکل پہلو میں رکھی ہے، کثیف بنیان تن بدن پر ہے، اور "واقعات کی کھتونی میں ناخن تدبیر سے کام لیتے جاتے ہیں۔ سامنے مرغیوں کا بہت لمبا چوڑا ڈربہ ہے۔ اس سے زیادہ لمبی چوڑی بیگم صاحبہ عرض و طول مساوی، شکستہ نسب، سفید بال، سفید سایہ، سفید موزہ، سیاہ جوتا، چہرہ تازہ سیاہی لگی ہوا اور اسکا کچھ حصہ موزوں پر منتقل ہو چکا ہو، ایک درجن مرغیوں کو دانہ چگاتی اور اپنے ہی کم و بیش ایک درجن "بابا لوگ" کو گھرکتی ہنکاتی نظر آتی ہیں۔ ان بچوں کا سرسری نظر سے بھی جائزہ لیا جائے، تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ صرف اسی فضا کی پیداوار ہو سکتے تھے۔ کبھی یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بڑھتے بڑھتے اپنے والدین اور موجودہ فضا اور ماحول کے مانند ہو جائے گا، کبھی یہ محسوس ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے والدین، و اس فضا کا مکمل نمونہ ہے۔

خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ چپراسی نے ایک نوٹس لا کر دیا جس میں حکام بالادست نے ہدایت کی تھی کہ مکان خالی کر دیا جائے تاکہ چھتیں بلند اور پختہ کر دی جائیں اور کچھ ضروری ترمیم اور مرمت بھی ہو جائے! کیا "خدا ساز" بات ہے۔

جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

سرمۂ تحقیق

بجواب

نقد انقد بیخودی

پائے من و بند سخت قلب من و درد صعب
شور ز زنجیر من و ز دلم آہے بس است

(بیخود موہانی)

اپریل کی بائیسویں کو اودھ پنچ میں ادبار الشعرا کے فرضی نام سے ایک مضمون شایع ہوا، جسکی سرخی نقد انقد بیخودی تھی، اس میں میرے اُس مضمون پر داد نکتہ سنجی دی گئی تھی جو الناظر میں "دیوان غالب کی شرحوں پر ایک سرسری نظر" کے عنوان سے نکلا تھا۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے اپنی گود کے پالے، اپنی آنکھوں کے تارے (سب سے چھوٹے بھتیجے) کی آخری نازبرداریوں میں سر و پا کا ہوش نہ تھا۔ ہر شام آفت کی شام تھی اور ہر صبح قیامت کی صبح۔ یاس و امید میں رد و بدل ہو رہی تھی۔ دن چارہ گروں کے در کی خاک چھانتے گذرتا تھا اور رات آنکھوں میں کٹتی تھی ابھی بیمار کی نبض دیکھ رہا ہوں، ابھی اُسکی سانس پر نظر ہے۔ اس ننھی سی جان پر وہ تکلیف تھی کہ خدا دشمن کو نہ دے۔ سانس یوں چلتی تھی جس طرح آرے چلتے ہیں، اور میں

تپ و صرفہ خلیدن پہلو نفس تنگ و نبض منشاری

کے خیال کو دل سے بھلانا چاہتا تھا، مگر نہ بھولتا تھا۔ آخرکار موت نے مرض کا لباس اُتار پھینکا اور اب صاف نظر آنے لگا کہ جسے ہم بیماری سمجھے ہوے تھے وہ ملک الموت کا ایک بھیانک رُوپ تھا۔ مختصر یہ کہ اُسکے جھولے کی طرح اُسکی ماں کی گود خالی ہوگئی، اور چاہنے والوں کو یہ کہکر چپ ہو جانا پڑا

دیوانہ چل کھڑا ہوا دامن کو پھاڑ کے سمجھانے والے بیٹھ رہے ہاتھ جھاڑ کے (بیخود موہانی)

جب وہ پیاری صورت، جب وہ موہنی مورت خاک میں مل چکی اور میرا یہ عالم ہوا کہ راہ چلتے، گھر بیٹھے، جاگتے سوتے مجھے اُسکے کراہنے کی آواز سنائی دینے لگی اور

دنیا کراہنے کی صدا بن کے رہ گئی میں دل کو مرتے دیکھکے آفت میں پڑ گیا (بیخود موہانی)

اور گھر کیا دنیا کی ایک ایک چیز سے اُسکا تعلق نظر آنے لگا، اور میرے دل کی یہ حالت ہوئی۔

تھا کچھ نہ کچھ ضرور ہر اک شے میں دل کا رنگ ۔۔۔ جس چیز پر نگاہ پڑی میں نے آہ کی

تو موہان کا قیام ترک کرنے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اور میں لکھنؤ آیا۔ یہاں مجھے بائیسویں اپریل کا پرچہ (اودھ پنچ) مکرمی جناب شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی مدیر اودھ پنچ سے ملا۔ مگر میں ابھی اپنے حواسوں کو رو رہا تھا کچھ لکھ نہ سکا۔ اسکے بعد محبی جناب حکیم آشفتہ صاحب کی عنایت سے چھٹی مئی کا اودھ پنچ ملا۔ میں نے اعتراضوں پر نظر کی تو مجھے نہایت افسوس ہوا کہ معترض نقاد نے نہ تو مرزا غالب کی غزل کے حل پر قلم اُٹھایا تھا، نہ میری کسی ناچیز رائے پر کوئی مدلل تقریر کی تھی، بلکہ میری اُردو دانی پر بچوں کے کھیلنے والے طمنچے سر کیے تھے۔ جی میں آیا کہ

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خارا

پڑھوں اور خاموش ہو رہوں، لیکن میرے احباب نے نہ مانا اور جواب لکھنے پر اُتنا ہی مجبور کیا جتنا جناب سید علی حیدر نظم طبا طبائی لکھنوی سابق پروفیسر نظام کالج و رکن دارالترجمہ حیدرآباد دکن کو اُنکے احباب نے میرے مضمون پر خامہ فرسائی کے لیے مجبور کیا تھا۔ یہ بھی مجھے گوارا نہ ہوا کہ فاضل مضمون نگار میری خاموشی کو اپنے مضمون کا جواب سمجھکر اپنی توہین قرار دے اور اپنے احترام کا ماتم کرے، یہ بھی اچھا نہ معلوم ہوا کہ عوام غلط فہمی میں مبتلا رہیں، میرے سچے چاہنے والے آزردہ ہوں، یہ بھی پسند نہ آیا کہ بے وجہ دشمن بن بیٹھنے والوں کی زبان سے خواجہ آتش علیہ الرحمتہ کے لاجواب نغمہ کی تانیں فضا میں گونجیں

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ۔۔۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اور اب خاموشی میرے بس کی بات نہ رہی۔

مجھے معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اعتراض جناب طبا طبائی بالقابہ کی ندرت آفریں دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہیں، نمک مرچ مدیر اودھ پنچ نے لگایا ہے۔ اور قیاس بھی اسی کا مقتضی ہے۔ اس مضمون میں تین باتیں ایسی ہیں جنسے کم از کم مجکو تو یہ خیال ضرور ہوتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ۔۔۔ من اندازِ قدت را می شناسم

پہلی بات - عبارت کا یہ خاص انداز، مثلاً " ابو الفضل بھی اسی راہ کا سالک ہے "" پھر بے جہالت آئی "" جتنے ملحقات اس لفظ کے ساتھ ہیں سب کے مطالب کسی نہ کسی طرح انصاف و عدل کی طرف منجر ہوتے ہیں " جہالت، جہال، جاہل - یہ الفاظ تمام مضمون میں نظر آتے ہیں

اور مجھے کسی اُستاد کا یہ شعر بار بار یاد آتا ہے

دیکھیو میرے بد زباں کی ادا — بات کرنے میں گالیاں دے ہے

دوسری بات معترض علام کی غیر معمولی موشگافی اور حد اعتدال سے گذری ہوئی احتیاط مثلاً تاج دارائی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ دارا ایران کا تاجدار تھا سکندر نے اُسکا تاج چھین لیا تھا ایسا تاج قابل مدح نہیں ہو سکتا" (اودھ پنچ ۲۲-اپریل صفحہ ۴ کالم ۱)

ایسی احتیاطیں جناب طباطبائی کے خصوصیات میں داخل ہیں - میں اسوقت صرف اُن جناب کی شرح دیوان غالب سے ایک مثال دیدینا کافی سمجھتا ہوں

شعر غالب :- جوہر تیغ بسر چشمۂ دیگر معلوم — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

ارشادِ جناب طباطبائی :- مصنف مرحوم نے غفلت کی یہاں - ایران میں زہراب اہل زبان پیشاب کو بھی کہتے ہیں، اس لفظ سے بچنا چاہیے تھا" (شرح طباطبائی صفحہ ۲۴۵ - الناظر پریس لکھنؤ)

اے میری اُردو دانی پر جبیں بجبیں ہونے والے تجھے اپنی بے نیازی و بے ادائی کا واسطہ ایک نظر ادھر بھی - دیکھ تو حضرت طباطبائی نے اتنی سی عبارت میں یہاں کہاں پر لکھدیا ہے؟ ایران میں کہنے کے بعد، اہل زبان کہنا کیا صرفِ بامحل ہے -

اب اگر ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے کلام سے صرف وہ اشعار لیے جائیں جنمیں زہراب کا لفظ آیا ہے، تو ایک دفتر بنجائے - اور ان امور پر نظر فرمانے کے لیے میری شرح کا انتظار فرمائیے - اب صرف اُس کا چھپ جانا ہی باقی ہے - اُسکی اشاعت میری بے سروپائی کی کمند میں گرفتار ہے اور اُسکے چھپنے میں فقط لطیفۂ غیبی کا انتظار ہے -

تیسری بات اجتہاد بے بنیاد اور دعوے بے دلیل جناب طباطبائی کا خاص انداز ہے چنانچہ اس مضمون میں بھی ارشاد ہوا ہے -

مثال اجتہاد بے بنیاد - قدیم محاورات میں کوئی تغیر جائز نہیں، محاورہ کبھی نہیں بدلتا -

(اودھ پنچ ۲۲ اپریل ۱۹۲۵ء صفحہ ۶ کالم ۲)

مثال دعوے بے دلیل - معجزہ آراست وسجدہ ریخت فارسی والوں نے بھی نہیں کہا، خواہ وہ ہندی نژاد ہوں یا ایرانی - آپ کون ہیں؟ (ایضاً صفحہ ۴ کالم ۳)

میں نے اس اجتہاد اور اس دعوے کی حقیقت پر آگے بڑھ کر بحث کی ہے -

آپ کی شرح میں ایسے دعووں کی بھرمار ہے - میں اسوقت صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں

آپ غالب کے اس شعر کی شرح میں رقم طراز ہیں۔

رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے　　　وضع میں اسکو اگر سمجھیے قافِ تریاق

"(سمجھیے) کا لفظ اس طرح نظم ہوا ہے کہ میم ساکن اور جیم متحرک ہو گیا ہے۔ اس لفظ کو اس طرح کسی نے موزوں نہیں کیا اور نہ اس طرح محاورہ میں ہے" (شرح طبا طبائی۔ صفحہ ۳۱۳)

اس دعوے کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے میں اسوقت صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں۔ ایک شعر تو مرزا کے معاصر حضرت مومن مرحوم (دہلوی) کا ہے، اور ایک شاہ عالم بادشاہ دہلی آفتاب تخلص نور اللہ مرقدہ کا۔

مومن۔　بیاں کرتا ہے ہکلانے کا اُس بت کے عالم　　　ولے کیا سمجھیے پیچیدہ ہے تقریر شیشے کی[۱]

آفتاب۔　آئے جو خواب میں بھی وہ یوسف لقا تو پھر　　　اے آفتاب دولتِ بیدار سمجھیے[۲]

میرا خیال یہ ہے کہ حضرت طبا طبائی نے جب ایسے دعووں کا قصد کیا تھا تو کم سے کم مرزا کے معاصرین کا کلام تو دیکھ لیا ہوتا۔ حضرت آفتاب سے زیادہ اُردوئے معلّٰی کے جاننے کا دعوے کسکو ہو سکتا ہے؟ قلعہ معلّٰی کے رہنے والے، سودا اور شاگردان سودا کی آنکھیں دیکھنے والے۔ انشا کو اپنی صحبت میں جگہ دینے والے۔ اس شعر میں یہ لفظ (سمجھیے) ردیف واقع ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صورت نظم اتفاقی نہ تھی۔ اس شعر کو صاحب تذکرہ گلشن بیخار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی ارشد تلامذۂ مومن نے انتخاب میں لیا ہے۔ یہ بھی اس لفظ کے صحیح ہونے کی قاطع دلیل ہے۔ اور سودا و میر کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ لفظ اسطرح کتنے مقامات پر نظم ہوا ہے۔

بہر حال یہ مضمون جناب طبا طبائی کی دنیا سے نرالی طبیعت کا آفریدہ ہو یا جناب دیدہ و دل کا رجز، یا اور کسی عنایت فرما کے زور قلم کا نتیجہ۔ اب میں بادلِ ناخواستہ اسکے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، لیکن یہ عرض کردوں کہ میرا یہ مضمون ایسا نہیں ہے جیسے مضمون کی توقع میرے جاننے والوں کو ہوگی۔ اس لیے کہ میں پھر موہان میں ہوں اور یہاں کتابوں کا قحط ہے اور اب تو موہان میں خاک اُڑتی ہے

جہاں اب سانس چلنے کی صدا آتی ہے مشکل سے　　　وہ زنداں گونجتا رہتا تھا آوازِ سلاسل سے (بیخود)

مگر انصاف چاہتا ہے کہ مضمون کے شروع کرنے سے پہلے فاضل معترض کی عنایت کا شکریہ ادا کر دیا جائے اور انشا پردازی کی داد دیدی جائے۔ اسلیے کہ میں نے ایسے مضامین کے لیے ایک نیا انداز نکالا ہے۔ تمہید، شکریہ، داد، اصل مدعا اور التماس جسکے اجزا ہیں۔

شکریہ (۱) مجھ سے ہیچمداں، مجھ سے ہیچمیرز کو قابلِ خطاب سمجھنا ہی وہ احسان ہے کہ اُسکے

[۱] کلیات مومن صفحہ ۱۶۲۔　[۲] گلشن بیخار (تذکرۂ شعرا) صفحہ ۱۵

۳۶۰۵

شکریہ سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔

(۲) میں اس گرمی اور اس اختلاج میں اتنی کتابیں ہرگز نہ دیکھ سکتا۔ یہ صرف معترض نقاد کا کرم تھا کہ مجھے دیکھی ہوئی کتابیں قہراً دیکھنا پڑیں، اور بہت سے ایسے مسائل مستحضر ہوگئے جو گلدستۂ طاق نسیاں بن چکے تھے۔

(۳) مجھے اسکا موقع دیا کہ میں جناب طباطبائی کے بعض اجتہادات کی حقیقت ظاہر کرسکا ورنہ اِن سے دنیا اُسوقت تک واقف نہ ہوتی جب تک اس ناچیز کی شرح شایع نہ ہوجاتی۔

داد | معترض بے بدل نے ۱۶ کالم دو پرچوں میں لکھے اور سبھی کچھ اچھا لکھا مگر مجھے تین جملے بہت پسند آئے۔ اگرچہ جو مفہوم اُن میں ادا کیا گیا ہے اُسکی صحت کا مجھے یقین کیسا گمان تک نہیں۔ مگر اُنکی دلکشی و دلاویزی میں شک کرنا مشرب انصاف میں حرام ہے۔ اس لیے جو الفاظ انکی جان ہیں اُن پر خط کھینچ دیے ہیں۔

۱ سجدہ کوئی رینی نہیں اولتی نہیں، نہ جبیں ملاح کی لنگوٹی ہے۔ (اودھ پنچ ۲۲ اپریل صفحہ ۴ کالم ۳)

۲- البتہ ابکار افکار سے معجزہ آرائیاں ہیبت آفرینیاں کافرماجرائیاں اور اسی خاندان کی دوسری چھپل پائیاں یعنی عقدہ پیرائیاں مرحلہ چکانیاں غلغبہ زائیاں پیدا ہوئیں۔ (اودھ پنچ ۲۲- اپریل ۲۵ء صفحہ ۶ کالم ۲)

۳- ترچھے نے لمحہ بھر تارے دیکھے طالب علم نے چند دقیقہ مطالعہ کیا وہ "اللہ اللہ بھائی کے" کہتی ہوئی پردہ میں داخل ہوئی یہ صیغہ گرداتے مکتب پہونچا وہ بامراد رہی یہ نامراد رہا۔ (اودھ پنچ ۲۲- اپریل ۲۵ء صفحہ ۶ کالم ۲)

ردِ اعتراضات

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اعتراض اول | تاج دارائی پر ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ متاخرین میں تاج دارائی مرزا غالب کے سر پر جلوہ افگن ہوا۔ خلاصۂ عبارت اعتراض:- "ہم جس دارا سے واقف ہیں وہ ایران کا تاجدار تھا۔ سکندر نے اُسکا تاج چھین لیا تھا ایسا تاج قابل ہجو ہے قابل مدح نہیں ہے خواہ وہ دارائی اقلیم سخن سے متعلق ہو یا نہ ہو۔ دارا کے معنی مالک و صاحب کے بھی ہیں لیکن اس مقام پر یہ معنی نہیں لئے جا سکتے" (اودھ پنچ ۲۲- اپریل ۱۹۲۵ء)

جواب ۔ دارائی کے معنی سلطنت رانی اور فرمانروائی کے ہیں۔ تاجِ دارائی اور تاجِ شاہی میں کوئی فرق نہیں ۔ یہ کیونکر سمجھا گیا کہ تاج دارائی کے معنی دارا کا تاج ہیں ۔ اگر ایسا بھی ہوتا تو اعتراض کا کوئی محل نہ تھا ۔ ایرانیوں نے (جو دارائے ایرانی سے تاج کیانی کے چھن جانے سے سیکڑوں برس بعد پیدا ہوئے اور دارا کی حسرت خیز روداد سے ہم ہندوستانیوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ واقف ہیں) دارا کو خدا ۔ مالک ۔ صاحب ۔ بادشاہ ۔ ہر معنی میں استعمال کیا ہے اور بادشاہوں کی مدح میں بھی اُنکو دارا کہکر مخاطب کرتے رہے ۔ اور یہی شیوہ اساتذۂ ہند کا رہا ۔ میں فاضل معترض کی تسکین کے لیے کچھ شواہد پیش کیے دیتا ہوں ۔ واللہ یہدی من یشاء

خاقانیِ ہند ملک الشعرا محمد ابراہیم ذوق دہلوی مدحیہ مسدس بادشاہ کے سامنے پڑھتے ہیں اور یہی منحوس لفظ استعمال کرتے ہیں مگر دلی کا نکتہ رس تاجدار اسے ہجو یا بد دعا نہیں سمجھتا، اُسکے تیوروں پر بل تک نہیں پڑتے ۔ ذوق نے تو یہاں تک غضب کیا تھا، کہ دارا ۔ تاج ۔ اور سکندر سب کا نام ساتھ ہی ساتھ لے لیا تھا :۔

ذوق　　رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے　　سکندر تا ہو نامی سکۂ کشور ستانی سے
　　رہے نامِ سلیماں تا نگینِ حکمرانی سے　　رہے نامِ فریدوں تا درفشِ کاویانی سے

ترا اے خسروِ والا حشم عالم مسخر ہو　　سریرِ سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

طغرا　　دارا　　ہنگامیکہ دارائے ہند سبزہ پروری یعنی جہانگیر بہادر سر از جھروکۂ نیسانی بر آورد[51]

〃　　〃　　دارائے عرش مرتبہ سلطاں مراد بخش　　حاجت روائے زینتِ اورنگ آسماں[52]

حکیم قاآنی　〃　　توئی غالب توئی قاہر توئی باطن توئی ظاہر　　توئی ناہی توہی آمر توئی داور توئی دارا[53]

اس قصیدہ کا مطلع ہے ۔ بگردوں تیرہ ابرے بامداداں بر شد از دریا

〃　〃　　گفتم زشوقِ درگہ دارائے روزگار　　ہر اسم از نسیم دمے وباد آذرا[54]

مطلع ۔　　دوشینہ چوں کشید شہِ زنگ لشکرا

افسرِ دارا ۔ تاج دارا کا مرادف

قاآنی　　تا جلکے از مشابِ تر گذاشتہ بر سر　　غیرتِ تاجِ قباد دادا فسرِ دارا[55]

تاجِ دارائی ۔　　گرفتہ تاجِ دارائی ز دارا　　بفرمان بردنش چوں موم خارا[56]

[51] فرد وسیہ ملا طغرا (رسائل طغرا) صفحہ ۸ ۔ [52] تاج المدائح صفحہ ۷ ، [53] کلیات حکیم قاآنی [54] ایضاً [55] ایضاً
[56] تاج المدائح (رسائل طغرا) صفحہ ۱۸ ۔

کاش معترض نقاد نے دیکھ لیا ہوتا کہ دارا صرف خاندان کیانی کے کسی فرد خاص ہی کا نام ہے یا قیصرو خاقان کی طرح لقب بھی ہے۔ دارائے اکبر و دارائے اصغر کا ذکر تو یہاں تا مطلع میں بھی نظر آتا ہے اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ اکبر و اصغر اسلیے لکھا ہے کہ باپ بیٹے کا فرق ظاہر ہو۔ شان و شکوہ کی کمی زیادتی کا فرق مد نظر نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھ لینا تھا کہ تاریخ کیا کہتی ہے۔

مضمون کے طولانی ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں اتنی مثالیں لکھتا کہ لکھی نہ جاتیں

حیرت ہے کہ فاضل معترض مجھ (جیسے) ایسے بے بضاعت سے ایسی احتیاط کی توقع رکھتا ہے جو حکیم قاآنی اور ملا طغرا ایسے باکمالوں سے نہ ہوسکی۔ ملا طغرا کو جناب طباطبائی بھی مستند سمجھتے ہیں چنانچہ مرزا کے اس شعر کی شرح میں

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

ساقی گری کی سند خود جناب مولانا نے ملا طغرا کے اس شعر سے دی ہے۔ طغرا

کند حق صوفی گری را ادا بیک چشم بیند بشاہ و گدا

(شرح جناب طباطبائی صفحہ ۱۱۰۔ الناظر پریس لکھنو)

مگر مجھے سخت تعجب ہے کہ حضرت شارح نے ملا طغرا کے شعر میں کچشم پر اعتراض نہیں فرمایا حالانکہ مرزا غالب کے اس شعر پر نہایت دلکش عبارت تحریر فرما دی ہے۔

جو مدعی بنے اُسکے نہ مدعی بنیے جو ناسزا کہے اُسکو نہ ناسزا کہیے

ارشاد طباطبائی "اس شعر میں بنیے کا نام آجانا مذاق اہل لکھنو میں گراں گزرتا ہوگا۔ اور البتہ برا معلوم ہوتا ہے" غالباً اس خیال سے معاف فرمادیا کہ ادبائے ایران (شاعری اور زبان اور ہی جنگی گھٹی میں پڑی ہے) کا مذاق اتنا لطیف نہیں جتنا اہل لکھنو کا۔

اعتراض (۲) کوس لمن الملکی۔ اعتراض کی عبارت۔ 'لمن الملک الیوم' ایک آیت ہے مگر لمن الملکی جہال کہتے ہیں جنکو معلوم نہیں کہ لمن الملکی بالکل فصاحت سے گرا ہوا جملہ ہے ذی علم لمن الملک الیوم ہی کہتا ہے"

جواب۔ میرے نزدیک ذی علم حضرات کوس لمن الملک الیوم اور کوس لمن الملکی دونوں یکساں بے تکلفی سے بولتے اور لکھتے ہیں۔ ایک صورت اور بھی ہے یعنی لمن الملک۔ میں ہر صورت کی مثال لکھے دیتا ہوں اور فیصلہ معترض علامہ پر چھوڑتا ہوں۔

لمن الملک الیوم

(۱) از رقعہ غالب: "سنو عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم"۔ (یادگار غالب صفحہ ۶۴)

(۲) سودا۔ "و بر دل آگاہ ایشاں روشن است جمیعے کہ در فن سخن بہائے دریدہ پنہاں دوختہ کوس لمن الملک الیوم کوفتہ از دار الفنا بدار البقا پیوستہ اند"۔ (کلیات سودا صفحہ ۲)

کوسِ لمن الملک

(۱) "کوس لمن الملک بجاتے ہوئے آئے"۔ بند ۴۹۔ مطلع کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ (مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ)

(۲) "اور اکثر شاہانِ یونان کوس لمن الملک بجاتے تھے اور سرِ غرور پیش سلطان جہاں نہ جھکاتے تھے"۔ (مرقع عبرت۔ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی مصنف فسانۂ عجائب)

کوس لمن الملکی

(۱) "ابو علی شیخ ابو علی حسن بن عبد اللہ بن سینا شہیر بہ شیخ الرئیس است حق آنست کہ وے در حکمائے اسلام رشک افلاطون و ارسطاطالیس است۔ در عمر شانزدہ سالگی بعد فراغ از تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ بتصنیف قانون در علم طب پرداختہ و در علوم فلسفیہ کوس لمن الملکی بلند آوازہ ساختہ"۔ (صبح گلشن تذکرہ شعرا صفحہ ۱۲۔ از نواب سید علی حسن خان جانشین نواب صدیق حسن خاں)

(۲) انشا۔ "نخے در فنون رسمیہ مہارتے داشت و در ہر فن کوس لمن الملکی بآوازہ تمام می نواخت" (گلشن بے خار تذکرۂ شعرا۔ صفحہ ۲۹)

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے متعلق جناب طبا طبائی بھی اچھی رائے رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شیفتہ صاحب تذکرۂ شعرا میں مشہور شخص ہیں۔ (شرح طبا طبائی صفحہ ۸۶)

(۳) "امیر خسرو در چہل سالگی علم موسیقی را شروع نمودہ در چند مدت رشک سامعان گردیدہ چنانچہ تا حال کوس لمن الملکی می نوازد" (ثمرات البدائع مرزا قتیل صفحہ ۲۰۴ مطبع محمدی)

اعتراض ۳۔ ہستی کے معنی شخص کے اردو میں نہیں سنے گئے۔

جواب۔ میں اسکے جواب میں اُن حضرات کے اشعار لکھے دیتا ہوں جنکی شاعری پر آج لکھنؤ تو ضرور ناز کرتا ہے۔ اب آپ انکی زبان کو اردو کہیے یا فارسی یہ آپ کو اختیار ہے۔

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہوگئیں

(گلکدہ دیوان جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

جس قدر اطراف میں ہیں مومنوں کی بستیاں ہر جگہ ہیں لکھنؤ کی طرح فاقہ مستیاں
اوج کی لیکن خبر دیتی ہیں اُنکی پستیاں دیکھنا ٹٹنے نہ پائیں یہ مبارک ہستیاں
متحد صوبوں کا ہے صدرالہ آباد تو ایک بازو آگرہ ہے ایک بازو لکھنؤ

(نظم لسان القوم حضرت صفی لکھنوی۔ جلسۂ نہم آل انڈیا شیعہ کانفرنس ۱۹۱۵ء)

اعتراض ۴۔ معجزہ آرائی۔ خلاصۂ عبارت اعتراض "انجمن نہیں میدان نہیں معرکہ نہیں، آراستن کا استعمال اُنھیں الفاظ کے ساتھ ہو سکتا ہے جنکو آرایش سے علاقہ ہو۔ ستم آرا پر معجزہ کا قیاس نہیں ہو سکتا" (اودھ پنچ ۲۲۔ اپریل ۱۹۱۲ء صفحہ ۴۔ کالم ۲ و ۳)

جواب۔ طراز۔ آرایش و نقش و آرایندہ۔ معجزطراز۔ معجزہ طراز۔ سجدہ طراز۔

(برہان قاطع صفحہ ۲۵۴ مطبع علوی علی بخش خاں)

سجدہ طراز (رقعات بیدل صفحہ ۱۸ مطبع حسینی محمود نگر لکھنؤ)

معجزطراز۔ مسیحائے معجزطراز از مُردگان تنائے وصال احمد قائے عالی مقام الخ

(ثمرات البدائع مرزا قتیل مغفور)

اعجاز طراز۔ الحق دریں جزو زماں طرز اعجاز طرازی و سحر پردازی بر ذاتش ختم گردیدہ (〃)

معجزہ طراز: صد سالہ مردہ زندہ ہو گر اپنی بات پر آجائے اُس صنم کا لب معجزہ طراز

(کلیات مومن دہلوی صفحہ ۱۹۴)

معجزہ طراز اور معجزہ آرا کے معنوں میں کوئی فرق نہیں اگر اُسپر اعتراض ہو سکتا ہے تو اِسپر بھی۔ مجھے اپنے حافظہ کی قوت اور اپنی نظر کی وسعت پر اُتنا اعتماد ہوتا جتنا جناب طباطبائی کو ہے تو میں کہہ دیتا کہ یہ ترکیب پہلے پہل میرے قلم سے نکلی ہے مگر ایسا دعوےٰ کرتے ہوئے میرا دل کانپتا ہے۔ اختراع و ابداع ترکیب کے مسئلہ میں اس ناچیز کا مسلک وہی ہے جو عرفی نظیری خاقانی، مرزا جلال اسیر، شوکت بخاری، غالب و مومن دہلوی کا ہے یعنی اگر جزائے ترکیب مطلب کو صحیح طور پر ادا کر دیتے ہیں اور اُن دو یا زیادہ لفظوں کے ملنے میں کوئی قباحت نہیں تو ایجاد ترکیب میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ اور سراج المحققین نواب سراج الدین علی خاں صاحب آرزو کی بھی یہی رائے ہے۔

اعتراض ۵۔ میری اس عبارت پر کہ مرزا خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی

تعلیم، یہ اعتراض ہیں :(عبارت اعتراض)۔ آگے آئی آیت۔ اے حضرت سجدہ ریزی بھی معجزہ آرائی سے لغویت میں کم نہیں۔ سجدہ کوئی ریتی نہیں اولسی نہیں نہ جبیں ملاح کی لنگوٹی ہے۔ معجزہ آراست۔ سجدہ ریختہ فارسی والوں نے کبھی نہیں کہا خواہ وہ ہندی نژاد ہوں یا ایرانی۔ آپ کون ہیں۔ اس فقرہ میں فعل کا حذف بھی ناجائز ہے آپ نے فعل حذف کر دیا۔ اور حرفِ عطف ہے۔ لہذا جملہ یوں ہوگا مرزا خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی تعلیم کرتا ہے۔ ذری عطف و معطوف کا بیان کتب نحو میں دیکھیے۔ کو کے ساتھ کرتا ہے بھی مہمل ہے یا محاورہ نہیں ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں "مرزا خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔"

جواب۔ (سجدہ ریزی) سجدہ ریز، سجدہ ریزی اساتذہ کے کلام میں دائر وسائر ہے۔ اسکی سند مانگنے اور اسپر اس شد و مد سے اعتراض کرنے کا سبب یا تو میری کم مائگی کا اعتقاد، یا ساری دُنیا کے جہل پر اعتماد یا خدا ناکردہ نقص استعداد ہو۔ میں کچھ مثالیں لکھے دیتا ہوں اہل نظر فیصلہ فرمالیں گے۔

(سجدہ ریز)۔ سجدہ ریز۔　　　(بہار عجم صفحہ ۸۸ مطبع نولکشور)

جبینِ ہر دو عالم بر درِ او سجدہ ریز آمد　　　کہ باشد حلقۂ درخاتمِ دستِ سلیمانش

(ناصر علی سرہندی)

غالب۔ ریزشِ سجدہ :- تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو　　　ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

جناب طباطبائی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں" تو آیا اب میرا سجدہ کرنا تجھے مبارک ہو" (شرح طباطبائی ص ۲۴۲)

تعجب ہے کہ جناب طباطبائی نے ریزشِ سجدہ پر یہاں اعتراض نہیں کیا۔ اب یہ خدا جانے کہ مرزا پر اعتراض کرتے کرتے تھک گئے تھے یا مرزا کی رسوائی پر رحم کیا۔ افسوس ہے فاضل معترض اودھ پنچ نے یہاں جناب طباطبائی کی تحقیق پر حسب عادت اعتماد نہیں کیا اور اعتراض جڑ دیا۔ سجدہ ریز :- فرق از سجدہ مالا مال ارادت بر زمین سرافگندگی سجدہ ریز ساختہ

(پنج رقعۂ ارادت خان صفحہ ۱۵۱)

سجدہ ریزی :- اول اُس در پہ سجدہ ریزی کر　　　تا ملے مفت جاہ کیوانی - (کلیات مومن صفحہ ۴۸۳)

سجدہ ریزی ہائے خامۂ تسلیم سرشت بہوائے جناب معنی آراسیت کہ مضامین بے نیازی از معماے کیفیتِ خیالش ناکشودہ در دستن است -　　　(رقعات بیدل - صفحہ ۱۴)

اعتراض ۶ - اس فقرہ میں فعل کا حذف ناجائز ہے۔ **اعتراض ۷** - کو کے ساتھ کرتا ہے بھی مہمل ہے۔

جواب ۱۴۶ - میں حذف فعل کی کچھ مثالیں دیے دیتا ہوں اور یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ
کہ اسے اکتفا بالا ولے کہتے ہیں۔

فعل کا حذف - جناب طباطبائی غالب کے اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنے شکست کی آواز

فعل ناقص کا حذف "یعنی نشاط وطرب سے مجھے کچھ تعلق نہیں میں سراپا درد ہوں اور اپنی
ہی مصیبت میں" (میں کے بعد (ہوں) حذف کردیا گیا - (شرح طباطبائی صفحہ ۱۷)

فعل تام کا حذف - (از رقعہ غالب) جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے
دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے - اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے
کے دو دانت ٹوٹ گئے - ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی" چھوڑ دی محذوف
ہے، یعنی بڑھا دی - (یادگار غالب صفحہ ۶۷)

کو کے ساتھ تعلیم کرنا :- غرض کہ شاہ غریب مرحوم نے اس اکلوتے بیٹے کو نازونعمت سے
پالا تھا اور استاد و ادیب نوکر رکھ کر تعلیم کیا تھا" (آب حیات آزاد دہلوی صفحہ ۴۰۲)

کی مجھ کو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں　　　غیروں کے آگے بزم میں وہ عطر مل گیا

(کلیات مومن صفحہ ۲۱۵)

اعتراض ۸ - فکر آسماں سیر - میرا فقرہ یہ تھا "بیدل کی فکر آسماں سیر ہے - اس پر یہ ارشاد ہوا
عبارت اعتراض " دیکھیے پھر وہی جہالت آئی - آسماں سیر ایک رکیک ترکیب ہے - پڑھے
لکھے آدمی آسماں سیر نہیں کہتے ہیں آپ نے شاید چوک میں جو فلک سیر بکتی ہے اس پر قیاس فرمایا -
ایسے قیاسات سے اردو کی مٹی خراب نہ کیجیے - احسان ہوگا - ہم پر نہیں - اسلئے کہ ہم نے ایسا زمانہ
پایا تھا کہ اردو ایک لطیف زبان سمجھی جاتی تھی - آیندہ نسلوں پر احسان کیجیے"۔

جواب - میں کیا میری نظر کیا - مگر جہاں تک میں نے دیکھا ہے پڑھے لکھے آسماں سیر اور
آسماں سیر بے تکلف لکھتے ہیں - اور اتنا ہی نہیں، فلک سیر کہتے بھی نہیں جھجکتے - اور کہنے والے
بھی وہ جنکو جناب طباطبائی بھی کلمۂ خیر سے یاد کرتے ہیں اگرچہ ادب سے یاد نہ کریں - چنانچہ فرماتے
ہیں "میر انیس کی زبان سوج کو ذبح ہے" (شرح طباطبائی صفحہ ۳۲۸)

کیست فلک سیر - رفرف کا ہم نسب تھا کیست فلک سیر - بند ۸ - مرثیہ مرزا اوج علیہ الرحمہ جانشین
جناب دبیر اعلی اللہ مقامہ - مطلع - کس کام کی زبان جو صدق آشنا نہ ہو - (از معراج الکلام)

اسپ فلک سیر: (بیت) غیرتِ یوسف و رشکِ ملک و حور ہے تو طور تو اسپ فلک سیر ہے اور تو رہے تو
(بند ۹ - مطلع غل ہے اعدا میں کہ زینب کے پسر آتے ہیں - صفحہ ۵۵ - جلد سوم میر انیس علیہ الرحمہ)

" طور تھا اسپ فلک سیر تو وہ شعلۂ طور (بند ۴۶ مطلع سومنو مرنے کو مشکل نہیں ہوتا ہے -
صفحہ ۱۰۹ - جلد سوم - انیس)

" بیدل تھے ملک اسپ فلک سیر کے ہمراہ (بند ۲۰ مطلع جب رو چکے حضرت علی اکبر سے پسر کو -
صفحہ ۱۹۵ جلد سوم انیس)

شبدیز فلک سیر: شبدیز فلک سیر سے اترا وہ نکوکار - (بند ۲۳ مطلع جب باغِ حسینیؑ پہ خزاں آ گئی رن میں - صفحہ ۱۱۴ - جلد چہارم انیس)

رخشِ فلک سیر: پہونچے اُس رخشِ فلک سیر زمیں پیما کو نہ منجم کا خیال اور نہ مہندس کا قیاس
(دیوان ذوق صفحہ ۸۱ - مطبع نامی لکھنؤ)

آہِ آسماں سیر: - ہر چہ از برشتگیِ جگر و افسردگیِ طبع و بالا دویِ آہِ آسماں سیر ... بمن نوشتہ بودید -
(ثمرات البدائع مرزا قتیل صفحہ ۱۲۶)

" : مژدہ آہِ آسماں سیر مرا عنایت کن آخر ایں سروِ بلند از باغِ جاں برخاستہ است
(" صفحہ ۱۳۰)

عقلِ فلک پیما و عرش سیر: دا عجوبۂ نغز و سماے کہ عقلِ فلک پیماے عرش سیر فلاطون فطنیان روزگار را در اک کُنہش سر بآستان اعتراف عجز می سپارد - (" صفحہ ۴۰)

عقولِ آسماں سیر: و تیز گامی ست کہ ہنگام طے ابعاد گوے سبقت از عقولِ آسماں سیر فلسفیان ربایند -
(" صفحہ ۴۴)

جیسے مرزا قتیل - سید انشا - اور سعادت یار خاں رنگین کی رنگین صحبتوں کا علم ہے وہ نہیں کہہ سکتا کہ قتیل اس سے واقف نہ تھے کہ فلک سیر جو چوک میں بکتی ہے اُسکے کیا معنی ہیں - پھر بھی احتیاط نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ فاضل معترض کی طرح دقّتِ نظر سے بہرہ یاب نہ تھے - ورنہ ایسی رکیک ترکیب سے احتراز کرتے - سب سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ میر انیس مرحوم نے (جنکی زبان کو حضرت طباطبائی بھی سوج کوثر کہتے ہیں) فلک سیر کی بھرمار کرنے میں کچھ تامل نہیں فرمایا -

(باقی)

(ناچیز محمد احمد مجذوب موہانی ایم لے)

دیوان جگر کی تنقید پر ریویو

رسالۂ الناظر جون ۱۹۲۵ء میں "انصاری" صاحب نے جگر بسوانی کے دیوان پر تنقید فرما کر قارئین الناظر کی ضیافتِ طبع فرمائی ہے۔ میں مصنف اور نقاد دونوں سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن نقاد صاحب دنیائے تنقید میں ایسے نام سے نمودار ہوئے ہیں کہ اُن سے آئندہ بھی روشناس ہونے کی امید نہیں ہے

مجھے جگر صاحب کے دیوان پر خود کوئی تنقید یا تبصرہ کرنا منظور نہیں ہے، لیکن فاضل نقاد کی بعض لغزشوں کو دیکھتے ہوئے خاموش رہنا قارئین الناظر کے مذاقِ سلیم کو خراب کرنا ہے اسلیے ناظرین الناظر کو ان چند سطور کے پڑھنے کا تصدیعہ دیتا ہوں۔ وہو ہذا۔

مراعات و تناسبات لفظی شعرائے لکھنؤ کے کلام کا جزو لاینفک ہیں۔ حضرت امیر مینائی کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے شعرائے حال کے کلام میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے۔ جگر کے دیوان سے جو اشعار تمثیل میں دیے ہیں اُن میں مراعاتِ لفظی کی آورد ہے، مگر اُس حد تک جو امانت اور رشک کے یہاں پائی جاتی ہے۔ بہر حال یہ تناسبِ لفظی عیب ہو یا ہُنر، جگر صاحب اس خصوص میں تنہا قابلِ اعتراض نہیں ہیں۔ اگر نقاد صاحب کو اصرار ہوگا اور الناظر میں گنجایش ہوگی تو اپنی گزارش کی تائید میں ایک طویل فہرست شعرائے لکھنؤ کے کلام کی پیش کیجا سکتی ہے۔

نقاد صاحب جگر کے کلام میں لکھنؤ کے رنگ قدیم کی خلاف تہذیب شوخیاں ناپسند کرتے ہیں لیکن یہ عیب ہو یا ہُنر، لکھنؤ کے شعرائے جدید کے کلام میں بھی کسی نہ کسی صورت میں اب تک نظر آتا ہے۔ حضرت جلیل جیسے ثقہ اور نکتہ رس شاعر کا ایک شعر پڑھ کر جگر صاحب کو بھی حق ہے کہ اپنے کلام میں لکھنویت کی شوخی کو برقرار رکھیں:-

ہم تو تصور وار ہوئے آنکھ ڈال کے — پوچھو تو نکلے کیوں تھے وہ جوبن نکال کے

معلوم نہیں "جوبن نکال کے" نقاد صاحب کی رائے میں شوخ اور غیر مہذب ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو جگر صاحب پر اعتراض نہ کیجیے۔

جگر صاحب کے کلام پر سوقیت اور پست مذاقی کا بھی الزام ہے، اسکا بھی قطعی فیصلہ دشوار ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا کلام ایک وقت میں سوقیانہ قرار دیا جاتا تھا، اور آج شعرائے حال اُس کو سُرمۂ چشم شاعری بنا رہے ہیں۔

نقاد صاحب تو اُردو کے نقص کو بھی کلامِ جگر میں دکھاتے ہیں اور قارئین کی رائے پر اُس کا فیصلہ چھوڑتے ہیں - میری رائے میں بھی یہی بہتر ہے - تنقید کا اہم ترین حصہ یہ ہے کہ الفاظ اور محاورے غلط نظم کیے گئے ہیں - اور اسی حصۂ تنقید نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں بھی اظہار رائے کروں

قریب المرگ مشتبہ ترکیب نہیں ہے بلکہ غلط ہے، شاید قریب مرگ ہو اور کتابت کی غلطی ہو -

گھبرانے اور شرمانے کا عطف بذریعہ واو عاطفہ یقیناً غلط ہے - لیکن اسی مصرعہ کو فاضل نقاد نے سلسلہ اسی تنقید کے صفحہ ۲۵ پر خود اس طرح پر تحریر کیا ہے : سر جھکا لینے سے گھبرانے سے شرمانے سے - یہی صحیح ہے - نقاد صاحب اس کھلے ہوئے سہوِ کتابت کو تسلیم کرنے میں کیوں پس و پیش کرتے ہیں جو انصاف پسندی کے بھی خلاف ہے -

کوئی انداز تو دیکھے مرے متانے کا - نقاد صاحب کی رائے میں متانہ بغیر کسی مضاف الیہ کے اچھا نہیں ہے مگر یہ دعوے بے دلیل ہے - فانی صاحب بدایونی دنیائے شاعری میں کافی شہرت اور عزت حاصل کر چکے ہیں - غالباً تمثیل میں اُن کا شعر کافی ہوگا -

اب اُسے دار پہ لیجا کے سُلا دے ساقی　　　یوں بہکنا نہیں اچھا ترے متانے کا

افسانہ طول تھا، نقاد صاحب کی رائے میں غلط ہے بجائے طول کے طویل ہونا چاہیے آغا حشر شکسپیر ہند کا شعر ہے -

یہ قصہ طول ہے سُنا کبھی اسوقت جانے دو　　　تمھیں معلوم خود ہو جائیگا وہ وقت آنے دو

بالعموم روزمرّہ "افسانہ طول تھا" بولا جاتا ہے اور مصدر اسم فاعل کے معنی دے سکتا ہے - ہدایۃ النحو کے معنی ہیں ہادی النحو -

موسیٰ جو پھرے دیکھ کے دیدار تمھارا - نقاد صاحب کی رائے میں اُردو میں دیدار دیکھنا غلط ہے - معلوم نہیں یہ خیال کیوں پیدا ہو گیا ہے - شاید حضرت جلیل کے ایک ہی شعر سے اُن کا اطمینان ہو جائے گا -

سوتے سے جگا دے مری قسمت کو الٰہی　　　سوتے میں دکھا دے مجھے دیدار محمدؐ

نقاد صاحب اگر وسیع النظری اور وسعتِ معلومات سے کام لیتے تو اُنکی تنقید اس سے بہتر ہوتی -

فقیر امیر بدایونی

غزلیات

انداز بگڑنے میں کیا کیا نظر آتا تھا
دلکش سب مجھے ظالم کا غصہ نظر آتا تھا

مشکل شبِ غم مجھکو مرنا نظر آتا تھا
ظالم کا ہر اک وعدہ سچا نظر آتا تھا

آغازِ محبت کیا اچھا نظر آتا تھا
اب کیا نظر آتا ہے جب کیا نظر آتا تھا

حیراں ہوئے ہم کیا کیا محفل میں حسینوں کی
یہ اُس سے تو وہ اس سے اچھا نظر آتا تھا

کرتے نہ جفاؤں سے تو یہ تو وہ کیا کرتے
کب بعد مِرے کوئی مجھ سا نظر آتا تھا

ظالم تری چتون کو دیتا تھا دعا دل سے
جب زخمِ جگر کوئی گہرا نظر آتا تھا

تو شمع حرم میں تھا تو طور پہ تھا بجلی
ہر گھر میں مجھے تیرا جلوہ نظر آتا تھا

کب وادیٔ وحشت میں محروم رہا کوئی
ہر خار پہ دامن کا ٹکڑا نظر آتا تھا

دل بسملِ غمزوں کا وہ دیکھ کے کیا کرتے
چپکا ہوا اچھا ہے سے پہلا نظر آتا تھا

کیوں نامِ شکوں لے کر احباب نے لی چٹکی
دل میرا ذرا پہلے ٹھہرا نظر آتا تھا

آنکھوں سے لگاتا تھا رکھ لیتا تھا میں دل میں
تلوؤں میں اگر کوئی کانٹا نظر آتا تھا

وہ سامنے آتا تھا جب چیں بجبیں ہو کر
مجھکو مری قسمت کا لکھا نظر آتا تھا

نواب کیا آساں اک اُسکے تصور نے
گریہ کہیں فرقت میں تھما نظر آتا تھا!

ترا عشق، راگ کے رنگ میں مرے سازِ روح میں بھر گیا
ترا حُسن، شعرِ لطیف تھا، مرا ذوق جس سے سنور گیا
تری یادِ سیر دوام ہے، کہ جو نیند بھی مجھے آ گئی---
کبھی پھول کھِل گئے خواب میں، کبھی پھیل نورِ سحر گیا
ری قوتوں کی نمود کیا؟ جو نہیں نمود نہ وجود کیا؟
ترے آگے دل کا چراغ ہوں کہ جو زندگی ہی میں مر گیا
سے جوش و زور میں فرق کچھ نہ پڑے گا سعیِ خود آزما
خسِ ناتواں بھی اگر کبھی تری رو میں پار اُتر گیا

بر و بار و برگ درخت سے ہے طویل باغ کی داستاں
مگر عطر اس کا وہ نکتہ ہے جو بشکلِ غنچہ نِکھر گیا

یہ پیامِ دید کی چھیڑ سُن کہ وہ جلوۂ نظر آزما —
کبھی زیرِ اشک جھلک رہا، کبھی خواب بن کے گذر گیا!

مرض دروں کا سراغ ہی مری موت ہو گیا یا تھی
کہ شکنجِ سینہ اک آہ تھی، وہ کھنچی تو سانس بکھر گیا!

ہے جھوٹے وعدوں پہ بھی اُن میں دلکشی اتنی — وہ کہہ کے وعدہ کریں گر وفا تو کیونکر ہو
یہ مانا آئے ہیں چارہ گراں بھلے دم — نہ مانے عاشقِ درد آشنا تو کیونکر ہو
وہاں کے وعدہ پہ ہر وقت مست رہتا ہوں — شراب ہو جو یہاں بھی روا تو کیونکر ہو
جہاں ہو نغمۂ مرغِ چمن جنوں انگیز — جو بولے شاعرِ شیریں نوا تو کیونکر ہو
اسیرِ دامِ محبت کے دل میں صبر و قرار — لگا ہو پہلو میں تیرِ بلا تو کیونکر ہو
عتاب اِتنا ہے پاسِ ادب کی صورت میں — تمھیں کہو کہ کروں کچھ خطا تو کیونکر ہو
مرے خیال کی بے اعتدالیاں دیکھو — سُنے وہ موجدِ رسمِ جفا تو کیونکر ہو

([illegible])

اُنکو سمجھاتے ہوئے آتے ہیں جو سمجھانے کو — کون دیوانہ کہے گا ترے دیوانے کو
بدگماں رشک نے ایسا کیا دیوانے کو — شمع کے گرد نہ پھرنے دیا پروانے کو
وہ نشے میں وہ اُڑے ہوش وہ ساغر کھنکے — وہ صراحی گری لیتی ہوئی پیمانے کو
گرمیِ حسنِ رُخِ دوست الٰہی توبہ — جلوۂ شمع سے انکار ہے پروانے کو
رخصت اے حسرتِ مرگ آج یہ جھگڑا بھی چکا — زندگی اہلِ نظر کہتے ہیں مر جانے کو
تیرا احساں ہوا اے برق پشیماں کیوں ہے — پوچھتا کون تھا اُجڑے ہوئے کاشانے کو
میں سمجھتا تھا کہ اب قدر کرے گا دل کی — اُس نے ٹھکرا دیا ٹوٹے ہوئے پیمانے کو
چونک اُٹھتا ہے ترا نام جو سُن لیتا ہے — ہوش اتنا ہے ابھی تک ترے دیوانے کو
نام کے ساتھ بدلتی ہے کہیں نوعیت — جس کا جی چاہے وہ کعبہ کہے بتخانے کو
حشر کے روز بھی یہ کہہ کے مجھے ٹال دیا — کبھی فرصت میں سُنیں گے ترے افسانے کو
آج ہر قطرۂ مے خون کی بو دیتا ہے — دل دھڑکتا ہے اُٹھاتے ہوئے پیمانے کو
ایسا اُجڑا ہوا اگر ہوگا اثر کیا [illegible] — [illegible]

دوسرا انعامی مقابلہ

الناظر کے جملہ قلمی معاونین کو خاص طور پر اور ملک کے دیگر اہل قلم حضرات کو عام طور پر دعوت دی جاتی ہے کہ حسب شرائطِ ذیل اس مضمون پر خامہ فرسائی کریں :-

عنوان

نذیر احمد۔ حکیم محمد علیخاں۔ سرشار۔ شرر اور مرزا رسوا کے افسانوں کا مقابلہ کرکے بتائیے کہ ان میں بہترین ناول نویس کون ہے اور آپ انکے کس ناول کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

شرائطِ مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم سے کم ۳۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے۔

(۲) ۱۵- نومبر تک دفتر الناظر میں وصول ہو جائے۔

(۳) اصحاب ذیل مضامین مقابلہ کی جانچ کریں گے :-

۱- جناب مولوی سید محفوظ علی بی اے رئیس بدایوں

۲- جناب مولوی عبد الماجد بی اے، دریاباد ضلع بارہ بنکی

۳- جناب مولوی سید ہاشمی فرید آبادی رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

۴- جناب منشی امیر احمد علوی بی اے جوڈیشل افسر سہیج

۵- جناب مرزا محمد عسکری بی اے سکرٹری انجمن اردو لکھنؤ

(۴) دو انعامات دیے جائیں گے :-

اول - پچاس روپیہ کی تھیلی اور پچاس جلدیں مضمون کی بعد طبع

دوم - پچیس روپیہ کی تھیلی اور پچیس جلدیں مضمون کی بعد طبع

(۵) دونوں انعامی مضامین کی طبع واشاعت کے جملہ حقوق بحق الناظر محفوظ ہوں گے۔

(۶) اقیہ مضمون بھی جبتک مجموعۂ مضامین شائع نہ ہوجائے کہیں شائع نہ ہو سکیں گے۔ اور مجموعہ کی اشاعت کا حق صرف دفتر الناظر کو حاصل رہیگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

(از مترجم)

رسالہ "استبداد" کا ترجمہ ناظرین کے سامنے ہے۔ یہ ایک شہرۂ آفاق اطالین اہل قلم Count Vittori Albieri کی تصنیف ہے جو انقلاب فرانس سے کچھ پہلے Della Urmonide کے نام سے عالمِ وجود میں آئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت جلد اکثر یورپین زبانوں میں منتقل ہوگئی۔ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ جنرل .... نے کیا۔ اور یہی ترجمہ عربی ترجمہ کی اصل ہے جسے مرحوم شیخ عبدالرحمٰن کواکبی نے "طبائع الاستبداد ومصارع الاستعباد" کے نام سے عہد حمیدی میں شایع کیا اور نہایت پسند کیا گیا۔ اسی عربی ترجمہ سے ہم نے یہ اُردو ترجمہ طیار کیا ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عربی مترجم نے اول تو یہ کتاب اُسکے حقیقی مصنف کے بجائے خود اپنی جانب منسوب کرلی۔ پھر اُسکے مطالب میں ایسا تصرف کیا جو مصنف کے منشا اور اسپرٹ کے بالکل خلاف تھا۔ جسکی وجہ سے کتاب میں جابجا مطالب بے ربط بلکہ متناقض ہوگئے۔ ہم نے اپنے ترجمہ میں کوشش کی ہے کہ حشو و زوائد اور بے ربط مطالب نکال دیں۔ کہیں کہیں سلسلۂ کلام قائم رکھنے کے لیے کچھ اضافہ بھی کیا ہے جو ہمارے خیال میں مصنف کے خیالات کے مطابق ہے۔

اس رسالہ کو ہم اُسکی حیثیت سے زیادہ اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ ہمارے خیال میں یہ عام پبلک کے لیے لکھا گیا ہے، اِسی لیے اسکا اسلوب فلسفیانہ ہونے کے بجائے خطیبانہ ہے جو عوام کے لیے نہایت موزوں اور مفید ہے۔ کسی کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوسکتی ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ لکھی گئی ہے اُسے پوری طرح انجام دیدے۔ یہ رسالہ اس لیے لکھا گیا ہے کہ پبلک کو سیاسی استبداد سے آگاہ اور متنفر کیا جائے۔ ہمارے خیال میں اُس نے یہ غرض بخوبی پوری کردی ہے۔ اسے سرسری نظر سے پڑھنے والا بھی اُس شدید غیظ و غضب اور نفرت و عداوت سے اپنے تئیں باز نہیں رکھ سکتا جو مصنف نے سیاسی استبداد کے خلاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھردی ہے۔ یہی اسکی سب سے

بڑی خوبی ہے اور اسی لیے ہم نے اُسے اپنے ترجمہ کے لیے منتخب کیا ہے۔

ہندوستان کی تمام پبلک صدیوں سے غلام اور استبداد کا شکار رہے، ظلم و جور نے اُس کے تمام عقلی و ذہنی قوٰے بُری طرح برباد کر ڈالے ہیں، آزادی و قومی غیرت کے جذبات تقریباً مُردہ ہو چکے ہیں۔ ہماری بیماری اتنی سخت ہے کہ فلسفیانہ دلائل، منطقی استدلال، حکیمانہ نصیحت کی دسترس سے باہر ہو گئی ہے۔ ہمارا جمود گرم سونا نہیں کہ سنار کی ہلکی ہلکی ضربیں اسے پھیلا سکیں، وہ سنگلاخ کی ٹھوس چٹان ہے جو ایک سخت ضرب چاہتی ہے، ایسی ضرب جو ایک ہی وار میں اسے پاش پاش کر ڈالے۔ اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی مردِ خدا اُٹھے اور ایک ہی ضرب میں اس منحوس چٹان کو ریزہ ریزہ کر دے۔ جسکے ٹوٹتے ہی وہ تمام حیرت انگیز عملی قوتیں اُبل پڑیں گی جو تبیس کرو۔ انسانی آبادی کے اس ساکن سمندر کی تہ میں دبی پڑی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے یہ رسالہ اس طرح کی فیصلہ کُن ضرب کے لیے راستہ صاف کر دے گا۔

رسالہ میں مذہب کے متعلق ایک مستقل فصل ہے۔ نیز جا بجا اُسکا ذکر آیا ہے اور ایسے انداز میں آیا ہے کہ شاید ہمارے بعض ناظرین پہلی نظر میں متوحش ہوں۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنا دماغی توازن قائم رکھیں۔ یہ کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے کہ اُسکے دلائل ہم اپنے مذہبی دلائل و روایات پر جانچیں۔ ممکن ہے اس باب میں مصنف نے ٹھوکر کھائی ہو۔ ہمیں چاہیے اسکی غلطی سے چشم پوشی کریں، اور جو فائدہ اُس سے اُٹھا سکتے ہیں اُٹھائیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ پوری کتاب پڑھنے کے بعد کوئی شکایت باقی نہ رہے گی۔ جس مذہب پر مصنف نے نکتہ چینی کی ہے، وہ وہ خود ساختہ مذہب ہے جس نے انسانوں کو ہدایت کے بجائے گمراہی، آزادی کی جگہ غلامی دی ہے۔ مذہبِ حق کا، مصنف مخالف نہیں بلکہ مداح ہے جیسا کہ جا بجا مذکور ہے۔

دُعا ہے یہ چھوٹی سی کتاب بڑے نتائج پیدا کرے اور اُس دماغی جمود کو متزلزل کر دے جس میں ہم بدنصیبی سے گرفتار ہیں اور جو ہماری اصلی بیماری ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ہماری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

مقدمہ

علم سیاست ایک نہایت وسیع اور ہمہ گیر علم ہے، نہ کوئی اُس کا پورا احاطہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اُس سے یکلخت کنارہ کش ہو سکتا ہے۔

تمام قدیم متمدن اقوام میں ایسے علماء گزرے ہیں جنھوں نے تاریخی، ادبی اور قانونی مصنفات میں علم سیاست پر ضمناً بحث کی ہے۔ رومانی عہد سے پہلے کسی مستقل سیاسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ بعد میں جو کچھ ہے، وہی دوسرے مباحث سے ممزوج بحثیں ہیں۔ چنانچہ "کلیلہ و دمنہ"[1] اور "رسائل گوری گیرس"[2] کی طرح اخلاقی سیاسی کتابیں ہیں، یا "نہج البلاغہ"[3] اور "کتاب الخراج"[4] کی طرح مذہبی سیاسی تصنیفیں ہیں۔ خالص سیاسی کتابوں کا اب تک پتہ نہیں چلا۔

قرون وسطیٰ میں بجز علمائے اسلام کے اِس فن پر اور کسی کی تصانیف موجود نہیں، لیکن اُنھوں نے بھی مستقل کتابیں نہیں لکھیں۔ چنانچہ رازی، غزالی، طوسی اور علائی وغیرہ علمائے عجم نے سیاست کو اخلاق کے ساتھ ممزوج کر دیا ہے۔ ابو العلاء المعری اور ابو الطیب متنبی وغیرہ حکمائے عرب نے ادب سے آمیزش کی ہے، اور ابن خلدون و ابن بطوطہ وغیرہ علمائے مغرب اقصیٰ نے تاریخ سے ملا دیا ہے۔

لیکن یورپ کے متاخرین علمائے سیاست نے اِس علم پر پوری توجہ مبذول کی ہے اور اسے متعدد مباحث: سیاست عمومی، سیاستِ خارجی، سیاست داخلی، سیاست انتظامی، سیاست اقتصادی، سیاستِ قانونی وغیرہ پر تقسیم کر دیا ہے۔ ہر بحث پر مفصل بحثیں کی ہیں اور ہر بحث کو متعدد ابواب و فصول پر تقسیم کر کے ایک نہایت مبسوط و منضبط علم بنا دیا ہے۔

⁂

علم سیاست میں "استبداد" کی بحث کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ "سیاست"

---

[1] سنسکرت کی کتاب ہے۔ بہت مشہور ہے۔ ابن المقفع نے آخری عہد بنی اُمیہ میں عربی میں ترجمہ کی اور اس سے دنیا بھر کی زبانوں میں منتقل ہوئی۔

[2] روم کا ایک پوپ ہے۔

[3] حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ سید مرتضیٰ نے اس میں امیر المومنین کے ملفوظات، خطبے اور تحریریں جمع کی ہیں۔

[4] قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے۔

سے بالکل متضاد چیز ہے۔ چنانچہ سیاست کی تعریف ہے: "عام معاملات کو عقل و دانائی سے انجام دینا" اور استبداد کی تعریف ہے: "عام معاملات کو عقل و دانائی کے بجائے ہوا و ہوس اور خود غرضی سے انجام دینا"

بنا بریں سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اس بحث پر جس قدر بھی غور کریں کم ہے۔ کیونکہ استبداد ہی وہ بلا ہے جس نے بڑے بڑے آباد ملک برباد اور عظیم الشان سلطنتیں پارہ پارہ کر ڈالی ہیں۔

اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے: استبداد کیا چیز ہے؟ اُسکے اسباب و عوارض کیا ہیں؟ اُسکی تشخیص کا کیا طریقہ ہے؟ اسکی رفتار کیا ہوتی ہے؟ اُسکے نقصانات کیا ہیں؟ اسکا علاج کیا ہے؟

ظاہر ہے ان میں سے ہر بحث بجائے خود اس قدر اہم ہے کہ پوری وضاحت سے گفتگو کی محتاج ہے اور بعض بحثیں تو صاف ہو ہی نہیں سکتیں جب تک طویل سفر اور بے شمار تجارب حاصل نہ کیے جائیں

اِن مباحث کی اہمیت کا اندازہ اُن اصولی تفصیلات سے ہو سکتا ہے جو آگے چل کر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً استبداد کی خاصیت کیا ہے؟ مستبدوں پر خوف و دہشت کا غلبہ کیوں رہتا ہے؟ مستبد حکومتوں کی رعایا بزدل کیوں ہوتی ہے؟ استبداد کا اثر مذہب پر، علم پر، عزت پر، دولت پر، اخلاق پر، ترقی پر، اور عام تربیت پر کیا ہوتا ہے؟ مستبدوں کے مددگار کون لوگ ہوتے ہیں؟ کیا استبداد برداشت کیا جا سکتا ہے؟ استبداد سے نجات کیونکر حاصل کی جا سکتی ہے؟ استبداد کو کس چیز سے بدلنا چاہیے؟

بحث شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنے والوں کے نتائجِ بحث و نظر بالاختصار پیش کر دیے جائیں، جو نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں مگر مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔ چنانچہ مادہ پرست اپنی بولی میں کہتا ہے "طاقت، بیماری ہے، مقاومت، دوا ہے" سیاسی کا مقولہ ہے "غلامی، بیماری ہے، آزادی، دوا ہے" فلسفی کہتا ہے "ظلم کی قدرت بیماری ہے، انصاف حاصل کرنے کی طاقت دوا ہے" قانون داں کہتا ہے "قانون پر طاقت کا غلبہ بیماری ہے، اور قانون کی طاقت پر فتح، دوا ہے" ربانی کہتا ہے "جبروتِ الٰہی میں شرک بیماری ہے، اور توحیدِ الٰہی دوا ہے"

یہ اہل علم کی تعبیریں ہیں، لیکن اہلِ دل اور من چلے یہی معانی یوں ادا کرتے ہیں: خوددار کہتا ہے "طوقِ غلامی کے لیے گردن جھکا دینا بیماری ہے، اور آزادانہ سر بلند کر دینا دوا ہے"۔ بلند ہمت کہتا ہے "مخلوق پر دست درازی بیماری ہے اور متکبّروں کی تذلیل دوا ہے"۔ بہادر کہتا ہے "بے لگام حکام کا وجود بیماری ہے، اور انھیں بھاری زنجیروں سے جکڑنا دوا ہے"۔ اور فدائی تو بس یہی نعرہ لگاتا ہے "زندگی کی محبت بیماری ہے، اور موت کا عشق سب سے بڑی دوا ہے"۔
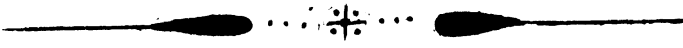
استبداد کیا چیز ہے؟

سیاسیات میں استبداد کے معنی یہ ہیں کہ فردِ واحد یا چند افراد، عام معاملات کو بلا خوفِ ذمہ داری و جوابدہی انجام دیں۔

مستبد حکومت وہ حکومت ہے جو رعایا کے معاملات میں جوابدہی سے بے خوف ہو کر خود مختارانہ تصرف کرتی ہے۔

استبداد کا وقوع اس طرح ہوتا ہے کہ حکومت یا تو مطلقاً کسی قانون، ضابطہ اور علم رائے کی پابند نہیں ہوتی، جیسا کہ آجکل کی تمام شخصی حکومتیں ہیں، یا ایک حد تک پابند تو ہوتی ہے مگر اختیار رکھتی ہے کہ جب چاہے یہ پابندی دُور کر دے، جیسا کہ موجودہ زمانہ کی اکثر نام نہاد دستوری (پارلیمنٹری) حکومتیں ہیں۔

مستبد حکومتیں مختلف بھیسوں میں موجود ہوتی ہیں، جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جس طرح مطلق العنان بادشاہوں کی شخصی حکومتیں مستبد ہوتی ہیں، اُسی طرح اُن خاندانی یا منتخب بادشاہوں کی حکومتیں بھی مستبد ہوتی ہیں جنکے ہاں پارلیمنٹ تو موجود ہے مگر خود جوابدہی سے آزاد ہیں۔ اسی طرح وہ حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جو نمائندہ یا غیر نمائندہ جماعتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، کیونکہ مشورہ و رائے میں متعدد افراد کی شرکت سے استبداد کا زوال ضروری نہیں، بلکہ کبھی کبھی اس قسم کی حکومتیں شخصی حکومتوں سے بھی زیادہ جابر اور مضر ہو جاتی ہیں۔ نیز وہ حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جن میں تنفیذی اور قانونی قوتیں الگ الگ ہاتھوں میں ہوتی ہیں، کیونکہ یہ علیحدگی اُسی وقت استبداد کے لیے روک ہو سکتی ہے جب تنفیذی جماعت، قانونی جماعت کے سامنے جوابدہ ہو اور پھر یہ قانونی جماعت، قوم کے آگے جوابدہ ہو۔ مگر قوم بھی ایسی ہونی چاہیے جو جانتی ہو کہ اپنی حکومت کی نگرانی اور اُس سے جواب طلبی کیونکر کرے۔

غرضکہ حکومت کسی شکل کی بھی ہو، استبداد سے مبرّا نہیں ہو سکتی، جب تک قوم کے شدید مراقبہ اور سخت گیر محاسبہ کے ماتحت نہ ہو، کیونکہ عادل سے عادل حکومت بھی جب قوم کی غفلت یا اور کسی وجہ سے ذمہ داری کے شکنجہ سے آزاد ہو جاتی ہے تو فوراً استبداد پر تُل جاتی ہے اور کبھی اس سے باز نہیں آتی، خصوصاً جب اُسکے ہاتھ دو عظیم الشان طاقتوں: قوم کی جہالت اور فوج

کی کثرت سے مضبوط ہوں! البتہ بدوی حکومتیں جنگی کُل یا اکثر رعایا خانہ بدوش قبائل ہوتے ہیں شاذونادر ہی مستبد ہوتی ہیں، اور یہ اس لیے کہ رعایا جوں ہی محسوس کرتی ہے کہ حکومت اُسکی آزادی پر دست درازی کر رہی ہے اور وہ اسکی مقاومت کی قدرت نہیں رکھتی تو فوراً کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہے۔ عربوں کی مثال آنکھوں کے سامنے ہے جو عہد تبع وحمیر وغسان کے بھی پہلے سے اب تک استبداد سے ناآشنا ہیں، کسی کو اُنپر ظلم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور یہ اس لیے کہ اُنھوں نے اُسے کبھی قبول نہیں کیا۔

حکماء متاخرین نے استبداد کی تشریح اور اُسکے علاج کی تشخیص ایسی دل نشین عبارتوں میں کی ہے کہ انسانی شقاوت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ بعض عبارتیں حسب ذیل ہیں:-

"مستبد حاکم عام معاملات میں پبلک کی مرضی سے نہیں، بلکہ اپنی خواہش سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ رعایا پر خود اُسکے بنائے ہوئے قانون سے حکومت نہیں کرتا، بلکہ اپنی ہوا و ہوس کے مطابق اُسے جدھر چاہتا ہے چلاتا ہے۔ مستبد خوب جانتا ہے کہ وہ ظالم و غاصب ہے۔ اسلیے کروروں انسانوں کے مُنہ پر اپنی ایڑی رکھ دیتا ہے کہ بند رہیں اور حق و صداقت اور شکوہ و شکایت کی کوئی صدا بھی بلند نہ ہونے پائے۔"

"مستبد حاکم، حق کا دشمن، آزادی کا بیری، اور بیک وقت دونوں کا قاتل ہوتا ہے۔ حق، نوع انسانی کا باپ اور آزادی اُسکی ماں ہے، عوام، کشتگان استبداد اُسکے یتیم اور لاوارث بچے ہیں جو کچھ شعور نہیں رکھتے اور معصومیت و غفلت کے گہوارے میں پڑے سو رہے ہیں۔ علماء و حکماء، اِنکے جوان اور سمجھدار بھائی ہیں، اگر وہ اِن معصوموں کو جگائیں گے تو وہ جاگ جائیں گے، اگر بلائیں گے تو دوڑ آئیں گے۔"

"مستبد حاکم اس لیے ظلم کرتا ہے کہ اُسکے سامنے کوئی روک نہیں ہوتی، لیکن جب وہ مظلوم کی کمر میں بھی خنجر بُرّاں دیکھ لیتا ہے تو پھر ظلم کی جرأت نہیں کرتا۔"

"مستبد حاکم بھی ایک انسان ہوتا ہے اور خیر و شر قبول کرنے کی باقی تمام انسانوں کی طرح صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن ظلم و استبداد پر اس لیے فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اسکا موقعہ پاتا ہے۔ پس یہ رعایا کا فرض ہے کہ اپنا نفع نقصان خود سمجھے اور مستبد سے صاف صاف کہدے:

"اپنی شرارت، اپنے ہی تک رکھو، مجھے اسکی ضرورت نہیں" صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بھی کہنا چاہیے کیونکہ جو قول، عمل سے خالی ہے، گو نِشتر ہے۔ اگر عمل نہیں توکم سے کم اُسکی طیاری ہی ہو جو بجائے خود ایک بڑا عمل اور استبداد روکنے کے لیے کافی ہے۔"

"مستبد حاکم بھی ایک انسان ہوتا ہے، اور جس طرح عموماً انسان جانوروں میں گائے اور کُتے سے بہت مانوس ہوتا ہے، اسی طرح مستبد کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اُسکی رعایا گائے کی طرح غریب، مطیع اور دودھ دینے والی ہو اور کتوں کی طرح ذلیل، چھچھوری اور خوشامدی رہے! یہ مستبد کی خواہش ہے۔ لیکن رعایا کو کیسا ہونا چاہیے؟ اصیل گھوڑے کی طرح خوددار اور شریف طبیعت کہ جسکی اگر خدمت کی جاتی ہے، سواری دیتا ہے، اگر توہین کی جاتی ہے تو سوار کو پیٹھ پر سے اُتار پھینکتا ہے۔ رعایا کو خوب غور کرنا چاہیے کہ وہ آیا حاکم کی غلامی کے لیے بنائی گئی ہے یا حاکم اُسکی چاکری کے لیے مقرر ہوا تھا مگر اب آقا بن بیٹھا ہے؟ عقلمند رعایا وہی ہے جو استبداد کے اس منہ زور گھوڑے (مستبد) کے منہ میں خاردار لگام لگائے، اپنی مٹھیوں میں مضبوطی سے تھامے رہتی ہے، اگر وہ اس پر بھی منہ زوری کرتا ہے تو لگام اور زیادہ تان لیتی ہے، اگر اسپر بھی باز نہیں آتا تو پا بجولاں کرکے ڈالدیتی ہے!"

اس بیان سے اجمالاً معلوم ہوا ہوگا کہ استبداد کیا چیز ہے۔ آئندہ مباحث میں تفصیل ملے گی۔

استبداد اور مذہب

اکثر مغربی علمائے سیاست کی یہ رائے ہے کہ سیاسی استبداد مذہبی استبداد سے پیدا ہوا ہے، بعض اعتدال پسند گو اتنا نہیں کہتے مگر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دونوں استبداد اگر باہم باپ بیٹے نہیں تو بھائی بھائی ضرور ہیں، اُنکے مابین یہ قوی رشتہ موجود ہے کہ دونوں انسان کی خواری و غلامی میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں تاکہ ایک کی حکومت جسم پر قائم رہے اور دوسرے کی روح پر۔

وہ کہتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات اور آسمانی کتابیں، انسان کو ایک ایسی عظیم الشان نامعلوم طاقت سے ڈراتی ہیں جسکی حقیقت کا علم دائرۂ عقل و ادراک سے باہر ہے۔ وہ انسان کو اِس دنیا میں بھی سخت ترین مصائب و آلام کی دھمکیاں دیتی ہیں اور موت کے بعد بھی عذاب الیم اور

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب
- نشانے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- مینائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- [illegible] دلکش
- [illegible] نگارین
- رسالۂ تذکیر و تانیث ۸ر
- افادۂ تاریخ ۸ر
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش مرحوم

- فسانۂ نادر جہاں
- پیاری سہیلی ۱۲ر
- [illegible] سحر ۸ر
- [illegible] ۱۲ر

منشی افضل حسین ثابت

- حیات دبیر
- [illegible] حسینی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن ۶ر
- کرم دھم ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- سیر تاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

پریم چند

- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولانا عبد الحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- [illegible] ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- عزیزہ مصر
- جویای حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- فسانۂ [illegible] و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر جبال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- مینا بازار (ریختہ ناول)

حکیم محمد علی خان مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرو کامل
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۸ر
- عالم خیال ۸ر
- گنجینہ
- [illegible]

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- زباندانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶
- قواعد میر ۶
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب ۸
- " دوسری ۸ر
- " تیسری ۸ر
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

- مجموعۂ گلگشت
- جام زہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " جلد دوم
- " جلد سوم
- " جلد چہارم
- " جلد پنجم
- " جلد ششم
- " جلد ہفتم
- " جلد ہشتم
- " جلد نہم
- " جلد دہم
- " جلد یازدہم
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- تاریخ عرب
- تمدن اسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- ارمانوسہ

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمای سلف
- تذکرۃ الشعراء [illegible]

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- ترجمہ نفح الطیب
- تاریخ الاندلس ۳ جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی

مولوی محمد نثار اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق و آذربائجان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخی آثار [illegible] مغرب الاقصیٰ

منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امراؤ مسعود

ملنے کا پتہ ـ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۷۴

۲

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ مع محصول

فی پرچہ ۱۲

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر :۔ اسحاق علی علوی

نمبر ۲

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ اگست ۱۹۲۵ء

جلد ۲۹ — نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمبر ۱۷ جلد ۲۹ —— اگست سنہ ۱۹۲۵ء

تذکرۂ مولانا جلال الدین رومی

فیہ ما فیہ یعنی ملفوظات حضرت مولانائے رومؒ کو مجیبی عبدالماجد صاحب پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ کر رہے ہیں - یہ مضمون اُسکے شروع کے مقدمہ کا ایک جزو ہے - وہ حصہ جسمیں اصل کتاب پر تبصرہ ہے، ہنوز مکمل نہیں ہوا ہے - اُمید ہے کہ یہ کتاب اسی سال شایع ہو سکے گی - ناظرین کرام میں سے جن اصحاب کو تصوف اور صوفیاے کرام سے دلچسپی ہے وہ یقیناً اسے نعمتِ غیر مترقبہ تصور فرمائیں گے - ایڈیٹر

نام | اسمِ مبارک محمدؒ، لقب جلال الدین، تخلص رومی تھا - عرفِ عام نے مولاناے روم اور مولوی رومی کہکر پکارا -

ولادت و وفات | ۶ - ربیع الاول سنہ ۶۰۴ہجری مطابق ۳۰ - ستمبر سنہ ۱۲۰۷ء کو بمقام بلخ عالمِ آب و گِل میں قدم رکھا - ۶۸ سال قمری یا ۶۶ سال شمسی کی عمر میں ۵ - جمادی الثانی سنہ ۶۷۲ ہجری مطابق ۱۶ دسمبر سنہ ۱۲۷۳ء کو بمقام قونیہ، عالمِ ارواح کی جانب مراجعت کی -

---

لہ مولاناؒ کے حالات و سوانح کا سب سے بہتر و مستند ماخذ، رسالہ سپہ سالار ہے، جسکے مولف فریدون سپہ سالار چالیس سال تک مولانا کی خدمت میں رہے - اسکے بعد شمس الدین افلاکی کی کتاب مناقب العارفین ہے (دیکھیے صفحہ ۲)

نسب

سلسلۂ نسب، نَو واسطوں سے، حضرت صدیقؓ تک پہونچتا ہے۔ جوہرِ صدیقیت کے آثار اکثر اسلاف میں نمودار رہے، چنانچہ مولانا کے جدِ امجد حسین بن احمد اپنے زمانہ کے ایک نامور صوفی و صاحبِ حال بزرگ تھے۔ نانہالی سلسلہ سلطان ابراہیم ادہم سے ملتا ہے۔

والد ماجد

مولانا کے والد سلطان بہاء الدین ولدؒ، علم وفضل، زہد وتقوے، فقر وطریقت میں یگانۂ روزگار تھے۔

"در علوم ماہر بود وصاحب حال، در عہد سلطان محمدؒ خوارزم شاہ مثل او در فتوے دراں عصر کسے نبود" (فیہ ما فیہ)

فتاوائے علمی و مذہبی دُور دُور سے اُنکے پاس آتے تھے، اور اُنکی ذات شیخ وقت کی حیثیت سے مرجعِ خلایق بنی ہوئی تھی۔

"پادشاہے بود کامل صاحب کشف، و در ہمہ علوم ظاہر و باطن بے نظیر ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ پسندیدہ و مقبول و محبوب ہمہ دلہا بود۔ و ورع و تقوی بہ غایت وریاضت بسیار و مجاہدات بیشمار رواشت و بر ہمہ دلہا مشرف بود و در محروسۂ بلخ متمکن واز اقصائے خراسان فتاوائے مشکل بحضرت او آوردندے" (سپہ سالار)

مرتبۂ کمال و برگزیدگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک شب کو بلخ کے تین سو مشاہیر علماء نے یہ خواب دیکھا کہ سرورِ کائنات صلعم ایک سبز خیمہ میں جلوہ افروز ہیں، ایک پہلو میں سلطان ولدؒ حاضر ہیں، اور الطاف وعنایاتِ خاص کے مورد ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ زبان مبارک سے یہ ارشاد ہوا کہ "ہم نے بہاء الدین کو سلطان العلماء کا لقب عطا کیا" صبح ہوئی تو ہر عالم "سلطان العلماء" کی خدمت میں اپنا اپنا خواب عرض کرنے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا، کہ "خیر،

(بقیہ حاشیۂ گذشتہ) جو رطب و یابس ہر قسم کی روایات کا مجموعہ ہے۔ خود رسالہ فیہ ما فیہ کے ہندوستانی نسخوں میں جو مقدمہ ہے، وہ بھی اس لحاظ سے مفید و پُر معلومات ہے۔ مولانا چونکہ کم ازکم تین ممتاز حیثیات علم، فقر، و شعر کے جامع تھے، اسلیے علماء، صوفیہ، و شعراء کے جو جو تذکرے لکھے گئے ہیں اُن سب میں مولانا کے حالات درج ہیں۔ مولف اوراق کے پیش نظر علی الترتیب یہ تین تذکرے ہیں: جواہر المضیہ (عبد القادر قرشی) نفحات الانس (جامی) اور تذکرۃ الشعرا دولتشاہ سمرقندی۔ اُردو میں اس موضوع پر بہترین تالیف شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کی سوانح مولانائے روم ہے۔ انگریزی میں نکلسن نے جو کچھ اپنے انتخاب دیوان شمس تبریز کے مقدمہ میں لکھا ہے اگرچہ مختصر ہے لیکن قابل مطالعہ ہے۔ رڈہاؤس نے انگریزی ترجمۂ مثنوی دفتر اول کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ افلاکی سے ماخوذ ہے۔

اب پیغمبرِ خدا کی زبان سے سُن لینے کے بعد تم لوگوں کو یقین تو آیا۔" اور اُسوقت سے آپ کا یہی لقب مشہور ہوگیا۔

ترکِ وطن فرماں رواے بلخ محمد خوارزم شاہ عزیز بھی تھا، اور معتقد بھی۔ رفتہ رفتہ حسب روایتِ سپہ سالار، امام رازی کے اغواء سے برگشتہ ہوتا گیا۔

"در اکثر مجالس سلطان سید جلال الدین خوارزم شاہ با اُستادش فخرالدین رازی حاضر بودے مولانا در اثنائے موعظہ مذمت مذہب حکماء یونان فرمودے، و گفتے کہ جمعے کہ کتب آسمانی را در پس پشت انداختہ و تاویل فلاسفہ را در پیش انداختہ اند، چگونہ امید نجات داشتہ باشند امام را ازیں سخن حسد باعث می آمدہ ودائمی خواست کہ نزد سلطان کلمۂ گوید کہ اعتقادِ اور افاسد گرداند۔" الخ

یہ کشیدگی یہاں تک بڑھی، کہ بالآخر شیخ نے آزردہ ہوکر ترکِ وطن کی ٹھان لی، اور ۶۱۰ھ میں ایک روز اہل و عیال اور ایک جماعت تلامذہ و معتقدین کو لیکر چل کھڑے ہوے۔ اُنکے روانہ ہوتے ہی بلخ پر تاتاریوں کا حملہ ہوا اور اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ مولانا نے سن رشد پر پہونچکر اس تباہی کو شیخ کی دلآزاری کا نتیجہ بیان کیا۔ (مناقب)

سکونت قونیہ نیشاپور، بغداد، مکہ معظمہ، دمشق وغیرہ کی سیاحت، اور حج سے فراغت کرنے کے بعد یہ قافلہ قونیہ پہونچا، اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں خاندانِ سلجوق کے تاجدار، علاء الدین کیقباد کی حکومت تھی، اس نے بڑھ کر شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، عزت و احترام کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت سپرد کی، اور خود بھی اکثر حاضرِ خدمت ہوتا رہا۔

"چوں بصحرائے قونیہ رسیدند، سلطان اسلام باجمیع ارکان دولت پذیرندہ شدند و توقیر و احتشامِ تمام بشہر آوردند۔ چوں بدر وثاق رسیدند سلطان پیادہ شد و چند گام در رکابش پیادہ رفت۔ چندانکہ مبالغہ فرمودند، سلطان در تواضع بیشتر می کوشید" الخ (سپہ سالار)

شیخ فریدالدین عطارؒ کی نظرِ عنایت ترکِ وطن کے بعد، جب قافلہ نیشاپور پہونچا ہے، تو شیخ فریدالدین عطارؒ شیخ سے ملنے کےلیے آئے۔ مولانا جلال الدین کا زمانہ طفولیت تھا، لیکن جوہر شناس نے اُسی وقت جوہر کو پرکھ لیا۔ اپنی کتاب اسرارنامہ عنایت کی، اور ارشاد فرمایا، کہ "عنقریب یہ لڑکا دل جلوں کے گروہ میں آگ لگا کر رہے گا۔"

ھ یہ روایت، سپہ سالار، فیہ ما فیہ، مناقب سب میں اختلاف جزئیات کے ساتھ منقول ہے۔

"در اثنائے آں سفر بہ نیشاپور رسید۔ شیخ فریدالدین عطار بدیدن مولانا بہاء الدین آمد، و در آں وقت مولانا جلال الدین کودک بود۔ شیخ عطار کتاب اسرارنامہ را بہدیہ بہ مولانا جلال الدین داد و بہ مولانا بہاء الدین رالگفت زود باشد کہ ایں پسر آتش در سوختگان عالم بزند"

(تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، ذکر مولانا رومی)

ازدواج اسی سفر کے دوران میں ۶۲۳ھ ہجری میں، عمر کے اُنیسویں سال میں مولانا کا عقد لالائے سمرقند شرف الدین کی صاحبزادی جوہر خاتون کے ساتھ ہوا۔ اور اُسی سال اُن کے بطن سے فرزند رشید سلطان ولد کی ولادت ہوئی۔ ان خاتون کے مزید حالات سے ارباب تذکرہ خاموش ہیں۔ اِنکی وفات کے بعد مولانا نے دوسرا عقد کرا خاتون قونوی سے کیا، جن کا ذکر تذکروں میں بار بار آتا ہے۔

تحصیل علوم ظاہری مولانا نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور اُسکے بعد برہان الدین محقق ترمذی سے جو اپنے وقت کے ایک بڑے ہمہ داں فاضل تھے۔ تحصیل علم کے شوق میں اُسوقت کے بڑے بڑے مشہور علمی مرکزوں حلب، دمشق، وغیرہ کی خاک چھانی، اور ہر جگہ کے باکمال اساتذۂ فن سے استفادہ کیا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں یہ مرتبۂ استناد حاصل ہوگیا تھا، کہ لغت، ادب، فقہ، معقولات، حدیث و تفسیر کے وہ نازک و دقیق مسائل جو کسی سے حل نہ ہوتے اِنھیں کے پاس لائے جاتے، اور انکے جوابات سے سب کی تشفی ہوجاتی۔

"در علوم رسمی چوں اقسام لغت و عربیت و فقہ و حدیث و تفاسیر و معقولات و منقولات بہ غایتے رسیدہ بود کہ دراں عصر سرآمدہ ہمہ علماء دہر شدہ بود، و در ہمہ فنون اجازات عالی فرمودہ، و در عنفوانِ جوانی بہ محروسہ حلب در چند مدرسہ بافادت و استفادت از خدمت مولانا کمال الدین بن عدیم کہ در اصناف علوم بشہرت در عالم نظیر نہ داشت مشغول بودند و ہر مسئلہ کہ اقران آں عہد را مشکل افتادے بہ حضرتش عرضہ داشتندے، چنداں جہد در تحقیق آں فرمودے کہ مسائل را از ذوق آں مغز در استخوان حل می شد" الخ (سپہ سالار)

علمائے حنفیہ کے سب سے معتبر تذکرہ میں ہے:۔

"کان عالمًا بالمذہب واسع الفقہ عالمًا بالخلاف و انواع العلوم۔ ثم العلامۃ قطب الدین شیرازی و تبرک بصحبتہ" (جواہر المضیئہ)

درس وافتاء

۶۲۸ھ میں، ۲۴ سال کے سن میں، اپنے والد کی وفات پر، سلطان وقت و دیگر مشاہیر کے اصرار سے مولانا مسند درس وافتاء پر جلوہ افروز ہوئے۔ علم و فضل، تبحر و کمال کی شہرت دور دراز مقامات سے طلبہ کو کھینچ لائی۔ چنانچہ مناقب العارفین کی روایت کے مطابق، چار سو طلبہ کا ہجوم ہر وقت رہتا تھا۔ مثنوی میں جس کثرت سے آیات قرآنی واحادیث نبوی کی تلمیحات، اور مختلف مسائل فلسفہ کا ذکر آتا ہے، وہ بجائے خود اس امر کی دلیل ہے، کہ صاحب مثنوی کا پیمانۂ دماغ، منقولات و معقولات ہر قسم کے علوم و معارف کا گنجینہ تھا۔ لیکن علوم ظاہری کا یہ تبحر، سوزِ قلب کی تسکین کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔

تجلیاتِ باطنی کا ظہور

ارباب تذکرہ متفق ہیں، کہ تجلیاتِ باطنی کا ظہور بچپن ہی سے ہونے لگا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ کہ تین تین چار چار دن تک کچھ نہ کھاتے پیتے۔ ایک مرتبہ چھ برس کے سن میں، جمعہ کے دن، چھت پر ہمسن بچوں کے ساتھ سیر کر رہے تھے۔ لڑکوں میں باہم یہ صلاح ٹھہری، کہ ایک چھت سے دوسری چھت پر جست کریں۔ مولانا نے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ "یہ تو کتے بلی وغیرہ سبھی جانور کر لیتے ہیں، اگر کچھ قوت ہو تو آؤ ملکوتِ آسمانی کی سیر کریں"۔ یہ کہتے ہی سب کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ ساتھ کے لڑکے سہم گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ "سبز پوشوں کی ایک جماعت مجھے اڑا کر آسمانوں پر لے گئی، اور عجائبات آسمانی کی سیاحت کرائی"۔ اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات خرقِ عادت کے، منقول ہیں۔

"بر قدمت مولانا از پنج سالگی باز صور روحانی واشکال غیبی یعنی سفرۂ ملائکہ و بردۂ جن و خواص انس کہ مستوران قباب عزت اند ظاہر می شدہ اند و متمثل می گشتہ" (نفحات الانس۔ ذکر مولانا روم)

"حضرت مولانا در سن پنج سالگی اکثر اوقات از جائے خود می جست و مضطرب می شد، تا مدتے کہ مریدان بہاء الدین ولد او را در میان می گرفتند، از آنکہ صور روحانی واشکال غیبی بہ نظرش متمثل می شدند، یعنی سفرۂ ملائکہ و بردۂ جن و خواص انس کہ مستوران قباب حضرت اند" (مناقب العارفین)

بیعت و منازل سلوک

شیخ بہاء الدین ولد عارفِ کامل تھے۔ انکی تربیت و صحبت لختِ جگر کے اس جوہرِ فطری پر جلا دیتی رہی۔ انکے انتقال کے بعد انکے خلیفہ سید برہان الدین محقق ترمذی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور نو سال کی مدت تک انکے زیر ہدایت تصوف و سلوک کے مقاماتِ عالیہ طے کیے ۔

"سید برہان الدین چوں با مولانا جلال الدین صحبت داشت .... با او گفت کہ اگرچہ در علم ظاہر

جائے پدر گرفتہ اما پدرت غیر ازیں علومِ ظاہر حالات دیگر داشت و آں آمدنی ست نہ آموختنی۔ اما آں احوال از پدرِ تو بمن رسیدہ است اگر مریدِ شوی مرادیابی۔ مولانا جلال الدین برغبتِ تمام مرید شد و مدت نہ سال درخدمتِ او بود۔" (فیہ ما فیہ)

"بعد ازاں حضرت خداوندگار را بتحقیق علوم یقینی رغبت فرمودہ طریق سلوک را و آداب مشائخ تلقین کرد ..... و مدت نہ سال تمام صحبتِ فرمودند، و معارفِ سلطان العلماء را رضی اللہ عنہ ہزار نوبت بخداوندگار را عادت کردند تا آنچہ سرِ توحید و معرفت بود کماینبغی بتحقیق رسانیدہ بعمل آوردند بلکہ باضعاف آں بمقاماتے کہ مالاعین رأت منزل ساختند۔"

(سپہ سالار، ذکر سید برہان الدین)

ابتداء تعلیم سلوک میں سید موصوف نے مولانا سے ایک ہفتہ روزہ رکھنے کو کہا۔ مولانا نے کہا "یہ مدت کم ہے، پورے چالیس دن ہونے چاہییں۔" سید موصوف نے پورے چالیس دن کی خلوت کرائی، حجرہ کا دروازہ مقفل کر دیا، اور بجز پانی کے ایک لوٹے اور چند نان جویں کے سامان خورد و نوش میں سے کچھ نہ دیا۔ چالیس دن کے بعد دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ مولانا حضورِ کامل کے ساتھ مراقبہ میں مشغول ہیں، مرشد کی طرف نظر بھی نہ اُٹھائی۔ بدستور دروازہ بند کر دیا، اور پورا ایک چلہ اور گذر جانے کے بعد دوبارہ کھولا، تو دیکھا کہ مولانا نماز میں مشغول ہیں، اور آنکھوں سے اشک جاری ہیں، مرشد کی جانب اب بھی التفات نہ کیا۔ مرشد نے تیسرے چلہ کا انتظار کیا۔ اس تیسرے چلہ کے خاتمہ پر مولانا تبسم کرتے ہوئے باہر تشریف لائے، تو آنکھوں سے انوارِ جمالِ الٰہی برس رہے تھے۔ سید موصوف نے گلے لگا لیا، اور چہرہ کو بوسے دیے۔ (مناقب العارفین)

شمس تبریز سید موصوف نے ۶۳۷ھ میں وفات پائی۔ اسکے پانچ سال بعد ۶۴۲ھ میں شمس تبریز کی صحبت نصیب ہوئی، جسنے مولانا کی زندگی کا گویا رُخ ہی بدل دیا۔ شمس الدین محمد تبریزی، بابا کمال الدین جندی کے مرید اور عارف کامل تھے۔ ایک مرتبہ مناجات میں دعا کی، کہ "پروردگار کوئی تیرا بندۂ خاص ایسا ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا۔" ارشاد ہوا کہ "روم کو جاؤ۔" یہ ارشاد پاتے ہی چل کھڑے ہوئے، اور ساری اقلیم روم کا گشت لگا کر بالآخر قونیہ میں مقیم ہوئے۔ شب کا وقت تھا۔ برنج فروشوں کی سرائے میں اُترے صبح ہمہ تن اشتیاق و انتظار ہو کر دوکان کے سامنے چبوترہ پر بیٹھے۔ اُدھر مولانا کو بھی کشف سے انکے ورود کی اطلاع ہو گئی تھی۔ ملاقات کو چلے۔ راستہ میں لوگ دست بوسی کو ٹوٹے پڑتے تھے شمس کی

نگاہ پڑی، رہبر محبت نے پتہ دیا، کہ یہی وہ محبوب ہے جسکی بشارت ہوئی تھی۔ مولانا مقابل کے چبوترہ پر آکر بیٹھ گئے۔ دیر تک آنکھوں آنکھوں میں راز و نیاز ہوتے رہے۔ اسکے بعد شمس نے مولانا سے دریافت کیا کہ "حضرت بایزید بسطامی کو ایک طرف تو اتباع سنت میں یہ غلو تھا کہ زندگی بھر خربزہ اس خیال سے نہیں کھایا کہ نہیں معلوم حضور رسول خدا صلعم نے کس طرح کھایا تھا۔ دوسری طرف کبھی سبحانی ما اعظم شانی کے نعرے لگاتے، کبھی لیس فی جبتی سوی اللہ کی صدا بلند کرتے۔ درآنحالیکہ رسول خدا صلعم با ایں مرتبۂ کمال یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ ان دو متضاد کیفیات میں کیونکر تطبیق دی جا سکتی ہے؟" مولانا نے جواب دیا، کہ "بایزید اگرچہ بڑے صاحبدل بزرگ تھے، تاہم دائرۂ ولایت میں ایک مخصوص درجہ پر قائم کر دیئے گئے تھے، اور اسی کی عظمت اُن پر ظاہر تھی، اس لیے اُنکی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلجاتے تھے، بخلاف اسکے رسول خدا صلعم کے علوِ مراتب کی کوئی انتہا نہ تھی، ہر لحظہ منازل تقرب میں بلند سے بلند تر پایہ طے کرتے جاتے تھے، اسلیے آں حضرتؐ کو اپنا ہر پہلا مقام پست نظر آتا تھا، اور اس پر استغفار فرماتے رہتے تھے۔"

یہ سنتے ہی شمس اُٹھکر مولانا سے بغلگیر ہوے۔ آپس میں تعلقات ناز و نیاز بڑھے، یہاں تک کہ ایک کی ہستی دوسرے میں گم ہوگئی۔ مولانا اب تک درس و افتاء میں معروف رہتے تھے، اب یہ مشاغل چھوڑکر سماع میں منہمک ہوگئے۔ (سپہ سالار ص۲۱) مستی و سرشاری کے جذبات طاری رہنے لگے۔ تلامذہ و اعزہ سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ ہر وقت شمس کے ساتھ خلوت رہنے لگی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حجرۂ شیخ صلاح الدین میں دونوں بزرگ پورے چھ ماہ تک، بغیر خورد و نوش و دیگر ضروریات بشری کے، خلوت گزیں رہے۔

> دفعہ اول مدت شش ماہ آزاد در حجرۂ شیخ صلاح الدین زرکوب رحمۃ اللہ علیہ ہم صحبت فرمودند، چنانکہ قطعاً و اصلاً اکل و شرب و حاجات بشری درمابین نہ بود، و در سر وقت ایشاں بنیز شیخ صلاح الدین دگر کسے را مجال دخول نہ بود۔ (سپہ سالار، ذکر شمس تبریز)

مولانا اور حضرت شمس کے تعلقات باہمی آج تک ایک افسانہ بنے ہوے ہیں، اور دونوں کی ملاقات سے متعلق عجیب عجیب روایات زبان زدِ عام ہیں؂ یہاں تک کہ بعض تذکرہ نویسوں

؂ اس قسم کی متعدد دلچسپ روایات مولانا شبلی نے اپنی "سوانح مولانا ے روم" میں نقل کر دی ہیں اُنکی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

نے شمس کو مولانا کا پیر و مرشد لکھ دیا ہے، لیکن خود مولانا ہی کے ایک مقولہ سے اس تعلق باہمی کی نوعیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں، کہ "علماے ظاہر اخبار رسول کے عالم ہیں، شمس تبریزی اسرار رسول صلعم کے حامل ہیں، اور میں انوار رسول کا مظہر ہوں" (مناقب العارفین۔ فصل ۴)
اس میں شبہہ نہیں کہ مثنوی، نیز دیوان غزلیات میں مولانا نے متعدد مقامات پر حضرت شمس کا نام اس انداز سے لیا ہے، کہ گویا اپنے پیر و مرشد کا ذکر کر رہے ہیں۔ مثلاً دیوان میں :-

پیر من و مرید من درد من و دواے من — فاش بگویم این سخن شمس من و خداے من

شمس تبریز طلوعے بکن از مشرق جان — کہ چو خورشید تو جانی و جہان جملہ بدن

اے شمس تبریزی بیا مستانہ بر من می نگر — من عاشق دیدار تو وتو فارغی از کار ما
مست و خراب و بیخودم زیں بادۂ صہباستم (ص ۵۰۹)

شمس تبریز توئی وجہ وجود — من از وجہ و مرا ست توام

روز درخشاں شمس دیں و ماہ تاباں شمس دیں — عین احساں شمس دین و شمس دیں فخر الکبار
اے دلیل بیدلان و اے رسول عاشقاں — بر شہ تبریز گو زنہار دست از ما مدار

خورشید روے مفخر آفاق شمس دیں — بر فانیے نتافت کہ او را بقا نکرد

شاہ جہان معرفت خاصۂ عشق شمس دیں — سالک ملک لامکاں خسرو کشور بقا

یا پھر مثنوی میں :-

شمس تبریزی کہ نور مطلق است — آفتاب ست و ز انوار حق است
چوں حدیث روے شمس الدیں رسید — شمس چارم آسماں رو در کشید
واجب آمد چونکہ بردم نام او — شرح کردن رمزے از انعام او
ایں نفس جاں دامنم برتافتہ است — بوے پیراہان یوسف یافتہ است

اس قسم کے اشعار سے اکثروں نے یہ استدلال کیا ہے، کہ حضرت شمس تبریز، مولانا کے پیر و مرشد تھے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ مولانا کا عام انداز بیان ہے، وہ اپنے مخصوص ارباب صحبت میں سے جس کسی کا بھی ذکر فرماتے ہیں، وفور محبت و جوش اخلاص سے بیخود ہو جاتے ہیں۔ اور بیساختہ ایسے الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں، جو عموماً ایک خوش عقیدت مرید اپنے مرشد ہی کی شان میں استعمال کرتا ہے۔ حسام الدین چلپی، مسلم طور پر اُنکے مرید و خلیفہ تھے، لیکن اُن کا ذکر مثنوی میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر جس ذوق و بیخودی کے ساتھ کرتے ہیں اُسکا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا:

ہمچناں مقصودِ من زیں مثنوی	اے ضیاء الحق حسام الدیں توئی
مثنوی اندر اصول و ابتدا	جملہ ہر تست و بر تست انتہا
التجا بر تست و بر امدادِ تو	تکیہ بر اشفاق و بر اسعادِ تو
در قبول تست عز و مقبلی	زانکہ شاہ جان و سلطان ولی
قصدم از الفاظ او رازِ تو است	قصدم از انشاش آوازِ تو است
پیش من آوازت آوازِ خدا است	عاشق از معشوق حاشا کے جدا است

(دفتر ۴ - حکایت مرد تشنہ)

کیا ایک مرید اپنے پیر کے متعلق اس سے زائد کچھ کہہ سکتا ہے؟ ایک اور مقام ملاحظہ ہو:-

اے ضیاء الحق حسام الدیں در آر	ایں سر خر را ازیں بطیخ زار
ہیں زما صورت گری و جان ز تو	نے غلط ہم ایں ز تو و ہم آں ز تو
مثنوی صورت بود جانش توئی	ہم جہت ہم نور ارکانش توئی

اسی طرح ایک اور رفیق صحبت، صلاح الدین زرکوب کا تذکرہ، بکثرت غزلیات میں اس لب و لہجہ میں کرتے ہیں سہ

کار زرکوباں چو زر کردی چو زر	شہ صلاح الدین کہ تو صد مردۂ

گر شبے خلوت کنی من گویم اندر گوشِ تو	لطفہائے را کہ با ما شہ صلاح الدین کند
آں کہ لعلِ شکر ینش بر لبِ آب حیات	خضر جاں گر بازبیند دم بدم تحسیں کند

مطربا اسرار ما را باز گو	قصہ ہائے جاں فزا را باز گو

چوں صلاح الدین صلاح جانِ ماست　　آں صلاحِ جانِ مارا باز گو

صلاح الحق و دیں نماید ترا　　جمال شہنشاہ سلطان ما

اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے، کہ مولانا سید برہان الدین کے سایۂ ارادت میں، مجاہدات وغیرہ کے ذریعہ سے علم و یقین، سلوک و معرفت کے مدارج عالیہ طے کرچکے تھے، اور انکا قلب سوز و گداز، مستی و بیخودی کے جذبات کے اظہار کے لیے بیچین ہو رہا تھا۔ شمس کی صحبت اس بارودخانہ کے حق میں چنگاری ثابت ہوئی۔ رومی، تبریزی میں، اور تبریزی، رومی میں فنا ہوگئے، اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ لذتِ فنا کے حوصلے دل کھول کر نکالے۔

حضرت شمس کے ساتھ مولانا کی مدتِ صحبت کُل دو ڈھائی سال کی ہی اس درمیان میں بڑھتے ہوے اختلاط کو دیکھ کر اعزہ و تلامذہ کو ناگواری پیدا ہوئی کہ یہ کون دیوانہ آنکلا ہے، جس نے مولانا کو مشاغل علمی و خانگی سب سے چھڑا کر اپنا کرلیا ہے۔ شمس یہ ناگوار صورتِ حال دیکھ کر بے اطلاع چل دیے۔ مولانا کو انکی جدائی کا اس قدر قلق ہوا، کہ بالکل خلوت اختیار کرلی۔ سب سے ملنا جلنا ترک کردیا۔ تنہائی میں رنج و غم کا زمانہ گزارتے۔ اتفاق سے ایک روز دمشق سے حضرت شمس کا مکتوب صادر ہوا۔ اُس نے دبی ہوئی آگ کو پھر بھڑکا یا۔ متعدد اشتیاقیہ غزلیں لکھکر اور بہت سے تحائف کے ساتھ اپنے صاحبزادہ سلطان ولد کے زیر سرکردگی ایک سفارت روانہ کی۔ خدا خدا کرکے شمس دوبارہ تشریف لائے لیکن چند روز کے بعد رفیقان قدیم کے رشک و حسد نے پھر زور پکڑا، اور جب اس کی نوبت حد سے گذر گئی، تو شمس نے ارادہ کرلیا کہ اب کی جاکر پھر کبھی نہ آئیں۔ چنانچہ چل دیے، اور باوجود انتہائی تلاش کے زندگی بھر ہاتھ نہ آئے۔

یہ ساری تفصیلات رسالہ سپہ سالار سے ماخوذ ہیں۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ خود مولانا کے فرزند اوسط، علاء الدین محمد نے برہم ہو کر حضرت شمس کو قتل کر ڈالا تھا (نفحات الانس وغیرہ) لیکن سپہ سالار میں شمس کی گم شدگی کا حال بتفصیل درج ہے۔ مناقب العارفین میں بھی ترجیحی پہلو اسی روایت کا رکھا ہے، اور فیہ ما فیہ کی اس عبارت سے بھی بجائے قتل کے گمشدگی ہی کی تائید نکلتی ہے "تا شمس الدین ناپید شد"

صلاح الدین زرکوب | شمس الدین تبریزی کے فراق میں مولانا کی حالت زبوں ہوگئی، اور ہر وقت

ایک شوریدگی سی طاری رہنے لگی۔ ایک روز اسی جوش و خروش کے عالم میں گھر سے باہر نکلے، راستہ میں شیخ فریدوں صلاح الدین کی دوکان پڑی۔ یہ ایک صاحبِ حال بزرگ تھے، مولانا کے پیر بھائی تھے، شمس و مولانا کے تخلیہ کی صحبتوں میں باریابی پا چکے تھے، اور زرکوبی کا پیشہ کرتے تھے۔ اتفاق سے اُسوقت وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ مولانا پر ہتھوڑی کی آواز نے سماع کا اثر کیا، اور سرِ راہ وجد و رقص کی حالت طاری ہوگئی۔ شیخ یہ کیفیت دیکھ کر بدستور ورقِ نقرہ پر ضربات لگاتے رہے، یہاں تک کہ بہت سی چاندی ضایع ہوگئی، مگر اُنھوں نے کچھ پروا نہیں کی۔ بالآخر مولانا نے اُنکو اپنے آغوش میں لے لیا، اور اس جوش و مستی میں گھنٹوں اس شعر کی تکرار کرتے رہے

یکے گنجے پدید آمد ازیں دوکان زرکوبی	زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی زہے خوبی

مولانا میں شمس کی مفارقت سے جو شورش پیدا ہوگئی تھی، اس میں اُنکی صحبت سے بہت افاقہ ہوگیا، اور اُن سے بھی ٹھیک اسی قسم کے تعلقات راز و ناز پیدا ہو گئے جیسے حضرت شمس سے تھے۔

"بعد از غیبت مولانا شمس الدین، تسکین و آرام بہ حضرت شاں یافتند چنانکہ سلطان ولد میفرماید ؎

شورشِ شیخ ازو شدہ ساکن	واں ہمہ رنج و گفتگو ساکن
شیخ با او چنانکہ با آں شاہ	شمس تبریز چنانکہ خاصہ اِلٰہ
خوش در آمیخت ہمچو شیر و شکر	کار ہر دو زہم گرشدہ زر"

(سپہ سالار، ذکر حضرت صلاح الدین زرکوب)

مولانا کا اُنکی جانب شغف التفات دیکھ کر حاسدوں کی جماعت شمس تبریز کی طرح اُنکے بھی درپے آزار ہوئی۔ لیکن بالآخر یہ دیکھ کر کہ مولانا کے تعلقات ان سے منقطع ہونے ممکن نہیں، ایذا رسانی سے باز رہے۔ سنہ ۶۶۲ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ سپہ سالار، وغیرہ میں تصریح ہے، کہ دس سال اُنکی صحبت مولانا سے رہی۔ اس حساب سے مولانا سے اُنکے آغاز تعلقِ خاص کا زمانہ سنہ ۶۵۲ھ سمجھنا چاہیے۔

مولانا نے اُنکے ماتم میں جو غزل موزوں کی وہ کلیات میں درج ہے۔ چند شعر یہ ہیں:-

اے زہجرانت زمین و آسماں بگریستہ	در میانِ خود نشستہ عقل و جاں بگریستہ
جبرئیل و قدسیاں را بال و پر ازرق شدہ	انبیا و اولیا را دیدگاں بگریستہ
شد صلاح الدین برفتی لے ہمائے گرم رو	ہم کسے باید کہ داند بر کساں بگریستہ
بر صلاح الدین چہ داند ہر کسے بگریستن	از کماں جستی چو تیرے واں کماں بگریستہ

حسام الدین چلپی

حضرتِ زرکوب کے بعد مولانا نے اپنا رفیقِ صحبت، اپنے مُرید باختصاص حسام الدین چلپی کو منتخب کیا، اور اُن سے بھی مراسمِ محبت بے حد و پایاں قائم ہو گئے مثنوی کی تصنیف انھیں کی تحریک پر کی، چنانچہ مثنوی میں متعدد مقامات پر انکا ذکرِ خیر کیا ہے اور ہر دفتر مثنوی کے آغاز میں صراحت کے ساتھ اُنکو مخاطب کرتے گئے ہیں - مرض الموت میں اپنا خلیفہ بھی انھیں کو منتخب کیا -

دیگر معاصرین

مولانا کے خاص اربابِ صحبت یہی حضرات تھے، جنکا ذکر اوپر گذر چکا - لیکن مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اربابِ کمال و مشاہیرِ عصر میں شیخ سعدی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ صدر الدین قونوی، شیخ اوحد الدین کرمانی، نجم الدین رازی، قطب الدین شیرازی، سے بھی کم و بیش مولانا کی ملاقاتیں رہی تھیں -

اولاد

مولانا کی دو شادیاں ہوئیں - پہلی بیوی گوہر خاتون بنت خواجہ شرف الدین لالائے سمرقندی تھیں - اُنکی وفات کے بعد، عقدِ ثانی کرا خاتون قونوی کے ساتھ کیا - زوجۂ اول کے بطن سے تین صاحبزادے ہوئے، جنکے نام بہاء الدین محمد عرف سلطان ولد، علاء الدین محمد اور مظفر الدین عالم تھے - زوجۂ ثانیہ سے صرف ایک صاحبزادی ملکہ خاتون تولد ہوئیں - فرزندِ سعید و خلفِ رشید بڑے صاحبزادے یعنی سلطان ولد تھے، جو باپ کے صحیح جانشیں اور بڑے صاحبدل بزرگ نکلے اور بعد حسام الدین چلپی کے مسندِ خلافت پر بیٹھے - (مناقب العارفین)

عام حالات و عادات

مسلمانوں کی حکومت تھی، اکثر علما و مشائخ کے لیے گرانقدر وظائفِ سرکاری مقرر تھے مولانا کے لیے اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہانہ کا وظیفہ مقرر تھا - مولانا اسکے معاوضہ میں افتاء کا کام کرتے تھے - اکلِ حلال کا اہتمام خاص تھا، اس لیے تاکیدی حکم تھا، کہ خواہ کیسی ہی وجد و سُکر کی کیفیت طاری ہو استفتاء جس وقت بھی آئے، بلا تامل پیش کر دیا جائے -

۳۵، ۴۰ سال کی عمر تک عام مشغلہ درس و تدریس و افتاء کا تھا، اسکے بعد شمس کی صحبت کے اثر سے وجد و استغراق کی کیفیت بڑھتی گئی، اور محض اُنکے ایماء سے سماع کا ذوق غالب ہوتا گیا - (سپہ سالار، ص۳۲) یہاں تک کہ مناقب العارفین کی روایات کے مطابق، بعض اوقات کئی کئی دن مسلسل سماع میں گذر جاتے تھے -

مجاہدات حد سے بڑھے ہوئے تھے - شب بیداری، تہجد گزاری، کثرتِ صیام، دوامِ ذکر عام معمولات تھے - ادائے نماز میں یہ شغف تھا، کہ جوں ہی وقتِ نماز آتا، فوراً قبلہ رُخ ہو جاتے

اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ بعض مرتبہ ساری ساری رات نماز عشا میں تمام ہو جاتی۔ غرض تصوف کی جو تعلیم، ملفوظات میں، الفاظ ذیل میں دی ہے، اُسپر خود پوری طرح عامل تھے:—

اُوصیکم بتقوی اللہ فی السر والعلانیۃ و بقلۃ الطعام و قلۃ المنام و قلۃ الکلام و ہجرۃ من المعاصی والاثام و ترک الشہوات علی الدوام واحتمال الجفاء من جمیع الانام والمواظبۃ علی الصیام و دوام القیام

مجاہدات و ریاضاتِ شاقہ، ترک و تبتل، زہد و قناعت، ورع و تقوے، احترام شریعت و ذوقِ عبادت کے کثیر التعداد اور حیرت انگیز واقعات سے، سپہ سالار، مناقب، نفحات، جواہر مضئیہ وغیرہ جملہ کتب تذکرہ لبریز ہیں۔

اپنی شاعری سے متعلق رائے

مولانا کی عام شاعرانہ شہرت کی بنا پر خیال یہ ہوتا ہے، کہ وہ ایک قدرتی شاعر تھے، اور ہمہ وقت فکر سخن میں معروف رہتے ہونگے لیکن اسی ملفوظات میں مولانا نے اپنی شاعری کے متعلق جو الفاظ ارشاد فرمائے ہیں اور جنھیں سپہ سالار نے بھی (ص ۴۲ و ۵۰) نقل کیا ہے، وہ اس خیال کی پوری تردید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مجھے شاعری سے کیا واسطہ؟ شاعری سے زیادہ لغو کوئی مشغلہ نہیں۔ مگر لوگ میرے پاس اسی کے طالب ہو کر آتے ہیں اور مجھ میں مروت اتنی ہے کہ کسی کو اپنے سے ناخوش نہیں جانے دیتا ہوں، اس لیے ان لوگوں کی محض خاطر داری سے کلام موزوں کر لیتا ہوں۔

آخر من تا ایں حد دلدارم، کہ ایں یاران کہ پیش من می آیند از بیم آنکہ ملول نہ شوند، شعر میگویم تا بدان مشغول شوند …… وگرنہ من از کجا و شعر از کجا، واللہ کہ من از شعر بیزارم، کہ کہ ازیں دون تر چیزے نیست"

تصانیف

مولانا نے اپنے بعد اپنی جو مستقل قلمی یادگاریں چھوڑیں، وہ حسب ذیل ہیں:—

(۱) کلیات شمس تبریز۔ غزلیات کا نہایت ضخیم مجموعہ۔ عام طور پر اسے شمس تبریز کا کلام سمجھا جاتا ہے، حالانکہ کلام خود (خصوصاً جس صورت کے ساتھ اکثر مقطع میں شمس کا نام آیا ہے، وہ) اس امر کی صریح شہادت دے رہا ہے کہ اسکا کہنے والا شمس کے علاوہ کوئی اور شخص ہے۔ تذکرہ نویس بھی اس پر متفق ہیں کہ وہ کلام مولانا کا ہے۔ نولکشور پریس لکھنؤ نے ایک متوسط ضخامت کا مجموعہ دیوان شمس تبریز کے نام سے چھاپا ہے، جو اغلاط طبعی سے لبریز ہے۔ اسی پریس نے جو دوسرا ضخیم مجموعہ شایع کیا ہے، وہ کلیات شمس تبریز کے نام سے موسوم ہے اور نسبتۃً صحیح بھی ہے۔ کلیات کا ایک نسخہ تبریز میں شایع ہوا ہے۔ وہ مؤلف اوراق کی نظر سے نہیں گذرا

امرتسر میں عرصہ ہوا دیوان شمس الحقائق شایع ہوا تھا۔ وہ غالباً اسی تبریزی نسخہ سے ماخوذ و منقول تھا۔ مطبوعہ کلیات میں بعض غزلیات ایسی بھی ملتی ہیں، جو غالباً الحاقی ہیں، یعنی عقائد اہل سنت سے بالکل ہٹی ہوئی، اس لیے یقین نہیں آتا، کہ مولانا کی زبان سے ادا ہوئی ہوں، مثلاً جناب امیرؑ کی منقبت میں وہ غزل، جسکا ایک شعر یہ ہے۔

ہم اول و ہم آخر ہم ظاہر و باطن ہم عابد و ہم معبد و معبود علی بود

کلام کا بیشتر حصہ غلبۂ مستی و سُکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، اور کم از کم علماء ظاہر کو ایسے مسلّم عقائد اسلام سے مطابقت دینے میں دشواری پیش آتی رہتی ہے۔

رباعیاتِ مولانا رومی، کلیات سے الگ بھی غالباً شایع ہو چکی ہیں۔

(۲) مثنوی۔ فرط شہرت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ عربی، فارسی، ترکی، اردو، انگریزی، مغربی و مشرقی زبانوں میں بیسیوں ترجمے، شرحیں، اور خلاصے شایع ہو چکے ہیں۔ عام طور پر چھ دفتر ملتے ہیں۔ شیخ اسمٰعیل قیصری شارح مثنوی کو مدت ہوئی دفتر ہفتم دستیاب ہوا تھا، لیکن اکثر علمائے فن کے نزدیک اس کا مولانا کی تصنیف ہونا بہت مشتبہ ہے۔ ذوق وحال، سوز و درد، وجد وکیف میں مثنوی کا ایک ایک شعر ڈوبا ہوا ہے، لیکن باایں ہمہ برخلاف کلیات کے، اس میں احترام شریعت کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے پایا ہے، اسی لیے بڑے بڑے مقدس علما و فقہا نے اس شراب کو شراب طہور قرار دیا ہے، بلکہ خود اس میکدہ سے دل کھول کر سیراب ہوے ہیں۔ مثنوی کا زمانۂ تصنیف کلیات سے بہت بعد کا ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا اسوقت مرتبۂ سکر و تلوین سے گزر کر منزل صحو و تمکین پر فائز ہو چکے تھے، جو حضرات صوفیہ کے نزدیک ارتقاء روح کا منتہا ہے۔

(۳) فیہ ما فیہ یا ملفوظات مولانائے رومی۔ دنیا اب تک صرف اس رسالہ کے نام سے واقف تھی، اور آج مولانا کے وصال کے تقریباً سات سو سال کے بعد، محض خداوند تعالے کے فضل وکرم سے پہلی بار طبع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہونچ رہا ہے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ صفحات آیندہ کا موضوع ہے۔

لہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مولانا سے متعلق منجملہ اور بہت سے غلط روایات کے یہ اطلاع بھی درج ہے، کہ "مثنوی ۴۰ برس کی مدت میں تالیف ہوئی" (دیکھئے آرٹیکل جلال الدین رومی) اس عجیب و غریب تحقیقات کا ماخذ نامعلوم کیا ہے۔

علماے اندلس

اخبار الاندلس کے نشر کا حشر گو میرے حق میں چنداں مفید نہ ہوا تاہم میں اس حماقت میں گرفتار ہوں کہ کسی طرح "آثار الاندلس" بالخصوص "رجال الاندلس" کی تکمیل ہو جائے۔ یہ تو یقینی ہے کہ ان دونوں کو دیکھنے کی بھی کوئی مسلمان تکلیف گوارا نہ فرمائے گا۔

میرا تجربہ ہے کہ اندلس مغفور پر داویلا کرنے والوں کی تعداد میرے ہندوستان میں بہت زیادہ ہے۔ مگر وہ اپنے مرثیوں میں اسکو بھول جاتے ہیں کہ وہ خاک و در و دیوار اندلس کو نہیں روتے، بلکہ وہاں کے اُن مرنے والوں کو روتے ہیں، جو اپنا نقش قدم متقل چھوڑ کر اغیار کے طفیل میں اس طرح غائب ہوئے ہیں کہ آج اُنکی خاک کا بھی پتہ نہیں ملتا۔

ذیل میں بعض اندلسی علما کے اسماے مبارک اور اُنکے اشتغال لکھتا ہوں۔ خدا کرے کسی کو دلچسپ معلوم ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اسپین میں نہ کوئی لٹریچر تھا، نہ کوئی بڑی صنعت و حرفت۔ مسلمانوں کو اسکا بجا فخر ہے، اور عیسائیوں کو اسکا اقبال، کہ اگر مسلمانانِ اندلس اپنے علم و عمل، صنعت و زراعت وغیرہ کا نمونہ اہالی یورپ کے سامنے پیش نہ کرتے، اور علوم کیمیا و ہندسہ، نباتات و طب کے شیوع کو روک رکھتے تو یورپ کی موجودہ تہذیب صدیوں پیچھے جا پڑتی۔ جو حالت یورپ کی بیسویں صدی میں دکھلائی دیتی ہے۔ وہ شاید پچاسویں صدی کے خوش نصیبوں کو نظر آتی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں اندلس وہ کعبۂ علم تھا کہ جس کے طواف کو فرانس اور اٹلی سے بہترین طلبا آتے تھے۔ اندلس کی مثال بعینہ وہی تھی جو آج فرانس، جرمنی، انگلستان، ہالینڈ وغیرہ کی ہے۔ مسلمانوں کو اس پر رشک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ قطع نظر اسکے کہ تلک الایام نداولہا بین الناس، اس انقلاب کا بڑا باعث یہ ہے کہ مسلمانوں کے علمی خزانے یا کراہ جلا ڈالے گئے یا بطوع ان مسیحی ممالک میں منتقل ہوتے ٹھنڈے دل سے دیکھ لیے گئے۔ مسلمانانِ اندلس کی ہزاروں (عربی) کتابیں ایسی ہیں کہ لاطینی میں ترجمہ ہوئیں اور اصل نابید ہو گئیں۔

اب مسلمان اتنی تکلیف کیوں اُٹھانے لگے کہ اپنے اجداد کے ان ترکوں کو پھر اپنے یہاں لے آئیں!

جب ۹۲ھ ہجری میں بنواُمیہ نے اندلس پر قبضہ کیا ہے تو اس ملک کو علم سے بالکل خالی پایا ہے۔ نہ وہاں اسکی طرف توجہ تھی۔ علامہ اسکاٹ نے کھنچ وکاوی کرکے بعض کتابوں کا وجود اسپین میں تبلایا ہے (ملاحظہ ہو اخبار الاندلس) مگر وہ قابل اعتنا نہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں کچھ طلسم ضرور تھے، مگر ظاہر ہے کہ اُن طلسموں سے علم کو کوئی مدد نہیں پہونچ سکتی تھی؛ بیش برین نیست کہ یہ کہا جا سکے کہ اسپین کے قدیم آقا، فینیقی اور رومی، اتنے ترقی یافتہ تھے کہ وہ ایسے ایسے طلسم بنا سکے۔ جب تک بنو امیہ کی مستقل سلطنت یہاں قائم نہ ہوگئی، زمانہ امارت کے فاتح مسلمان بنے تو انتظامات اور خانہ جنگیوں میں مصروف رہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس ملک میں استقلال بھی حضرت عبدالرحمن اول (رحمہ اللہ) کے قدوم سے حاصل ہوا۔ جس تاریخ ان کا قدم مبارک وہاں پہونچا ہے اُسی دن گویا علم وعمل کا بنیادی پتھر اُندلس میں رکھا گیا۔

بنو امیہ کے پانچویں تاجدار امیر محمد بن عبداللہ کے زمانہ یعنی تیسری صدی کے وسط تک تو علوم شرعیہ وادب پر تصانیف ہوتی رہیں۔ علوم عقلیہ کی طرف توجہ نہ ہونے یا انکے نشر نہ کرنے کا بڑا باعث یہ ہوا کہ اُسوقت تک علماے دین کا زور تھا اسلیے طالب علموں کو اپنا کمال دکھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ جیسے ہی انکی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی، معقولئین کا قلم بے لگام ہوگیا؛ گو میرے نزدیک تو علماء کی دو سو برس کی قید فرنگ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے تھوڑا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ آزادی بغیر کسی قسم کی قربانیوں کے حاصل ہوئی۔ یہ ہوتا رہا ہے کہ علماء خفیہ خفیہ اپنے خیالات کو برسوں کی محنت کے بعد تحریر میں لائے۔ علماے دین نے اسکی سن گن پائی، انکار کو برانگیختہ کیا اور یہ کتابیں جلوا ڈالیں۔ یہ واقعات متعدد ہوے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہوتے رہے۔ یہ لکھ دینا اور پڑھ لینا کہ "کتابیں جلوا ڈالی گئیں" میرے اور آپ کے دل پر زیادہ اثر نہیں کریگا، اُن لوگوں سے پوچھیے جن کی برسوں کی محنت یوں ضایع ہوئی اور اُس پر مستزاد یہ کہ یہ غریب ملحد، بے دین اور کافر اور زندیق کہلائے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ابو عبیدہ مسلم البلنسی معروف بہ صاحب القبلہ اور یحییٰ بن یحییٰ معروف بہ ابن السمینہ قرطبی تیسری اور چوتھی صدی کے علماء میں سے ہیں؛ ان ہی دنوں میں علماے ملت کا بہت زور تھا، یہی اصحاب صولت تھے اور ان ہی کی تاثیر عوام الناس کے دلوں میں تھی۔ باوجود

اسکے موسومۂ بالا علماء کی قدر رہی، حالانکہ پہلے حرکات کواکب اور اُنکے احکام کے بڑے عالم تھے اور دوسرے حساب، نجوم، طب وغیرہ کے قائل تھے اور معتزلی کہلاتے تھے۔ ان دونوں پر جو علمائے دین نے مشق ستم نہیں کی اُسکی وجہ یہ تھی کہ یہ بہت بڑے فقیہ بھی تسلیم کیے جاتے تھے۔ محمد بن اسمعیل المعروف بہ حکیم (المتوفی ۳۳۱ھ) حساب اور منطق کے عالم ہونے میں گو بدنام تھے، مگر وہ اس لیے بچے رہے کہ نحوی اور لغوی بھی تھے۔

خدائے تعالیٰ کی حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے! اُسکو یہ منظور تھا کہ یورپ جیسے مظلم ملک کو منور کردے اور اُسکو اس قابل بنا دے کہ جب مسلمان ظلمت جہل میں گرفتار ہوں تو یہی یورپ اُن پر حکومت کرسکے۔ اُس نے بعض روشن خیال بادشاہ اندلس میں ایسے پیدا کردیے کہ جنھوں نے ترقی علوم کی طرف توجہ کی اور خود اسکے شاغل ہوے۔ جب تک یہ نہ ہوا معترضین کی کا فرما جرائی ختم نہ ہوئی۔ جس بادشاہ کا نام کہ آفتاب نصف النہار کی طرح چمک رہا ہے، اور قیامت تک چمکتا رہے گا وہ الحکم ہیں کہ اُنھوں نے اپنے والد عبدالرحمن کی زندگی (ابتدائے صدی چہارم) میں علم کی طرف توجہ فرمائی، اور بغداد، مصر، ایران، ہندوستان وغیرہ وغیرہ سے علوم قدیمہ وجدیدہ کی بہترین کتابیں جمع کیں۔ اپنے والد کی حیات اور اپنی مدت سلطنت میں جمع اور مطالعہ کرتے رہے۔ الحکم کے ذوق علمی کا قصہ ایسا نہیں ہے کہ یہ مختصر اُسکا متحمل ہو۔ اسکے لیے علیحدہ رسالہ کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اُنکے زمانۂ سعادت میں ہر قسم کے علوم نے جو ترقی کی وہ بقول شخصے "نشر نہیں تھا، بلکہ حشر تھا۔"

ہر مد کے بعد جزر ہو کر رہتا ہے۔ اس پر متحیر نہ ہونا چاہیے کہ اُن ہی کے بیٹے ہشام کے زمانہ میں علوم پر پھر آفت آئی اور بہترین عوام الناس اور علمائے دین کے جذبات تدین کو پورا کرنے کے لیے خود الحکم کا کتبخانہ تباہ کیا گیا اور علوم قدیمہ، منطق، فلسفہ، نجوم، حتیٰ کہ حساب اور طب کی کتابوں کو یا جلا ڈالا یا کھود کر زمین میں دفن کر دیا، یا اور طرح خراب کر دیا گیا۔ ہنسی آتی ہے جب یہ سنتے ہیں کہ علمائے دین نے یہ ستم ان دلائل سے ڈھایا کہ "اِن علوم کو ہمارے اسلاف پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ مذموم جانتے تھے۔ معقول منقول کو ضرور نقصان پہونچاتا ہے نیز انکا شیوع ہمارے بزرگوں کی سنت کے خلاف ہے۔" چھوٹا منہ اور بڑی بات، یہ عرض کرنا داخل گستاخی ہے کہ ان تنگ خیال بزرگوں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ نشر علوم عقلیہ کو روکنا خاص مسیحی سنت ہے کہ اُس زمانہ میں زوروں پر تھی اور صدیوں بعد تک جاری رہی! یہ سب کچھ ہوا، مگر

محبت کے رو د گر استخوانم طوطیا گردد   کہ از سائیدن صندل کجا نقصاں شود بو را

علماے علوم حدیثہ بے دین سمجھے جاتے تھے اور الحاد و زندقہ سے متہم تھے مگر خفیہ ہی خفیہ ان علوم کی ترقی میں ساعی رہے اور چپکے ہی چپکے انکو پڑھاتے رہے۔

میں نے جو کچھ اوپر عرض کیا ہے وہ قاضی صاعد (رح) کا ملخص ہے اور اسکی تائید ابن سعید سے ہوتی ہے۔

مدتوں یہ کیفیت رہی کہ اندلس میں ہر علم کی قدر رہی، مگر فلسفہ و تنجیم کی۔ عوام وہ پڑھتے تھے اور خواص یہ سیکھتے تھے: فرق اتنا تھا کہ وہ ظاہر کرتے تھے اور یہ پوشیدہ رکھتے تھے۔ وہ ایسا نہ کرتے تو اُنکے تقدس میں فرق آتا تھا، اور یہ اس پر عمل نہ کرتے تو زندیق کہلاتے۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ گورنمنٹ کو خبر بھی نہ ہونے پائی کہ اس جرم کے مجرم سنگسار کر دیے گئے یا زندہ جلا ڈالے گئے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ گورنمنٹ کے حکم سے ان لوگوں کی کتابیں جلوا دی گئیں

حاشا کہ فقرات بالا سے علماے ملت کی تنقیص مقصود نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی ان حضرات صالحین پر ہنسے؛ مگر قبل اسکے کہ یہ کیفیت پیدا ہو ان نفوس قدسی کے احسان کو نہ بھولنا چاہیے اگر یہ ذواتِ زکیہ نہ ہوتے، تو آج ہم مسلمان بھی ویسے ہی مادہ پرست ہوتے جیسا کہ یورپ ہے۔ اور ہم کو اب اپنا جیسا بنا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال میرے جہل پر مبنی ہو مگر مجھے اندلس میں آمین بالجہر اور رفع یدین جیسے فروعی مسائل پر کفر بازی نظر نہ آتی۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ احسان علماء معقول کا ہو۔

غرض باوجود ان قیدوں کے یہ آزادی تھی کہ خاک اندلس نے بڑے بڑے علماے علوم جدیدہ پیدا کر دیے۔ ذرا انکو دیکھیے کہ یہ کون تھے اکیسے تھے اور ان پر کیا گذری

حضرت ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ

"علم فلسفہ میں ہمارے زمانہ کے امام (حضرت) ابو الولید ابن رشد القرطبی (رح) ہیں۔ اس فن میں اُن کی بہت تصانیف ہیں۔ خاندان بنو عبد المومن کے تاجدار منصور نے اسی فلسفہ کی علت میں اُنکو قید کیا[1]۔ ابن حبیب جیسے فلسفی کو انھیں منصور کے صاحبزادہ

---

[1] حضرت قاضی ابن رشدؒ کا انجام نہایت دردناک ہے اُسکے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ قدسی نفس ایسے نکل آئیں کہ انکو حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ قاضی صاحب کی نسبت استعمال کرنا ناگوار ہوں، مگر اسکو کیا کیا جائے کہ یہی قاضی صاحب آج یورپ بھر کے معبود ہیں۔ ابن حبیب کو یہ شہرت نصیب نہیں ہوئی گر وہ قاضی صاحب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ امام غزالی بھی یہاں معتوب رہ چکے ہیں۔

مامون نے اشبیلیہ میں قتل کرایا۔ یہ علم اندلس میں مدتوں مقہور رہا۔ کوئی فلسفی اسکے اظہار کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ مطرف اشبیلی نے علم نجوم میں کمال حاصل کیا اور اپنے وطن (اشبیلیہ) میں اسی جرم میں زندیق مشہور رہے۔ یہ اپنی تصانیف کو ہمیشہ چھپاتے رہے۔

اہل قرطبہ علوم قرأت و روایات میں گو کمال رکھتے تھے، مگر فقہ، نحو، شعر، لغت، حدیث، طب، حساب اور نجوم میں بھی دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔"

اسی ضمن میں حافظ ابن حزم (رح) نے قرطبہ کے علمائے دین، نسب، تاریخ، اور طب کا ذکر کیا ہے اور انکی اکثر کتابوں کا نام تبلایا ہے۔ اسکے بعد لکھتے ہیں کہ

"باقی رہا فلسفہ، میں نے اس علم میں سعید بن فتحون السرقسطی کی بہت سی کتابیں اور رسالے دیکھے ہیں۔ مگر میرے استاد ابو عبداللہ محمد بن الحسن المذحجی کے رسائل مشہور و متداول ہیں۔ یہ رسالے نہایت خوب اور عظیم المنفعت ہیں۔ مسلمہ ابن السمح اور احمد بن نصر جیسے زائچہائے تنجیمی ہمارے ملک اندلس میں کسی نے نہیں بنائے"

فن موسیقی میں ابو بکر بن ماجد غرناطی کی کتاب کا نام لے دینا کافی ہے۔ ان ابو بکر کا مغرب میں وہی درجہ و رتبہ ہے جو مشرق میں ابو نصر فارابی کا۔ اکثر الحان موسیقی ان ہی کی طرف منسوب ہیں اور اس فن میں وہ معتمد علیہ ہیں۔ یحیی الخدوج (متوفی صدی ہفتم) نے کتاب الاغانی اندلسیہ اسی رنگ میں لکھی جو ابو الفرج نے اپنی اغانی میں اختیار کیا ہے۔

ابو غالب بن عبادہ الفرائضی علم عدد میں بہت مشہور رہے۔ ابو ایوب عبد الغافر بن محمد علم ہندسہ کے عالموں میں سے تھے۔ عبد اللہ بن محمد، المعروف بہ سری، عدد و ہندسہ کے عالم تھے۔ علم کیمیا میں انکی بالخصوص شہرت تھی۔ ابو بکر بن ابو عیسی عدد و ہندسہ تمام علوم ریاضیہ و نجوم میں اپنے زمانہ کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ امیر الحکم کے زمانہ میں وہ ان علوم کو پڑھاتے تھے۔ شاگردوں کی تعداد بہت ہوتی تھی۔ عبد الرحمن بن اسمعیل بن زید المعروف بہ اقلیدی علم ہندسہ اور منطق میں ید طولی رکھتے تھے۔ احمد بن حماد القرطبی حساب و ہندسہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ابو القاسم احمد بن محمد العددی عدد و ہندسہ پڑھاتے تھے۔ ابو عثمان سعید ابن فتحون، المعروف بہ حمار سرقسطی، نحو و لغت کے امام وقت تھے۔ موسیقی و فلسفہ پر بھی انکے کئی رسائل ہیں۔ ابو القاسم مسلمہ بن احمد المعروف بہ مرحیط ریاضی کے اندلس بھر میں امام مانے جاتے تھے۔ علم الافلاک میں ان سے بڑا عالم نہیں سمجھا جاتا۔ ارصاد الکواکب اور تمام علوم اعداد میں

اُن کی نہایت اچھی کتابیں تھیں۔ بتانی کے زائچوں سے اختصار کرکے اُنھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا، جو مدتوں اندلس میں متداول رہا۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی کے زائچوں سے بھی اُنھوں نے ایک کتاب تالیف کی تھی اور اُنکی فارسی تاریخ کو عربی میں ترجمہ کیا۔ اوّل تاریخ ہجری سے انھوں نے اوساط الکواکب وضع کیا۔ اور اُس پر بہت اچھے جداول ایزاد کیے۔ انھوں نے ۳۹۸ھ میں انتقال کیا۔ اپنے پیچھے ابن السمح، ابن الصفار، زہراوی، کرمانی، اور ابن خلدون جیسے شاگرد چھوڑے، جو اپنے زمانہ میں آفتاب ہوکر چمکے۔ کہتے ہیں کہ ان جیسے شاگرد ان رشید و فاضل کسی نے نہیں چھوڑے۔ ان حضرات کی صفات حسب ذیل ہیں:

ابن السمح القاسم اصبغ بن محمد السمح، علوم عدد و ہندسہ میں بڑے محقق تھے۔ ہیئت الافلاک و حرکات نجوم میں اپنے زمانہ کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ فن طب میں انکی قابلیت مسلم تھی۔ علم ہندسہ، عمل اصطرلاب اور زائچوں پر اُنکی نہایت اچھی تالیفیں تھیں۔ اُنھوں نے ایک زائچہ ہندووں کے طریقہ پر لکھ کر اُسکا نام سندہند رکھا تھا۔ ۴۲۶ھ میں انتقال کیا۔

ابوالقاسم احمد بن عبداللہ بن عمر المشہور بہ ابن الصفار، علوم عدد، ہندسہ، اور نجوم میں بہت مشہور ہوے۔ قرطبہ میں پڑھاتے تھے۔ انکے بھائی محمد نے عمل اسطرلاب میں بڑی شہرت پائی۔ اُن سے پہلے اس فن میں اُن جیسا کوئی عالم نہیں گذرا۔

زہراوی کا نام ابو الحسن علی بن سلیمان ہے۔ عدد و ہندسہ میں تو ید طولیٰ رکھتے ہی تھے طب کے بھی بہت بڑے فاضل تھے۔

کرمانی کا نام ابو الحکم عمرو ابن عبد الرحمن تھا۔ قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ علوم عدد و ہندسہ میں راسخین فی العلم میں شمار ہوتے تھے۔ مشرق میں سیاحت کی اور بلاد جزیرہ میں حران تک پہونچے۔ اثناے سیاحت ممالک مشرقیہ میں ہندسہ و طب حاصل کیا۔ اور پھر اندلس واپس آگئے۔ رسائل اخوان الصفا اندلس میں ہی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ علام نظریہ (تھیوریٹکل سائنس) میں اُنکی نظر نہایت وسیع تھی۔ سرقسطہ میں ۴۵۸ھ میں انتقال کیا۔

ابو مسلم عمرو ابن احمد ابن خلدون الحضرمی اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ علوم فلسفہ، ہندسہ، نجوم و طب میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ ۴۴۹ھ میں انتقال کیا۔ (واضح ہو کہ یہ ابن خلدون، وہ مشہور ابن خلدون نہیں ہیں جنکی تاریخ مشہور ہے۔ اُن کا نام عبد الرحمن بن خلدون ہے)

اب ان حضرات کے شاگردوں کو لیجیے

ابوالقاسم احمد بن عبداللہ الصفار ان کے مشہور شاگرد ابن برغوث، واسطی، ابن شہر، قرشی، اسطش مروانی اور ابن العطار ہیں۔

ابن برغوث کا نام محمد بن عمر بن محمد ہے۔ علوم ریاضیہ میں بڑے محقق تھے۔ علم الافلاک، ہیئت، حرکات کواکب اور رصد میں اُنکی خاص شہرت تھی۔ اسکے ساتھ ہی علم نحو، قرآن مجید اور فقہ کے بھی بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ اصل تو یہ ہے کہ تمام علوم میں اُنکو تبحر تھا۔ ۴۴۴ھ میں انتقال کیا۔

واسطی کا نام ابو الاصبغ عیسیٰ ابن احمد ہے۔ علم عدد، ہندسہ اور فرائض کے بڑے عالم تھے قرطبہ میں درس دیتے تھے۔ ہیئت الافلاک اور حرکات النجوم میں شہرت رکھتے تھے۔

ابن شہر کا نام ابو الحسن مختار بن شہر الرعینی ہے۔ ہندسہ و نجوم میں شہرت رکھتے تھے۔ لغت، نحو، حدیث اور فقہ کے عالم تھے۔ اسکے ساتھ ہی بہت بڑے شاعر تھے۔ سیر و تواریخ میں بڑی قابلیت تھی۔

ابن العطار کا نام محمد بن خیرۃ العطار ہے۔ عدد و ہندسہ و فرائض کے عالم تھے۔ نجوم و حرکات نجوم میں پوری بصیرت تھی۔ ابن السمح مذکور الصدر کے مشہور شاگردوں میں ابو مروان سلیمان بن محمد بن عیسیٰ بن الناشئی ہیں، انکو بھی عدد، ہندسہ، طب، و احکام نجوم میں خوب دسترس تھی۔ دوسرے مشہور شاگرد ابو جعفر احمد بن عبداللہ المعروف بہ ابن الصفار ہیں۔ انکو طب میں بڑی دستگاہ تھی۔

ان ہی کے معصر عبداللہ بن احمد سرقسطی ہیں۔ علم عدد و ہندسہ و نجوم خوب جانتے تھے۔ اپنے ہی شہر (سرقسطہ) میں درس دیتے تھے۔ ۴۴۸ھ میں انتقال کیا۔ ابن السمح کے شاگردوں میں ایک مشہور آدمی ابو اسحٰق ابراہیم بن احمد بن ابراہیم اشبیلی ہیں۔ نحو، برہان و لسان کے علاوہ اکثر علوم میں دسترس کامل رکھتے تھے۔ ۴۲۰ھ میں انتقال کیا۔

ابن برغوث کے مشہور شاگردوں میں ابن اللیث، ابن الجلاب اور ابن حی ہیں۔ ابن اللیث کا نام محمد بن احمد ہے۔ علوم عدد و ہندسہ میں محقق تھے۔ حرکات الکواکب، رصد، نجوم، لغت و فقہ میں بہت زیادہ بصیرت رکھتے تھے۔ ۴۰۵ھ میں انتقال کیا

ابن حی کا نام حسن بن محمد التجیبی ہے۔ قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ ہندسہ و نجوم میں بصیرت تام رکھتے تھے۔ ہند ہند متذکرۂ بالا کی بڑی خوبصورتی سے تلخیص کی۔ ۴۴۲ھ میں اندلس سے سیاحت کے لیے نکلا۔ پہلے مصر گئے، اور وہاں سے یمن۔ اُس زمانہ میں یہاں کے بادشاہ مسیحی تھے۔ انکی سلطنت تمام مصر، شام، جزیرۃ العرب، حجاز، تہامہ، نجد، اور بعض حصص افریقیہ پر مشتمل تھی۔ امیر کی

کے مصاحب ہو گئے تھے۔ ۴۵۶ھ میں انتقال کیا۔

ابن الجلاب کا نام حسن بن عبد الرحمن ہے۔ ہندسہ، ہیئت اور نجوم میں محقق سمجھے جاتے تھے۔ منطق و علم طبیعی میں اپنے زمانہ کے نہایت مشہور عالم تھے۔ ابوالولید ہشام بن احمد بن ہشام بن خالد الکنانی المعروف بابن الوقشی طلیطلہ کے رہنے والے اکثر علوم میں محقق تھے صاحب فکر صحیح و نظر وسیع تھے۔ نقد و تحقق میں علماء ان سے ڈرا کرتے تھے۔ ہندسہ، منطق، نحو، لغت، شعر، خطابت، فقہ، حدیث اور کلام میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انساب، اخبار اور سیر میں کوئی انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ تمام علوم میں انکو تبحر تھا۔

ان کے بڑے مشہور شاگرد ابو جعفر احمد بن خمیس بن عامر بن منیح طلیطلہ ہی کے رہنے والے تھے ہندسہ و نجوم و طب میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

دوسرے مشہور شاگرد ابو اسحٰق ابراہیم بن لب التجیبی معروف بہ قویدس ہیں۔ مدتوں درس دیتے رہے۔ علم ہیئت افلاک، حرکات النجوم اور جملہ فنون ادبیہ عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۴۵۴ھ میں انتقال کیا۔

تیسرے مشہور شاگرد محمد بن عبد اللہ بن مرشد، ابن طلمس وزیر کے غلام تھے۔ فن کتابت کے علاوہ اکثر صنایع میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حساب، تنجیم اور ہندسہ میں تو انکی بڑی شہرت تھی ۴۴۴ھ میں انتقال کیا۔

پانچویں صدی میں بہت سے نوجوان علم فلسفہ کی طرف مائل ہوے۔ یہ لوگ نہایت ہوشیار اور ہمت رفیع رکھتے تھے۔ طلیطلہ کے مشہور لوگوں میں مشہور آدمی ابو الحسن علی بن خلف بن احمر، ابو مروان عبد اللہ ابن خلف الاستجی، ابو جعفر احمد بن یوسف التہلالی، اور عیسیٰ ابن احمد بن العالم، ابراہیم بن سعید السہلی الاصطرلابی ہیں۔ اور سرقسطہ والوں میں سے حاجب ابو عامر بن امیر المقتدر باللہ، ابو جعفر اور احمد بن جوشن ہیں۔ اہالی بلنسیہ میں سے ابو زید عبد الرحمن بن سیدیہ۔

علم ہندسہ میں جن علماء کو بیحد شہرت حاصل ہوئی اُن میں سے علی بن احمد الصیدلانی اور ابو جعفر احمد بن جوشن ہیں۔ علوم حرکات نجوم اور ہیئت الافلاک، میں جو لوگ کہ آسمان اندلس کے ستارے ہو کر چمکے وہ ابو اسحٰق ابراہیم بن یحییٰ النقاش المعروف بہ ولد الزرقیال ہیں (زرقیلہ ایک آلہ ہے جو رصد کواکب میں کام آتا ہے) یہ پانچویں صدی میں رصد کواکب، ہیئت افلاک اور حرکات سیارگان میں اپنے ہمعصروں میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ زائچۂ نجومی اور استنباط آلات نجومیہ

میں جو کمال اُنکو حاصل تھا اُسکے سب معترف تھے۔ احمد بن یوسف المعروف بہ ابن کماد علم اعداد و نجوم کے فاضل تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے بہت سے زائچے بنائے۔ ولد الزرقیال مذکورۂ بالا کے ارصاد پر انھوں نے بہت کچھ ایزاد کیا۔ ابو عامر بن الامیر ابن ہود علوم ہندسہ و نجوم وغیرہ کے علاوہ، منطق، علم طبیعی اور ما بعد الطبیعیات میں لاثانی تھے۔

عبد الرحمن بن اسمٰعیل ابن بدر، المعروف بہ اقلیدس الاندلسی، علم ہندسہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اسکے ساتھ ہی منطق میں بھی اُنکا پایہ بہت بلند تھا۔ موسیٰ ابن میمون الاسرائیلی الاندلسی کی بہت سی تصانیف تاریخ، ریاضی اور منطق پر ہیں۔ ابو بکر بن الصائغ، المعروف بہ ابن باجہ، وہ شخص ہیں کہ جنکے درجہ تک اُنکے زمانہ اور اُنکے شہر کا کوئی عالم نہیں پہونچا۔ تاریخ میں تو وہ بے مثل تھے ہی، ریاضی، منطق، اور ہندسہ میں انھوں نے بہت کچھ ایزاد کیا۔ علوم حکمیہ میں وہ آیۃٌ من آیات اللہ تھے۔ علوم عربیہ ادب اور طب میں عالی درجہ تھے۔ موسیقی میں وحید العصر تھے۔ عود بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ فن موسیقی میں فارابی سے کسی طرح کم نہ تھے۔ بوعلی سینا اور غزالی کے مقابل اگر کوئی مغرب میں ہے تو ابن باجہ۔ ابن قفطی نے انکے متعلق یہ لکھا ہے کہ سیاست مدنیہ میں انکو ایسا انہماک ہوا کہ اوامر شرعیہ کی وہ پروا ہی نہ کرتے تھے۔ بیس برس تک ابو بکر یحییٰ بن تاشفین کے وزیر رہے اور ۵۳۳ھ میں انتقال کیا۔

فلسفیوں میں سے جن لوگوں نے منطق پر زیادہ توجہ فرمائی اُن میں سے ابو محمد بن حزم الظاہری ہیں۔ انکے والد بہت بڑے آدمیوں میں سے تھے۔ حضرت محمد ابن ابی عامر المنصور اور اُنکے بیٹے مظفر کے وزیروں میں بڑے فایق تھے۔ خود ابو محمد بھی چند روز عبد الرحمن المستظہر باللہ کے وزیر رہ چکے تھے۔ لیکن پھر ذوق علمی نے اُنھیں اپنی طرف کھینچا۔ آثار و سنن حاصل کرکے منطق میں کمال پیدا کیا۔ ابو الحسن علی بن اسمٰعیل بن سید الاعمیٰ خود نابینا تھے اور نابینا کے بیٹے۔ علم منطق میں بہت بڑے عالم مانے جاتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نحو، لغت، اور اشعار میں تو اُن سے بڑا کوئی عالم اندلس میں گذرا ہی نہیں۔ علم لغت میں اُنکی مبسوط کتابیں ہیں منجملہ اُنکے محکم، محیط الاعظم المخصص، شرح اصلاح المنطق اور شرح حماسہ نے خاص طور پر بہت بڑی شہرت پائی۔

اندلس میں جن نابیناؤں نے شہرت پائی اُن میں سے سب سے عجیب آدمی ابن الحناط الکفیف ہیں۔ اُنکے متعلق ابن حیان کا قول ہے کہ "وہ علوم جاہلیت و اسلام میں عالم ترین

شخص تھے۔ یہی کیفیت انکی علم افلاک وہیئت میں تھی۔ بہت بڑے فلسفی تھے اور طبیب حاذق۔
اکثر علوم انھوں نے ضعف بصر کی حالت میں حاصل کیے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب نظر بالکل جاتی
رہی تو طب میں کمال پیدا ہوا طریقۂ علاج یہ تھا کہ مریض کی حالت اُن کا بیٹا بیان کرتا تھا اور وہ
تشخیص کرتے تھے، اور نسخہ بتلاتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ باوجود نابینا ہونے کے اُنکی رائے کبھی خطا
نہیں کرتی تھی۔ اعیان، ملوک اور خواص نے اُن سے طب حاصل کی۔ اور جو منافع اُن سے
پائے اُسکے سب معترف تھے۔

علم طبیعی اور ما بعد الطبیعیات میں علمائے اندلس کو خاص شہرت حاصل ہے۔ جو لوگ کہ
ان علوم میں بہت مشہور ہوے اُن میں سے ابن النباش البتجانی۔ ابو عامر بن امیر ابن ہود اور
ابو الفضل بن حسدی الاسرائیلی ہیں۔ علم طب کی یہ حالت تھی کہ ممالک مشرقیہ کے لوگ کبھی
اندلسیوں کی گرد تک اس علم میں نہیں پہونچے۔ سب سے پہلے جن کو اندلس میں طب میں
شہرت حاصل ہوئی وہ احمد بن ایاس قرطبہ کے رہنے والے تھے، اور دوسرے محمد بن عبد اللہ
الاوسط، المعروف بہ حرانی۔ انھیں میں یحییٰ بن اسحٰق تھے جو الناصر لدین اللہ کے وزیر بھی تھے،
اور علاج معالجہ بھی کرتے تھے۔ سعید بن عبد الرحمن بن محمد بن محمد بن عبد ربہ، جو امیر ہشام بن عبد الرحمن
الداخل کے غلام اور احمد بن محمد بن عبد ربہ مشہور شاعر اور مصنف العقد کے بھتیجے تھے۔ طب کے
علاوہ حرکات النجوم، ہواؤں کے تغیرات، اور ہواؤں کے چلنے کے فن میں انکو کمال حاصل تھا۔
عمر بن بریق، اصبغ بن یحییٰ اور احمد بن حکم بن حفصون طبیب نبیل دقیق النظر اور منطق
میں بے نظیر تھے۔ علوم فلسفہ کے اکثر اصناف کے فاضل تھے۔ محمد ابن تلیخ اور ابو الولید محمد
بن الحسین، المعروف بہ ابن الکنانی طب میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور علاج کرنے میں
لاثانی سمجھے جاتے تھے۔ عبد الملک الثقفی گو عالم علوم ہندسہ تھے، مگر اُن پر طب اس طرح
غالب آئی کہ اُسی کے ہو رہے اور اسی میں بڑی شہرت پائی۔ عمر اور احمد ابنا یونس الحرانی
بہت بڑے طبیب تھے۔ محمد بن عبدون الجبلی حساب اور ہندسہ کے عالم تھے۔ پھر طب کا شوق
ہوا، اور اس میں کمال حاصل کیا۔ سلیمان بن حسان، المعروف بہ ابن جلجل، عبد اللہ ابن اسحٰق
المعروف بہ ابن الشناعۃ المسلمانی الاسرائیلی، ابو عبد اللہ محمد بن الحسین المعروف بہ ابن الکنانی
المنفرد پایہ کے طبیبوں میں سے ہیں آخر الاسم منطق نجوم اور اکثر علوم فلسفہ میں ماہر کامل
تھے۔ ابو عرب یوسف بن محمد طب کے محققین میں مشہور آدمی ہیں۔ ۴۲۳ھ میں انتقال کیا۔

اور مشہیر بزرگوں میں سے ایک احمد بن ابراہیم الانصاری طلیطلہ کے رہنے والے ہیں۔ فرائض وحساب کے بہت بڑے عالم تھے۔ انکا پڑھانا مشہور تھا۔ عدد و ہندسہ پڑھاتے تھے۔ ۵۹۰ھ میں انتقال کیا۔ ابو عثمان سعید بن البغونش علم ہندسہ و عدد و طب کے بڑے فاضل تھے۔ ۴۴۴ھ میں انتقال کیا۔ وزیر ابو المطرف عبد الرحمن اللخمی نے جالینوس اور ارسطاطالیس وغیرہ فلاسفہ کی کتابوں کا خوب ہی مطالعہ کیا تھا۔ ادویہ مفردہ کے اثرات وغیرہ پر اُنھوں نے خاص طور پر محنت کی تھی۔ اس معاملہ میں اُنکے زمانہ کا کوئی طبیب اُن کو نہیں پہونچا۔ ادویہ مفردہ پر اُنکی ایسی نفیس کتاب ہے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔ اس میں اُنھوں نے دیسقوریدوس اور جالینوس کی کتابوں کا، جو ادویۂ مفردہ پر ہیں خوب استنباط کیا تھا۔ طب میں تو اُنکو وہ کمال حاصل تھا کہ جسکو سُن دیکھکر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ علاج کا طریقہ ہی عجیب تھا۔ جہاں تک ہو سکتا تھا مریض کو دوا نہیں کھلاتے پلاتے تھے بلکہ غذا میں رد و بدل کرتے تھے اور وہی علاج ہوتا تھا۔ اگر اس سے نفع نہ دیکھتے تو دوا دیتے۔ مگر جہاں تک ہو سکتا مفرد۔ مجبوری ہو جاتی تو دو یا تین دواؤں سے زیادہ نسخہ کو ترکیب نہ دیتے تھے؛ بلکہ اکثر وہی دوائیں ہوتی تھیں۔

ابو مروان بن زہر الاشبیلی، ابو محمد عبد اللہ بن محمد، المعروف بہ ابن الذہبی اور ابو عبد اللہ محمد البجائی، المعروف بہ ابن النباش، طب میں تو لاثانی تھے ہی، علم طبیعی اور مابعد الطبیعہ میں قابل ذکر قابلیت رکھتے تھے۔ اخلاق، سیاست اور منطق میں محقق مانے جاتے تھے۔ جن لوگوں نے کہ طب، فلسفہ، ہندسہ و منطق میں یدطولیٰ حاصل کیا اُن میں ابو الحسن عبد الرحمن بن خلف بن عسا کر قابل ذکر ہیں۔ یہ عمل ید (جراحی) بھی خود ہی کرتے تھے۔ مختلف اعمال لطیفہ اور صناعات دقیقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔

اندلس میں علم نجوم کا مسلمانوں کے آنے ہی کے وقت سے رواج ہو گیا تھا، جو سیکڑوں برس قائم رہا۔ جو لوگ کہ احکام نجوم میں مشارٌ الیہ ہیں اُن میں ابوبکر یحییٰ بن احمد، المعروف بہ ابن الخیاط، اور ابو مروان الاستجی ہیں۔ موخر الاسم اس فن میں محقق سمجھے جاتے تھے۔ علماے اوائل و اواخر کی کتابیں اُن کو ازبر تھیں۔ تسییرات اور مطارح الشعاعات میں تو واقعی اُنکو کمال تھا۔ اصول صنعت پر اُن کا ایک رسالہ بہت مشہور تھا۔ متقدمین سے کوئی اس اصول پر اُس سے بہتر نہ لکھ سکا۔

ابو الاصبغ عثمان القرشی قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ یوں تو اور کئی علوم میں وہ فائق تھے، مگر اُنکو نجوم کا اتنا شوق ہوا کہ اُنکی شہرت اسی فن میں ہوئی۔ عبد الرحمن ابن وافد اللخمی طلیطلہ کے ہاشندے

تھے، مگر بعد میں قرطبہ اٹھ آئے تھے۔ یہاں انھوں القاسم خلف بن عباس الزہراوی سے طب حاصل کی اور اس فن میں متقدم مانے جانے لگے۔ طب کے ساتھ ہی وہ فقہ کے بڑے عالم ہیں۔ فن زراعت پہ اُن کا ایک مجموعہ نہایت مفید تھا اس فن میں اُنکا علم مسلم تھا۔ امیر المامون بن ذی النون کے مشہور باغ میں، جو طلیطلہ میں تھا، ان ہی نے اپنی نگرانی میں درخت لگوائے اور خیاباں بنوائے تھے۔ ۵۶۰ھ میں انتقال کیا۔ ایک صاحب محمد بن عیسیٰ ابن بنیق ابو عامر، باشندۂ شاطبہ کا اکثر ذکر آتا ہے۔ ابو العلا ابن زہر اشبیلی کے طب اور ادب میں شاگرد ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انکو چنداں شہرت نصیب نہ ہوئی اور یہ مشہورین میں شامل نہیں کیے جاتے۔ اسکی وجہ سمجھنے سے کم از کم میں اپنی کم استعدادی کی وجہ سے قاصر ہوں۔ انکا سال وفات ۵۴۷ھ ہے۔ محض اتنی سی بات سے کہ اُنکا سال وفات مذکور ہوا، یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مشہور ہو گئے ہونگے۔ ایام دولتِ خلیفہ الناصر لدین اللہ میں سلیمان ابو بکر بن تاج اور ابن ام المومنین اور ابو بکر احمد بن جابر اور ابو عبد الملک الثقفی اطبائے مشاہیر میں سے تھے۔ موخر الذکر ادیب بھی تھے اور کتاب اقلیدس کے بڑے ماہر اور علم مساحت کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ ہارون بن موسیٰ الاشبولی اور عبد الرحمٰن بن اسحٰق بن الہثیم مشہور طبیب ہیں۔ زمیلی کا مطب مریہ میں بہ ایام دولت ابن صمادح خاص شہرت رکھتا تھا۔ ابن سحون ابو بکر حامد کا نام بھی شہیر لوگوں میں آتا ہے۔ ابو جعفر بن احمد بن حسدائی طب اور منطق میں آیۃ من آیات اللہ سمجھے جاتے تھے۔ ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز البکری مرسیہ کے رہنے والے ہیں۔ ملک اندلس کے اکابر و اعیان میں اُنکا شمار تھا۔ ادویہ مفردہ کے معاملہ میں فاضلِ اجل سمجھے جاتے تھے۔ ابو جعفر الغافقی، شریف محمد بن محمد الحسینی، خلف ابن عباس الزہراوی اور ابن بکلارس طب میں اکابر علمائے اندلس میں سے تھے۔ یہی حالت ابن الصلت اُمیہ بن عبد العزیز ساکن دانیہ (شرقی اندلس) کی تھی۔ اُنکو طب کے علاوہ اور علوم میں بھی دستگاہ تھی۔ منطق اور موسیقی میں تو وہ اپنے زمانہ کے یگانہ تھے۔ عود بجانے میں کوئی شخص اُن کا مماثل نہ تھا۔

اطبائے حاذق کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ میں اور اطباء کا آگے چل کر پھر ذکر کروں گا۔ مگر یہ لوگ وہ ہیں کہ جو طبیب ہی نہ تھے بلکہ اور علوم کے فاضل جلیل تھے۔ ضمنی طور پر طب میں بھی شہرت پا گئے تھے۔ لیکن ان بزرگوں کے نام گنانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند عیسائی اور یہودی اطبا کا نام بھی لے دیا جائے۔

جواد الطبیب نصرانی امیر محمد بن عبد الرحمٰن الاوسط کے زمانہ میں نہایت مشہور طبیب تھے۔

ایک لعوق، دواء الراہب اور کئی شربت اور سفوف انکی طرف منسوب تھے۔ خالد ابن رومان نصرانی قرطبہ میں مطب کرتے تھے۔ فصد خود دیتے اور عمل جراحی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ اُنکے مطب میں مریضوں کے لیے سیکڑوں کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ عمران بن ابو عمرو اور اسحق دونوں عیسائی تھے۔ یہ بھی قرطبہ ہی میں مطب کرتے تھے۔ تجربہ کار طبیب تھے۔ عمل جراحی خود کرتے تھے۔ لوگ اُن سے بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔ اُنکے تجربات طبی کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ اگر انکو بیان کرتا ہوں تو طول ہوا جاتا ہے مختصر یہ ہے کہ اپنے زمانہ میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ منحم بن الفوال یہودی سرقسطہ کے رہنے والے تھے۔ طب میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ منطق اور سائر علوم فلسفہ میں انکی قابلیت مسلم تھی۔ مروان بن جناح یہودی ہیں۔ لسان عرب و یہود، منطق اور طب میں مسند الیہ تھے۔ اسحق بن قسطار یہودی اصول طب میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ اسکے علاوہ منطق میں باکمال تھے۔ اکثر آراء فلاسفہ از بر تھیں لغت عبرانی میں خاص طور پر مشارٌ الیہ تھے۔ فقہ یہود میں اُنکی یہ حیثیت تھی کہ احبار میں اُنکا شمار ہے۔ حسدائی بن اسحق بھی یہودیوں سے ہیں۔ شریعت موسوی کے بڑے علماء میں سے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ فقہ و تاریخ یہود کی اندلس میں اُن ہی نے احیاء کیا تھا۔ اُن سے پہلے فقہ کے مسائل اور اعیاد کی تاریخوں میں اکثر اختلاف رہا کرتا تھا۔ بغداد سے دریافت کرکے یہ سب باتیں طے ہوتی تھیں مگر حسدائی کے وجود سے یہ تمام دقتیں طے ہوگئیں اور وہی مفتی یہود ہوگئے۔ اُنکے انتقال کے بعد بھی مدتوں اُن ہی کے فتاویٰ پر عمل ہوتا رہا۔ یہ طبیب بھی بڑے پایہ کے تھے۔ سرقسطہ کے رہنے والے ایک اور حسدائی، ابفضل نامی، اندلس کے بیت الشرف الیہود سے تھے۔ اکثر علوم کے فاضل تھے اور اکثر معارف کے کامل تھے۔ لسان عرب، شعر و بلاغت میں اُن ہی کا قول مستند تھا، علم عدد و ہندسہ، نجوم و موسیقی میں کمال حاصل تھا منطق کے فاضل تھے۔ مناظرہ میں بڑی شہرت تھی۔ طب کے علاوہ علم طبیعی میں بھی بھی تبحر رکھتے تھے۔ متصوفین میں شیخ الاکبر محی الدین بن عربی صاحب فتوحات مکیہ کا نام لے دینا کافی ہے۔ ان کا مزار دمشق میں ہے۔

ابو العلاء بن زہر علوم اوائل و طب میں مشہور شخص تھے۔ ابو مروان بن ابو العلاء کا شمار بڑے اطباء کاملیں میں ہے۔ حفید ابو بکر بن زہر اکثر علوم کے فاضل تھے۔ خاصکر طب میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ابو الحفید محمد بن ابو بکر بن زہر اور ابو جعفر بن ہارون الترجالی اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ علوم حکمیہ میں محقق تھے۔ کتب ارسطاطالیس وغیرہ حکماء متقدمین اکثر مطالعہ میں رکھتے تھے۔ طب میں فاضل تھے۔ امراض چشم میں اُن کا علاج مشہور تھا۔ ابو الحجاج یوسف بن موراطیر طب میں بہت بڑے فاضل تھے۔ علوم دین کے ماہر کامل تھے۔ ادیب

تھے - شاعر تھے - انکے بھانجے ابو عبداللہ بن یزید اور ابو مروان عبدالملک بن قبلال اور ابو اسحٰق ابراہیم الدانی شفاخانۂ قرطبہ کے امین اور ہاؤس سرجن تھے۔ اُنکے دو بیٹے اور ابو یحییٰ بن قاسم الاشبیلی شربت اور معجونیں بناتے تھے۔ خلیفۂ منصور یہ چیزیں ان ہی کے یہاں سے خریدتے تھے۔

افسوس ہے کہ یہ تحریر بہت طویل ہوئی جاتی ہے، حالانکہ میں نے صرف اجمالی فہرست لکھی ہے۔ نہ ان میں فلسفیان اندلس کے پورے نام ہیں نہ علماء دین کے، نہ مورخین کے، نہ اُن عورات کے جن کے مقابلہ میں بڑے بڑے مردِ میدانِ علم کانپتے تھے، نہ اُن بادشاہوں کے جو خود بڑے جیّد عالم، فلسفی، ادیب، شاعر، طبیب وغیرہ تھے اور علماء کے قدردان۔ صوفیوں میں میں نے صرف ایک بزرگ کا نام لیا ہے، اور وہ بھی تبرکاً۔ میری سیری نہیں ہوئی اور ناظرین اتنے اُکتا چلے ہونگے کہ مجھ سے نفرت ہوگئی ہوگی۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں اُنکو ان بزرگوں سے بھی نفرت نہ پڑھ جائے۔ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہے اور موت اور مکروہات نے فرصت دی اور رجال الاندلس نکل آئی تو شاید اکابر علماء اندلس کی ارواح طیبہ سے مجھے کچھ داد مل جائے؛ ورنہ مسلمانان ہند سے مجھے جو توقع رکھنی چاہیے وہ محتاج بیان نہیں۔

شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ آیا ان میں سے اب بھی کسی کے نشانات باقی ہیں یا نہیں؟ اُنکی تشفی کے لیے التماس ہے کہ آج پندرہ سولہ برس ہوگئے کہ میں ہندوستان میں بیٹھا ہوا اُنکی قبریں ڈھونڈھ رہا ہوں، مگر نہیں ملتیں۔ جو حضرات کہ اس زمانہ میں اسپین ہو آئے ہیں اُن سے پوچھتا ہوں تو جواب نہیں پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کی علوِشان کے مقابلہ میں اپنی گمنامی کو دیکھتا ہوں تو اسکا بھی افسوس نہیں ہوتا کہ "بات بھی کھوئی التجا کرکے" اللہ بس باقی ہوس۔ اگر کوئی صاحب یہ سوال کریں کہ آخر نشان بھی کیوں مٹ گئے تو میں عرض کرونگا کہ میری کتاب مولدین ملاحظہ فرمائیے۔ اگر اتنی بھی فرصت نہیں تو مختصر سا جواب یہ ہے کہ یہ عنایت ہے شدھی اور سنگھٹن کی، جو آپ کے ہندوستان میں اس دعوے کے ساتھ جاری و ساری ہے کہ "ہم مسلمانوں کے لیے ہندوستان کو اسپین بنا دیں گے"۔

محمد خلیل الرحمٰن (مترجم اخبار الاندلس)

---

۵ (حاشیہ صفحہ [illegible]) صوبۂ [illegible] میں ایک قصبہ کا نام بھی مورا طیرہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انکے والد کا نام قصبہ ہی کا نام کیوں ہے۔ ایسی مثال مجھے ابھی تک کوئی اور نہیں ملی۔ تحقیق مشکل معلوم ہوتی ہے (منہ)

عربی ہندسے

میرے ایک دوست کو جو ماشاءاللہ ذی علم اور بافہم ہیں ایک جیبی گھڑی کی ضرورت تھی۔ اُنھوں نے بمبئی کے ایک کارخانے سے فہرست منگائی اور میری رائے سے ایک گھڑی پسند کی۔ جسکے متعلق فہرست میں لکھا تھا کہ وقت بتانے کے لیے اُس پر بجائے رومی ہندسوں کے عربی ہندسے ہیں۔ چنانچہ کارخانے کو فرمایش بھیجکر وہ اپنے گھر چلے گئے۔

ایک روز نہایت منقبض چشم و ابرو کے ساتھ غریب خانے پر آئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے "دیکھیے یہ بے ایمان تاجر کس قدر جھوٹ تھوپتے ہیں۔ آپ کی منتخبہ گھڑی محض اسلیے منگائی گئی تھی کہ اُس پر ہندسے 'عربی' ہوں گے۔ مگر آئی تو وہی سڑیل انگریزی ہندسے۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔" یہ کہتے ہوے اُنھوں نے گھڑی نکالنے کو جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے مسکرا کر کہا:۔

"مگر گھڑی پر ہندسے تو 'عربی' ہی ہیں"

وہ۔ "تو میں غلط کہہ رہا ہوں؟" (گھڑی نکال کر) "یہ بھی ملاحظہ کیجیے"۔

میں۔ (بغیر گھڑی دیکھے) "معاف فرمائیے آپ غلط کہہ نہیں رہے ہیں غلط سمجھ رہے ہیں"۔

وہ۔ (بگڑ کر) "اس میں سمجھنے سمجھانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ گھڑی کے ڈائل پر انگریزی ہندسے کیڑوں کی طرح بلبلا رہے ہیں مگر آپ ضد کیے جاتے ہیں کہ مرغی کی ایک ٹانگ کی طرح ہندسے تو "عربی" ہی ہیں اور لطف یہ کہ گھڑی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھی۔ مجھے سخت رنج ہے کہ آپ مجھے جھٹلا رہے ہیں"۔

میں۔ "آپ تو فرما چکے کہ اس میں سمجھنے سمجھانے کا کوئی سوال نہیں، مگر میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں ضد کرنے یا جھٹلانے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اگر آپ میری گزارش کو جو کسی قدر صبر آزما اور خاموشی طلب ضرور ہوگی اتنی غور سے سُن لیں تو یقین ہے کہ غلط فہمی دور ہو جائے گی اور آخر میں آپ کو نہ اپنے متعلق جھوٹا سمجھے جانے کا شبہہ رہیگا نہ میرے متعلق ضدی اور سخن پرور ہونے کا"۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں میرے دوست نہایت سمجھدار ہیں۔ اُنھوں نے میری گزارش کو صبر و سکوت کے ساتھ سننے کا وعدہ کیا۔ اور میں نے گزارش شروع کی۔ دوران گفتگو میں دو ایک مرتبہ سلیٹ پنسل کے استعمال اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور چند اور سرخ اور سبز کاہی جلدوں کی

کتابوں کی ورق گردانی کا اتفاق ہوا

انسان نے جب دَورِ توحش سے گزر کر دَورِ تمدن کی سرحد میں قدم رکھا تو اُسے مقدار کے صحیح اندازے یعنی گنتی شمار کی ضرورت داعی ہوئی جسکے یاد رکھنے میں ابتداءً تو اُس نے حافظے سے کام لیا مگر جب کتابت کا رواج ہوا تو گنتی ہر زبان کی بولی میں بالفاظہا لکھی جانے لگی۔ جب حساب کتاب کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہوا اور اس طریقہ میں دقت محسوس ہوئی تو مختلف طور پر مختصر طریقے اختیار کیے گئے۔ ہمیں یہاں علم حساب کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں لہذا اجمالاً و ایجازاً عرض کرتے ہیں کہ مثلاً عبرانی اور یونانی زبان بولنے والی قوموں میں گنتی لکھنے کے لیے عبرانی اور یونانی ابجد کے حروف استعمال ہونے لگے۔ عبرانی ابجد میں بائیس اور یونانی میں چوبیس حروف تھے۔ دونوں زبانوں کے حروف کے تین تین حصے کیے گئے۔ اور ہر ایک کے پہلے حصے سے اِکائیوں کا، دوسرے سے دہائیوں کا اور تیسرے سے سینکڑوں کا کام لیا جانے لگا۔ کمی پوری کرنے اور دیگر امتیازات کے لیے خاص خاص علامتیں مقرر ہوئیں۔ مثلاً عبرانی زبان کا آٹھواں حرف آٹھ کے لیے اور سترہواں حرف اسّی کے لیے مقرر ہوا۔ اسی طرح یونانی کا آٹھواں حرف آٹھ کے لیے اور سترہواں حرف اسّی کے لیے مقرر ہوا۔ اِنھیں حروف کو جوڑ کر سینکڑوں سے ہزاروں بنائے جاتے تھے۔ چونکہ ان زبانوں میں کتابی حروف بھی وہی تھے لہذا اعداد و شمار کے پڑھنے میں جو دقتیں پیش آتی ہوں گی آج اُن کا اندازہ کر کے وحشت ہونے لگتی ہے۔

رومیوں نے بالکل ہی ابتدائی عقل کا اظہار کیا یعنی گنتی لکھنے میں لکیروں سے کام لیا۔ چنانچہ ایک کے لیے ایک کھڑی لکیر۔ دو کے لیے دو۔ تین کے لیے تین۔ اور چار کے لیے چار کھڑی متوازی لکیریں مقرر کیں۔ پانچ کے لیے لکیریں تو پانچ رکھیں مگر اختصاراً جمع اس طرح کیں V پانچ کے داہنی طرف ہر شمار پر ایک لکیر بڑھاتے گئے یہاں تک کہ پانچ اور تین آٹھ۔ نَو سے پہلے دس کا حال سن لو کیونکہ دُنیا کے دستور کے خلاف یہاں منزلِ اولیں کی تعمیر سے قبل دو منزلہ بنایا گیا ہے۔ دس پانچ کا دُونا ہوتا ہے لہذا پانچ کے دو عدد اُلٹے سیدھے۔ تلے اوپر رکھ کر دو پانچ اس طرح بنائے X۔ اب چونکہ نَو کا عدد دس سے ایک کم ہے لہذا دس کے بائیں طرف ایک لکیر بنانے سے ایک کم دس یعنی نو ہوئے۔ اُسکے بعد دس۔ دس اور ایک (گیارہ) دس ایک ایک (۱۲) .... دس اور پانچ (۱۵) دس پانچ ایک (۱۶)

.... دس ایک کم دس (۱۹) - دس دس (۲۰) ..... دس دس دس اور ایک کم دس (۳۹) اب پھر پہلی منزل سے پہلے دو منزلہ بنا یعنی سو کے لیے C مقرر ہوا - اسکے اوپر والی لکیر کم کرنے سے L رہ گیا جو پچاس کے لیے مقرر ہوا - اور چونکہ چالیس کا عدد پچاس سے دس کم ہے لہذا پچاس کے بائیں طرف دس لکھ کر دس کم پچاس یعنی چالیس بنائے جسکی شکل یہ ہوئی XL - مزخرفات کا یہ سلسلہ نانوے تک یوں ہی کتر بیونت سے چلا تا آنکہ سو کے لیے جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں C (جس کی شکل بعد کو C مقرر ہوئی) پانچ سو کے لیے D اور ہزار کے لیے M مقرر ہوئی - چنانچہ اگر ہمیں اٹھارہ سو اٹھاسی لکھنا ہو تو یوں لکھیں MDCCCLXXXVIII

یہ طریقہ : صرف سلطنت روما میں بلکہ اسپین کو مستثنیٰ کرکے سارے مسیحی یورپ میں تقریباً گیارہویں صدی عیسوی تک رہا اور اب بھی اگرچہ متروک ہے مگر مفقود و معدوم نہیں - ان اعداد کو رومن کیپٹل (Roman capital) کہتے ہیں - آج بھی بعض کتابوں کی فہرست مضامین و عنوانات پر - متن کتاب کے صفحات چھوڑ کر دیباچہ اور ضمیمہ جات کے صفحات پر اور بعض گھڑیوں کے ڈائل پر یہی اعداد لکھے جاتے ہیں -

---

حساب نویسی کے اس اعجوبہ ترین طریقے پر تعجب مت کرو بلکہ تعجب اس پر کرو کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جبکہ یورپ - دنیا کے عقلِ کلُ یورپ - علم و فن کے باوا آدم یورپ - زمین آسمان کے قلابے ملانے والے یورپ - اور وقت اور محنت کی قدر و قیمت سمجھنے والے یورپ کا معیارِ علم و عقل اس درجہ پست و مبتذل تھا کہ وہ دو نہیں چار نہیں پورے چار سو برس کی طویل و عریض مدت تک اعداد کے اس گورکھ دھندے اور حساب کے اس طفلانہ پھندے ہی میں پھنسا رہا اور اپنے وقت اور چمڑے اور پیپی رس کا بے حساب و شمار حصہ ضایع و تباہ کرکے اُلٹا سیدھا اپنا کام چلاتا رہا - انصاف پسند اہلِ یورپ اب تسلیم کرتے ہیں (اور اس میں انصاف اور ہٹ دھرمی اور تسلیم اور انکار کا کیا سوال - معمولی سمجھ اور موٹی نگاہ والا آدمی تک بجائے خود سمجھ اور دیکھ سکتا ہے) کہ اعداد و شمار کی اس بھول بھلیاں کے ہوتے ہوئے یورپ علوم و فنون میں عموماً اور حساب میں خصوصاً کیا خاک ترقی کرسکتا تھا - تاریخیں پڑھو تو معلوم ہو کہ اُس زمانے میں یورپ جہالت کی ظلمات بعضہا فوق بعض میں کس قدر گھرا اور وحشت و بربریت کے اثقالاً مع اثقال کے نیچے کس درجہ دبا ہوا تھا - چنانچہ صدیوں اُسکی یہی حالت رہی تا آنکہ ایک "بکری چرانے والی" قوم نے اُسے اس دلدل سے نکالکر ترقی کی شاہ راہ پر ڈال دیا -

---

عرب کی ریگ زار اور سنگ سار سرزمین پر خدا کی رحمت کی گھنگھور گھٹا چھائی اور رُشد و ہدایت کا دھواں دھار مینہ برسا۔ جس طرح برسات کی معمولی بارش زمین کی سوتی قوتوں کو جگا کر بن کو چمن اور راغ کو باغ بنا دیتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے کروڑ ہا درجہ زیادہ رحمت خاص کی غیر معمولی بارش نے اس ملک کے باشندوں کی سوتی قوتوں کو جگا یا۔ اُنکے مردہ فضائل اور پژمردہ شمائل کو جلایا اور ان سوکھے کانٹوں سے ایسے ایسے پھول کھلائے جن کی خوشبو سے ساری دُنیا معطر ہوگئی۔

میرا مقصد حالی کے مسدس کو نثر کا لباس پہنانا نہیں مگر اسکے کہے بغیر بات نہیں بنتی کہ اسلام کی تشریف آوری سے پہلے۔ عرب علوم سے قطعًا تہی دست، فنون سے مطلقًا بیگانہ اور تمدن سے یکسر ناآشنا تھے۔ اُنکے پاس نہ حکمت تھی نہ فلسفہ۔ نہ ہیئت تھی نہ جغرافیہ۔ نہ اُنھیں بیرونی دنیا سے سروکار تھا، نہ دنیا کو اُن سے مطلب۔ کھجور اور اونٹ کہ یہی دونوں اُنکے پُرانے رفیق حیات تھے اُنکے پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کو کافی تھے۔ اِس سے زیادہ اُن کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو وہ اُنکی زبان تھی جس سے محاکات ومفاخر۔ مدح وہجا اور رجز و مراثی کے ذریعہ وہ اپنے جذبات خوب ادا کر لیتے تھے بس فقط۔ ولکن اللہ یمن علیٰ من یشآء۔ خدا کی دین میں کس کا اجارہ۔ اس جاہل اور اس گم کردہ راہ قوم ہی پر اللہ جل شانہٗ کا خاص فضل و احسان ہوا کہ اُسکی رحمت کا آخری پیغام اسی کی زبان سے اہل زمین کو پہونچایا۔ اور اُسکی معرفت کا خزانہ اِسی کے ہاتھ سے روے زمین پر لُٹا یا گیا۔ ہو الذی بعث فی الامیین رسولاً منہم یتلوا علیہم ایاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔

کتاب وحکمۃ کے آبِ حیات سے سیراب ہوکر عربوں نے دنیوی علوم و فنون کی طرف توجہ کی۔ مجھ سے مت پوچھو کہ آبِ حیات کے بعد عرق گلاب و بید مشک پینا ترقی تھی یا تنزل۔ میں واقعات کہہ رہا ہوں۔ رائے نہیں دے رہا ہوں۔ تاریخ سے پوچھو تو معلوم ہو کہ اسلام لانے کے بعد ڈیڑھ سو برس کی قلیل المیعاد مدت ہی گزرنے پائی تھی کہ اُنھوں نے اپنے علوم وفنون اور اپنی تہذیب و تمدن سے اُسوقت کی دنیاے معلوم کو مالا مال کردیا۔

اس میں شک نہیں کہ عربوں کے پہلے اُستاد یونانی تھے اور ایک یونانیوں ہی پر کیا موقوت تھا دانائی کی بات اُنھوں نے جہاں پڑی پائی اُٹھا کر گانٹھ باندھی کہ الحکمۃ ضالۃ المومن مگر اُن میں ایجاد و ترقی کا اس قدر مادہ اور تحصیل و تحقیق کا اسدرجہ ولولہ تھا کہ وہ اُتنی سی بات ہی پر جو کسی سے

معلوم ہوتی قناعت نہ کرتے بلکہ غور و فکر اور کوشش و کاوش سے اُس پر بہت کچھ اضافہ کرتے تھے۔ اُنکا ملک کتاب قدرت کا ایک کھلا اور خوشخط لکھا صفحہ تھا جسکے مطالعہ کے وہ عادی تھے۔ لہذا قدما کی تصانیف پڑھتے ہی پڑھتے بہت جلد اُن پر یہ راز کھل گیا (جسے ازمنہ متوسطہ کے علمائے یورپ پورے ایک ہزار سال کی محنت میں کہیں جاکر سمجھ پائے) کہ تجربے اور مشاہدے کو مشرح سے مشرح کتاب پر ترجیح ہے۔ تم رامپور لائبریری۔ بلکہ پٹنہ لائبریری۔ بلکہ انڈیا آفس لائبریری کی سب کتابیں چاٹ جاؤ مگر جب تک تم میں خود سوچ بچار اور تحقیق و ترقی کا مادّہ نہ ہو تمھارا دماغ لائبریری کی اُس بیجان اور بے شعور الماری سے زیادہ وقیع نہ سمجھا جائے گا جس میں کتابیں بند رکھی ہوتی ہیں۔

جب ایک گرم خون والی تازہ دَم قوم۔ علم کی تلاش میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ اُٹھے کہ نہ دن کو دن سمجھے نہ رات کو رات۔ جسکی امداد و اعانت کو سلطنت کے خزانے اور جسکی ہمت افزائی کو شاہی گھرانے موجود ہوں۔ جسکے امراء زرپاشی میں اور طلباء دماغ پاشی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اُسے حصول علم میں جس حد تک اور جس قدر جلد کامیابی ہو سکتی ہے اُسکا اندازہ تم خود کر لو میرے کہنے کی ضرورت نہیں۔

عربوں کے کسب علوم کی بسم اللہ خلیفہ منصور عباسی (۱۳۶ھ ۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ ۷۷۵ء) کے زمانہ میں ہوئی جس نے تعمیر بغداد کے بعد بعض فنون کے متعلق یونانی کتابوں کو ترجمہ کراکر عربوں کو دماغی اور ذہنی مشاغل کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ دیا۔ پچاس سال کی مدت بھی کوئی مدت ہوتی ہے۔ مگر عربوں کے کمالاتِ دماغی پر حیرت کرو کہ خلیفہ مامون الرشید عباسی (۱۹۸ھ ۸۱۳ء تا ۲۱۸ھ ۸۳۳ء) کے عہد خلافت میں وہ فلسفہ و ہیئت، ریاضی و حساب، تاریخ و اسماء الرجال، جغرافیہ و علم البلدان، علم مناظر و مرایا۔ علم الحرکات، طبعیات، کیمیا، طب، علم نباتات و حیوانات کی تدوین و تحقیق میں انتہائی مدارج طے کر چکے تھے۔ زیچیں اور تقویمیں، اصطرلاب اور دوربینیں، دنیا کے نقشے اور کرے، پانی اور ریگ کی گھڑیاں، قطب نما اور قبلہ نما، کلیں اور آلاتِ جرثقیل، تیزاب اور مرکبات کیمیائی، کتبخانے، رصدخانے اور شفاخانے بنا چکے تھے۔

عربوں نے دنیا کو یہ تماشا بھی جلد دکھا دیا کہ مکتب میں وہ جس اُستاد سے الف۔ بے پڑھنے بیٹھے تھے اُسی کو منتہی کتابیں پڑھا کر اپنے ہاتھ سے اُسکے سر پر دستار فضیلت باندھی۔ صدیوں

تک عیسائی اقوام یورپ کے معلم صرف عرب ہی تھے اور تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہے جب سے عربی تصانیف کے ترجمے یورپی درسگاہوں کے نصاب تعلیم سے خارج ہوئے ہیں۔

اگرچہ ذکر تونگری درفقیری مذاق سلیم پر گراں گذرنا چاہیے لیکن بات آگئی ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ مسلمان طلبا جب حصول علم کیلئے ممالک یورپ میں جائیں اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوں تو اہل یورپ پر (چاہے وہ اساتذہ ہوں یا تلامذہ) لازم ہے کہ اُس زمانہ کو احسانمندی کے ساتھ یاد کریں جب وہ خود قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی اسلامی یونیورسٹیوں میں طالبعلمانہ حیثیت سے داخل ہونا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ ان درسگاہوں کے دفتر اُلٹ چکے، رجسٹر درابُرد ہو چکے، مگر تاریخ کے لوح حافظہ پر ایسے بہت سے لوگوں کے نام ابھی تک ثبت ہیں جنھوں نے عربی مکتبوں کی چٹائی ہی کی بدولت یورپی یونیورسٹیوں کی کرسی پائی ہے۔

مسیحی دنیا میں پوپ کی شخصیت نہایت عظیم الشان سمجھی جاتی ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب جاری ہونے سے پہلے تو اُسکے دینی اقتدار کا یہ عالم تھا کہ دوزخ اور بہشت کی کنجی اُسی کی جیب میں رہتی تھی جسکے چاہے گناہ معاف کر دیے اور جسکی چاہے عبادتیں سلب کرلے۔ دنیوی اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بڑے گردن کش عیسائی تاجدار اپنے تاجپوش سر اُسکے قدموں پر رکھتے تھے۔ اور وہ اپنی پاپوش کی ٹھوکر سے ایک کے سر سے تاج گرا کر۔ اپنے غلام کے ہاتھ سے دوسرے کے سر پر رکھوا دیتا تھا۔

ایسی ہستیوں میں سے کم ازکم ایک ہستی کو تو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے حصول علم کی خاطر جامعہ قرطبہ میں فضلائے عرب کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ جربرٹ (Gerbert) جو پوپ سلوسٹر ثانی Sylvester II کے نام سے ۹۹۹ء سے ۱۰۰۳ء تک اریکۂ پاپائی پر متمکن رہا ہے اسلامی علوم میں یہاں تک دسترس رکھتا تھا کہ اُس نے ریاضی و ہیئت میں کئی کتابیں خود تصنیف کیں اور اپنے ہاتھ سے ایک گھڑی۔ ایک کرۂ ارض۔ اور ایک اصطرلاب بنایا۔ علم حساب و کیمیا میں جو اُس نے عربوں سے خصوصیت کے ساتھ سیکھے اُسے یہاں تک شغف تھا کہ ازمنۂ مظلمہ کا جاہل یورپ اُسے "جادوگر" کے نام سے پکارتا تھا۔ علوم و فنون کے اکثر شعبوں میں اٹلی کو باقی ممالک یورپ پر اولیت کا جو تفوق رہا ہے وہ سلوسٹر ثانی ہی کا رہین منت ہے جس نے کامیابی کے ساتھ اس سرزمین پر اسلامی علوم کی تخم ریزی کی اور اطالینیوں کے دل میں علم کی لگن لگا دی۔

Gerard of Cremona وہ طلیطلہ کی اسلامی یونیورسٹی ہی تو تھی جہاں جیرارڈ قریمونی

(متوفی ۱۱۸۷ء) اٹلی کے مدارس سے بددل ہو کر عرب اساتذہ سے پڑھنے گیا تھا اور جہاں سے بعد فراغِ
تعلیم واپس آکر اُس نے قانون شیخ کا ترجمہ کیا جو چھ سو برس تک یورپی مدارس کے طبی نصاب کا
بہترین جزو سمجھا جاتا تھا - اِسی جیرارڈ نے مجسطی کا ترجمہ کیا اور علامہ جابر بن افلح الشبیلی کی کتاب
فلکیات کی شرح لکھی -

اُسی زمانہ میں انگلستان کے بھی کم از کم دو افراد کو عربی سرچشمۂ علوم سے سیراب ہونے کا امتیاز
حاصل ہوا - ایڈیلارڈ آف باتھ (Adelard of Bath) (متوفی ۱۱۵۰ء) نے
۱۱۰۰ء سے ۱۱۲۰ء تک اپنی عمر اسلامی اسپین - ایشیائے کوچک اور وادی مصر کی سیاحت میں
گذاری - خود اُسکے ہموطنوں کا بیان ہے کہ وہ مسلمان طالب علم کے بھیس میں قرطبہ پہونچا اور وہاں سے
تحریر اقلیدس کی نقل اُڑا لایا - جسکا ترجمہ اُس نے انگلستان آکر شایع کیا اور ۱۵۳۳ء تک یہی
ترجمہ اس فن کی ہر کتاب کا ماخذ رہا - راجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۱۴ء تا ۱۲۹۴ء)
نے عربی علوم کا اکثر حصہ اُن لوگوں سے پڑھا جو براہِ راست عرب اساتذہ کے شاگرد تھے - اُس کے
تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ کیمیا، طب، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور علم مناظر و مرایا میں کامل
تبحر رکھتا ہے اور قدم قدم پر بوعلی سینا - الکندی - رازی - الفارابی - ابن الہیثم سے استناد کرتا جاتا ہے -
اُسکے فضل و کمال سے بدنصیب انگلستان اُس وقت مطلق بہرہ اندوز نہ ہو سکا - اُس نے تجویز پیش کی تھی کہ
اکسفورڈ یونیورسٹی میں السنہ و علوم مشرقیہ کا شعبہ قائم کیا جائے - جسکے لیے اُس نے خود اپنی خدمات
نذر کیں - مگر اُس زمانے میں یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کی ذہنیت کا یہ تقاضا تھا کہ اِس
"ماہر سحر و طلسمات" کی تجویز کو پاپوش حقارت سے ٹھکرا دیا جائے - چنانچہ یہی ہوا - مگر پادریوں کے
جہل و تعصب پر ماتم کرو کہ بیچارے راجر بیکن کو دس سال تک نقل و حرکت اور تحریر و تصنیف
کی آزادی سے محروم رہنا پڑا - تم نے دیکھا کہ جب عربوں میں ابن سینا، ابو العلاء معری اور ابن رشد
جیسے گستاخ فلسفی جنکی آزادی آخری سرحد تک پہونچ چکی تھی پیدا ہو کر مر بھی گئے اسکے صدیوں
بعد تک انگلستان کی آزادیِ فکر و رائے کا کیا حال تھا؟

لاحول ولا قوۃ الا باللہ - میں کہنا کیا چاہتا تھا اور کہہ کیا گیا! عربوں نے سب سے زیادہ
جس علم کی طرف اعتنا کی اور جسے پوری توجہ و کوشش اور وقت و محنت صرف کرکے معراج کمال تک پہونچایا وہ علم

ریاضی وحساب تھا جسکے بغیر ہیئت وجغرافیہ وطبیعیات وعلم الحرکات وعلم مناظر ومرایا وکیمیا کسی میں بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ کیا یہ عبرت وغیرت کا مقام نہیں کہ جس علم میں عربوں نے اتنا کمال حاصل کیا اسی میں اُن کے نام لیوا آج سب سے زیادہ بدشوق۔ تاریک دماغ۔ کند ذہن اور بطی الفہم سمجھے جاتے ہیں؟

جی چاہتا ہے کہ علم حساب۔ جبر ومقابلہ۔ تحریر اقلیدس۔ علم مثلثات۔ علم مثلثات کُروی اور علم مخروطات میں عربوں کے اجتہادات۔ اکتشافات اور ایجادات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کروں مگر اس ڈر سے کہ کہیں مجھ پر "تمدن عرب" کے گراموفون ہونے کی پھبتی نہ کہی جائے زبان روکتا ہوں۔

ابتدا میں عرب بھی گنتی کو اپنی زبان کے الفاظ وعبارت ہی میں لکھا کرتے تھے۔ مثلاً اُنتیس کو وہ اپنے الفاظ میں تسعہ وعشرون لکھتے تھے۔ جب وہ علم کی پیاس میں چاروں طرف بیابانہ دوڑ رہے تھے تو اُنکی نظر ہندی ارقام حسابی پر پڑی جس میں ہر مقدار کے لیے جداگانہ ایک مختصر اور سادہ شکل تھی اور جسکے باعث حساب میں نہایت آسانی ہوتی تھی۔ دنیا پر اُنکا یہ احسان ابدالاباد تک یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندو۔ جذبۂ تنہا خوری سے متاثر ہوکر جس چیز کو محض اپنے اعلیٰ طبقے ہی تک محدود رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنے ہی ملک کے ادنیٰ افراد تک سے چھپاتے بلکہ سیکھنے کی کوشش پر سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے اُسے لیکر اور اپنی طرف سے اُسے باقاعدہ اور سہل وسادہ بناکر ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ ان ارقام کو چونکہ عربوں نے ہندوؤں سے لیا تھا لہٰذا اُنکی دیانت واحسان شناسی ملاحظہ ہو کہ اُنکا نام ارقام ہندیہ ہی رکھا جو آگے چل کر ہندسہ ہوگیا۔ احسان شناسی کی یہی اکیلی مثال نہیں۔ یونان سے حکمت وفلسفہ کے چند سبق لیکر اُنھوں نے اپنی طرف سے اِن علوم میں جو بیش بہا اضافے کیے وہ اہل علم پر روشن ہیں مگر جب کہا تو حکمت یونانیہ اور فلسفۂ یونانیہ ہی کہا۔ اسی طرح طب کے مبادی بھی اُنھوں نے یونان ہی سے لیے مگر اس علم میں اُنھوں نے جو حیرت انگیز ترقیات و تحقیقات اور اکتشافات واجتہادات کیے وہ یونانیوں کے اچھوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھے۔ اس طب ہی کی بدولت یورپ۔ تلمذ واقتدا کی شکل میں عربوں کو پانچ سو برس تک دادِ تحسین دیتا رہا ہے۔ مگر یہ جذبۂ احسان شناسی ہی تو ہے کہ نہ صرف خود عربوں نے بلکہ اُنکے اخلاف نے۔ اور اُنکی دیکھا دیکھی اوروں نے آج تک طب یونانی ہی کہا۔

یہ ہندسے ایک سے لیکر نو تک تھے - کہا جاتا ہے کہ صفر کی قیمت اور درجہ عربوں نے خود ہی
قایم کیا کہ کسی عدد کے داہنی طرف ایک صفر بڑھانے سے اُس عدد کی قیمتِ اعتباری اپنی قیمت مطلق
سے دس گنی اور دو بڑھانے سے سو گنی ہو جاتی ہے - ان ہندسوں کی شکل و صورت عربوں نے اپنے
ہاں وہی رکھی جو ہندوؤں کے ہاں تھی، مگر چونکہ ہندوؤں کے طریقۂ کتابت کے خلاف وہ سیدھے
ہاتھ سے اُلٹے ہاتھ کو لکھتے تھے لہذا غور سے دیکھو تو نظر آئے گا کہ ابتدا ہی میں تھوڑی تبدیلی ناگزیر تھی
اسکے بعد کچھ تو مرور زمانہ سے، کچھ خوبصورتی کے خیال سے اور کچھ شانِ خط کے لحاظ سے شکل میں اور
بھی فرق ہو گیا - آج ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندسے ابتداءً خود ہندوؤں کے ہاں کس شکل کے
تھے اور اب انھیں کے ہاں ان میں کس قدر تبدیلی ہو گئی ہے - موجودہ شکلوں میں بعض ہندسے تو ملتے
ہیں لیکن بعض میں باہم گہرا اختلاف ہے اور اگر یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو کہ ابتدا میں دونوں کی شکل
ایک ہی تھی تو بعض ہندسوں میں مماثلت - بادی النظر میں بہ تکلف ہی معلوم ہو سکے گی - ہندی اور
عربی ہندسوں کی موجودہ شکلیں ذیل میں دکھائی جاتی ہیں :-

ہندی شکل	९	८	७	६	५	४	३	२	१
عربی شکل	٩	٨	٧	٦	٥	٤	٣	٢	١

یہ بتانا کہ عربوں میں سب سے پہلا ریاضی داں کون گذرا ہے اور اُسکے بعد علوم ریاضیہ میں
کس نے کہاں تک ترقی کی اُس مورخ کا کام ہے جو اسلامی علوم حساب کی تدریجی تفصیلی تاریخ لکھے۔
ہمیں خصوصیت کے ساتھ جس مُہندس کا نام لینے کی ضرورت ہے وہ الخوارزمی ہے -

ابو جعفر عبداللہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی - دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں پیدا ہوا
اور تیسری صدی کے کسی حصے تک زندہ رہا - خلفاے عباسیہ کے ابتدائی دَور نے علوم و فنون
کی کھیتی کے لیے ساون بھادوں کے مینہ کا کام دیا ہے - اُس زمانے میں ذاتی شوق علم کے
علاوہ سلطنت کی قدردانی اور ہمت افزائی کے باعث - علم کا چرچا گھر گھر تھا - ان ہی گھروں میں
سے کسی گھر میں الخوارزمی بھی پیدا ہوا - رسمی علوم کے کل شعبوں کی تحصیل سے فارغ ہو کر اس نے
ہیئت و ہندسہ کی طرف خاص توجہ کی - خلیفہ ہارون الرشید ہی کے زمانے میں الخوارزمی کے فضل
و کمال کی شہرت نے اُسے امثال و اقران کی زبان ہی سے راس المنجمین اور امام المہندسین کا

خطاب دلوا دیا تھا۔ اُس نے علم حساب پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس علم کے متعلق نئے نئے قاعدے درج کیے جو آج معمولی ہونے پر بھی معمول بہ ہیں۔ جب خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ھ ۸۱۳ء تا ۲۱۸ھ ۸۳۳ء) کا دورِ خلافت آیا تو اُس نے تخت پر بیٹھتے ہی اُسے طلب فرمایا اور اپنے دربارِ علم کا صدر بنایا۔ چونکہ اُسی زمانے میں الخوارزمی نے علم جبر مقابلہ کی تدوین کی تھی لہذا خلیفہ نے حکم دیا کہ اس علم پر بھی ایک عام فہم کتاب لکھے۔ چنانچہ اُس نے "کتاب الجبر والمقابلہ" لکھی اور سبب تالیف یہ لکھا کہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو بحکم امیر المومنین المامون لکھی گئی۔ یورپ کی قدردانی کو دعا دو کہ آج بھی اس کتاب کی ایک نقل اکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔

جبر مقابلہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے پروفیسر کیلینڈ۔ ایڈنبرا یونیورسٹی کا معلم ریاضیات لکھتا ہے:- "دو کتابیں عربی سے اطالوی زبان میں پہلے ترجمہ کی گئیں۔ پہلی کتاب جبر مقابلہ کے متعلق تھی اور دوسری علم حساب کی سب سے پرانی وہ عربی کتاب تھی جسے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے تصنیف کیا تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مذکور غلطی سے جبر مقابلہ کی کتاب کو کسی دوسرے مصنف کی تصنیف سمجھتا ہے حالانکہ اسی بحث پر خود پہلے لکھ چکا ہے کہ عربوں میں جبر مقابلہ کا موجد محمد بن موسیٰ الخوارزمی ہے اور اُس نے اِس علم پر سب سے پہلے ایک کتاب لکھی جسکا پہلا ترجمہ اطالوی زبان میں ہوا۔ اس بحث کو دوسرے مصنفین نے صاف کر دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ الخوارزمی ہی وہ خوش نصیب شخص ہے جسکی تصانیف متعلق حساب و جبر مقابلہ کے ترجمے سب سے پہلے لاطینی زبان میں ہوئے جنھیں پڑھ کر یورپ کی آنکھیں کھل گئیں اور اُسے اسلامی علوم و فنون کا چسکا پڑا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ الخوارزمی کی حساب اور جبر مقابلہ کی کتابوں کا ترجمہ کس شخص نے اور کس سنہ میں کیا۔ کیونکہ اس بارے میں اقوال مختلف و متضاد ہیں۔ مگر میری نظر میں یہ رائے قابلِ اعتنا ہے کہ ان کتابوں کے ترجمے کے لیے پہلا قلم جو اُٹھایا گیا وہ اُسی شخصیت کے "مقدس" ہاتھ میں تھا جسکا حال تم ابھی سُن چکے ہو۔

علم حساب میں ایک چیز ہے جسے لوگارتھم (Logarithm) کہتے ہیں یعنی کسی عدد کا وہ گھاتم قوت کا وہ درجہ ہے جس تک کسی اساسی عدد (Base) کو بڑھا کر اُس اصلی عدد کے برابر کیا جائے۔ مثلاً

ہمیں ۸۱ کا لوگے رتھم دریافت کرنا ہے۔ اب چھوٹے سے چھوٹا عدد جس پر ۸۱ تقسیم ہو سکے ۳ ہے جو اُس عدد کا اساسی عدد قائم کیا گیا۔

اب ۳ ضرب ۳ ضرب ۳ ضرب ۳ = ۸۱

∴ ۸۱ = ۳^۴

یعنی ۸۱ کا لوگے رتھم اساسی عدد ۳ کے لیے ۴ ہے۔

اسی طرح ۱۰۰۰ کا لوگے رتھم اساسی عدد ۱۰ کے لیے ۳ ہے۔

اس لفظ لوگے رتھم کی اصلیت جانتے ہو؟ نہیں جانتے تو سنو۔ الخوارزمی نے علم حساب پر جو کتاب لکھی اُس میں اس جدید قاعدے کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ سمجھایا۔ جب اسکا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا تو اہل یورپ چونکہ عربی اسماء اور عربی الفاظ کا صحیح تلفظ اور صحیح املا نہیں کرسکتے تھے لہذا ترجمہ میں الخوارزمی کی جگہ الگورتھم (Algorithm) لکھ گیا جو اس قاعدے کا نام ہی پڑ گیا، اور رفتہ رفتہ لوگے رتھم ہوگیا۔

اگر تمھیں اسکے قبول کرنے میں پیش و پس ہو، تو مجھ پر لازم ہے کہ تمھارا اطمینان کردوں۔ اس امر کے متعلق کہ اہل یورپ عربی ناموں کی صورت کہاں تک بدل دیتے تھے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

۱- ابن ماجہ Avempace اَوِم پیس ۶- ابوالمظفر Albulafar البولفر
۲- ابن رشد Averroes اَوِرروس ۷- ابومشعر Albumezar البومیزار
۳- ابن سینا Avicenna اَوِی سنا ۸- البتانی Albategnius البا ٹیگ نی اس
۴- ابوالحسن Alboacen البواسین ۹- الہیثم Alhazen الہازن
۵- ابوالقاسم Albucasius البوکیسی اس ۱۰- المؤید Alombuadad الوم بواڈاڈ

یہ نام ایسے مشاہیر کے ہیں جنکے حالات عربی کتابوں کے علاوہ وبسٹر کی بڑی ڈکشنری، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، اور سید امیر علی کی تاریخ میں اس صراحت کے ساتھ ملیں گے کہ اصلی نام یہ ہے مگر یورپ میں اس نام سے پکارے جاتے تھے۔ اگر اب بھی اطمینان نہ ہوا ہو تو قطعی ثبوت بھی حاضر ہے:-

ایف۔ جی افلالو (F. G. Aflalo) اپنی کتاب تلمیع ہلال (Regilding the Crescent) کے صفحہ ۹۵ پر لکھتے ہیں:-

:: His works on Arithmetic & Algebra were translated into Latin by the name of Algorithm (which should have been Algoriom)..... His name is the origin of the word "logarithm."

جب الخوارزمی کی کتابوں کا اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا تو مضامین کے ساتھ ارقام ہندسہ بھی یورپ پہونچے۔ اہل یورپ، جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اُسوقت رومی لکیروں کے بھنور بھنور جال میں پھنسے ہوے تھے۔ اُنھوں نے حساب نویسی کے اس طریقے کو دیکھا تو بہت سہل اور سادہ پایا۔ لہٰذا اپنے بدقوارہ و بیکار طریقۂ حساب نویسی کی جگہ آہستہ آہستہ انھیں ہندسوں کو اپنے یہاں رواج دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آج روے زمین کے تمام مہذب ممالک میں انھیں کا رواج ہے۔ ہم تینوں قسم کے ہندسوں کو پھر یہاں درج کرتے ہیں:

१	२	३	४	५	६	७	८	९	ہندی خط میں
١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨	٩	عربی خط میں
1	2	3	4	5	6	7	8	9	انگریزی خط میں

مثل مشہور ہے "جیسا بوؤ ویسا کاٹو"۔ کم از کم اس موقع پر تو یہ مثل بالکل صادق آئی۔ عربوں نے ان ارقام کو ہندوؤں سے لیکر ان کا نام ارقام ہندیہ (ہندسہ) رکھا تھا۔ اب جو یورپ والوں نے انھیں عربوں سے لیا تو عربی ہندسے یعنی Arabic figure, Arabic numeral, Arabic notation ہی کہتے ہیں۔ اسکے ثبوت میں اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

" ہمارے مروجہ اعداد عربی ہندسے کہلائے جاتے ہیں جو یورپ میں عربوں کے ذریعہ رائج ہوے۔ " (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ جلد ۲ ص ۵۲۵)

۲۔ "گنتی لکھنے کے جو طریقے عربی ہندسوں کے رواج سے پہلے یورپ میں رائج تھے، وہ نسبۃً بہت

ہندسے تھے"۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۲ صفحہ ۵۲۶)

۳۔ "عربی ہندسوں کو یورپ میں عربوں نے پہونچایا"۔ (نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۳۱)

۴۔ "عربی ہندسے یورپ میں عربوں کی وساطت سے رائج ہوئے ..... چھاپے کی ایجاد کے بعد اُنکا رواج عام ہوگیا۔ اسلیے کہ رومی اعداد کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسان اور سادہ ہیں" (پیرس سائیکلوپیڈیا صفحہ ۱۲۲)

۵۔ "عربی ہندسوں کے رواج سے قبل۔ یورپ میں علم حساب میں کوئی قابل اعتنا ترقی نہ کرسکا"۔ (پیرس سائیکلوپیڈیا صفحہ ۱۲۳)

۶۔ "وہ ایک عرب۔ الخوارزمی ہی تو تھا جس نے ہمارے ہندسے بغداد سے یورپ پہونچائے اور ہمیں بھدّے، کاواک اور جہالت کی یادگار رومی اعداد سے نجات دلائی" (العنجی۔ انفلالو۔ تلمیع ہلال صفحہ ۹۲)

خدا کا شکر ہے کہ میرے دوست نے اعتراف کیا کہ گھڑی کے ڈائل پر انگریزی ہندسے کیڑوں کی طرح بلبلانے کی جگہ اب اُنھیں عربی ہندسے جگنو کی طرح جگمگاتے نظر آنے لگے اور اب اُنھیں نہ اپنے متعلق جھوٹا سمجھے جانے کا شبہ ہے نہ میرے متعلق مندی یا سخن پرور ہونے کا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ضریبۃ السادات

خاکسار مسئون العلی

بودھا منو۔ یکم محرم الحرام ۱۳۴۴ھ

کیا بلا عشقِ تماشا ساز ہے
جس کا ہر انجام اک آغاز ہے

موت پر حیرانی و حیرت ہے کیا؟
زندگی خود اک طلسمِ راز ہے

روح ہے اک نغمۂ سازِ الست
جسمِ خاکی پردۂ آواز ہے

زندگی کیا ہے نمودِ عاشقی
عشق کیا ہے حسن کا آغاز ہے

لب پہ اسے صیاد آسکتی نہیں
دل میں جو اک حسرتِ پرواز ہے

یوں نہ دیکھے کوئی تو کچھ بھی نہیں
ورنہ ہر ذرہ طلسم راز ہے

زندگی جس سے عبارت ہے جگر
وہ کسی کی اک نگاہِ ناز ہے

(مرادآبادی)

عورت کا انتقام

وہ کہہ رہا تھا "بھائی، تم کیا جانو یہ کس قدر المناک حقیقت ہے، جس عورت کو چاہو اسکی طرف سے تغافل دیکھو، یہی نہیں بلکہ اسکے بعد یہ بھی دیکھو کہ وہ کسی دوسرے سے مشغول ہے، دوسرے پر اسکی نگاہِ لطف وکرم ہے، غرض اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عشق کی تحقیر دیکھو اور اس ذلت کے مقابلہ میں کچھ نہ کرسکو اور مقہور و عاجز ہوکر اسی پر قانع نہ ہو کہ چاہے نہیں جاتے بلکہ یہ بھی محسوس کرو کہ کبھی چاہے نہ جاؤگے، اُف، میں اُس مایوس عاشق کی طرح ہوں جس کے تمام رابطۂ مناسبت کو ایک ضربۂ بیوفائی نے قطع کردیا ہو، جس کی امیدوں کا خون ہوگیا ہو اور جو یاس کی دیوانگی سے خودکشی کا تہیہ کرچکا ہو۔ ہاں، ایک مایوس عاشق ... یہ فقرہ جو تم نے میری زبان سے سنا ہے میں جانتا ہوں کہ ضرور تمھیں بیساختہ ہنسائے گا، مگر یہ اب ایک ایسی حقیقت ہے کہ اسکے مقابلہ میں میرے وہ پرانے نظریے ایک ایک کرکے ساقط ہوگئے اور اب چونکہ مجھ پر ہی یہ واقعات گذرے ہیں لہذا خود میں ہی اپنے سال بھر پہلے کے مادی فلسفوں اور اپنے گذشتہ خیالات کو بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ ہاں اُس وقت میں یہ نہ سوچتا تھا، اُس وقت ناتجربہ کار تھا، اب کیا کیا مجھ نہیں گذر گیا، کیسے تلخ تجربے ہوئے، اب سب باتوں پر یقین کرتا ہوں۔

یہ ایک سادہ مگر تھوڑی سی عجیب سرگذشت ہے کہ ابتدا میں محض ایک کامیڈی تھی لیکن رفتہ رفتہ اُس نے ایک غیر قابل اجتناب ٹریجڈی کی شکل اختیار کرلی۔ میں ابتدا ہی سے بیان کروں:

میری اور نجمہ کی مناسبت اُسوقت سے شروع ہوئی جبکہ میں استنبول پہونچا۔ اُسوقت ہم دو رشتہ دار بچوں سے زیادہ نہ تھے جو ایک ہی گھر میں پل رہے ہوں، حتیٰ کہ ہماری ایکدوسرے سے بہت بنتی بھی نہ تھی۔ وہ ایک بدمزاج و مغرور لڑکی اور میں ایک دقور و آتشیں نوجوان، گھر میں ایک چچا کا لڑکا تھا کہ اُسے سب سے زیادہ چاہتا، سب سے زیادہ اُسکی اطاعت کرتا۔ ہر وقت اُسکی خدمت میں حاضر رہتا اور جب گھر میں ہوتا تو اُسکی خدمت کرنا ہی اپنے لیے سب سے بڑا پرلطف کام سمجھتا۔ کبھی کبھی میں بھی اُن سے جا ملتا مگر جب میں اُن آنکھوں پر نظر ڈالتا جو میری ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی ہنسی اُڑاتی معلوم ہوتی تھیں اور میرے تمام حرکات کو ایک مضحکہ آمیز

نگاہ تنقید سے دیکھتی نظر آتی تھیں تو میں پھر اُن سے علحدہ ہو جاتا اور ہر علحدگی میں ایک ایسا جذبۂ کین میرے دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں ہر دفعہ اس موقع کا متلاشی رہتا تھا کہ میں بھی اِن دو شخصوں کو جو ساری دنیا کی ہنسی اُڑاتے ہیں ذلیل کروں۔ اکثر ہمارے درمیان کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش آجاتی جس سے ایک جھگڑے کی بنیاد پڑ جاتی۔ انھیں واقعات میں سے ایک واقعہ نے وہ شکل اختیار کی کہ آگے چل کر وہی ایک سبب انتقام ہو گیا اور تعلقات کو اُسی نے قطع کیا۔
ایک دن نہ معلوم کس مناسبت سے شاید مسئلۂ ذوق و حسنِ طبیعت پر گفتگو تھی۔ گفتگو آہستہ آہستہ شروع ہوئی مگر انھوں نے کہنا شروع کیا کہ میں ایک گاؤں کے گنوار سے زیادہ نہیں ہوں، اور پھر اس گفتگو کا معنی دار مسکراہٹ اور اشاروں اور اسکے بعد قہقہوں سے تعاقب کیا، اُسوقت میں صبر نہ کر سکا اور ان تمام استخفاف و استہزا کو ختم کرنے کے لیے غصہ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے گرجتا برستا چلا گیا۔ وہ متحیر نظروں سے مجھے دیکھتے رہے، میں نے اُنکی تحقیر و تذلیل کا اس طرح اعادہ کیا: "میں گنوار ہوں مانا اور تم سمجھتے ہو کہ تم بہت تربیت یافتہ مجلس آرا ہو اور اس پر تمھیں بڑا غرور ہے مگر میرے نزدیک تو تم بے تمیز محلہ کے لڑکوں سے زیادہ نہیں۔"
اسوقت نجمہ نے اپنی جھینپ ہنسی سے مٹانی چاہی اور میں نے بھی خیال کیا کہ اگر سلسلۂ گفتگو زیادہ رہا تو اور بھی زیادہ خلافِ تربیت باتیں ہونگی، وہاں سے چلدینا ہی مناسب سمجھا، اسکے بعد میرے اور نجمہ کے درمیان ایک گہری خندق کھد گئی، وہ مجھے دیکھتی تو منہ پھیر لیتی، میں اُسے دیکھتا تو اس طرح ظاہر کرتا گویا اُسے دیکھا ہی نہیں۔ میز پر کھانے پر جب ہم بیٹھتے تو اس خیال سے کہ ایک دوسرے پر نظر نہ پڑ جائے نظر میز ہی پر گاڑے رہتے۔ خاندان بھر میں ہماری اور نجمہ کی شکر رنجی نے لطیفہ کی شکل اختیار کر لی تھی، ہر شخص ہم سے اسکے متعلق ہنسی کرتا تھا۔ اگر ہم اتفاقاً کہیں ایک جگہ ہوتے تو ہمیں چھیڑا جاتا تھا۔

اسی طرح چار پانچ مہینے کا عرصہ گذر گیا، ایک دن عصر کے وقت میرا اور اُسکا زینہ پر مقابلہ ہو گیا۔ یہاں سے ایک دوسرے کو چھوے بغیر نکلنا ممکن نہ تھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہاں کوئی نیا جھگڑا شروع نہ ہو جائے، اور اُس کی ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ اسکے لیے کافی ہو سکتی تھی، میں نے اسوقت اُسکی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ دیکھی اور اُسے ایک مقدمۂ استہزا سمجھ کر میں اُلٹا پھرا تاکہ ہدفِ استہزا نہ ہوں۔ وہ میرے پیچھے آئی اور کہنے لگی "اب بھی روٹھے ہو بک آفندی! آؤ اب صلح کر لیں۔"

یہ اُسکی نسوانیت کی وہ احتیاجِ غرور تھی جسے وہ چھپا نہ سکی، ظاہر تھا کہ وہ اسکا تحمل نکر سکی کہ میں اُسکی پروا نہ کروں۔ حالانکہ وہ مجھے چاہتی نہ تھی لیکن وہ اسکے لیے بیتاب تھی کہ میں اُسکی طرف لَوٹ آؤں۔ میں اسے سمجھتا تھا، اور اُسکے اس تلّق کا جو بلّی کی خرخراہٹ کی مانند تھا، ایک خاموش مقابلہ سے جواب دیتا تھا اور اس طرح اپنے نزدیک اُس سے انتقام لیتا تھا۔ وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوتی تھی کہ لوگوں نے دیکھا کہ بعض دفعہ اُس نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کیا اور غصہ کی وجہ سے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ آخر ایک دن اُس کی اس حدّت وغصہ سے اندیشہ میں پڑکر ایک بُڑھیا مجھ سے اس بگاڑ کو ختم کرنے کا وعدہ لینے کے لیے آئی اور اُس نے تمام تفصیلات مجھے بتائیں: نجمہ مجھے چاہتی ہے، اُسکے مقابلہ میں میرا اپنے تئیں اس قدر لاقید و بے پروا ظاہر کرنا بڑی غدّاری ہے، اگر میرا طرزِ عمل یہی رہا تو وہ ایک دن اپنے تئیں کُنوئیں میں گرا دیگی۔

بُڑھیا اپنے ایک خاص مبالغۂ کلام کے ساتھ مجھے سمجھاتی تھی اور خود متاثر نظر آتی تھی لیکن میں بہت ضبط کرتا تھا کہ ہنسی میرے منہ سے نہ نکل جائے۔ نجمہ مجھے چاہتی ہے! میرے لیے کنُوئیں میں گر پڑیگی! آہ بیچاری نجمہ! مگر میں اُسے نہیں چاہتا اور نہیں چاہ سکتا۔ جس وقت میں یہ کہہ رہا تھا دروازہ آہستہ سے ہلتا معلوم ہُوا، اُسوقت اپنے خیالات کو خوب صاف صاف کہکر اک حظِ انتقام حاصل کرنے کی غرض سے اُسے سُنانے کے لیے میں نے خوب زور زور سے کہنا شروع کیا" نجمہ بدشکل ہے، علاوہ ازیں میرے اُسکے کبھی نبھ نہیں سکتی، نیز مجھے ہرگز یقین نہیں کہ وہ مجھے چاہتی ہے" باوجود اسکے میں نے اُس سے صلح کرلینے کا وعدہ کیا۔ بُڑھیا نے دعائیں دیں "اللہ تمہاری جوانی قائم رکھے"۔

مگر ان تمام جھوٹ باتوں سے جنھیں میں نے شروع میں ذرا بھی اہمیت نہیں دی میں اتنا مغلوب ہوا کہ اب تک اس مغلوبیت کی ذلت اسارت سے نالاں ہوں۔ آج اس دن کے واقعات کو یاد کرکے میرے دل میں اک وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے گویا اک خواب وصال اک طوفانی رات میں دیکھا گیا ہو:

اُس دن ہم سب رات کا کھانا کھانے کے بعد گاڑیوں پر سوار ہوکر اک لمبی ہوا خوری کو نکلے، گیارہ بجے کے قریب گھر لَوٹے، کپڑے اُتارنے سے پہلے میں اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے چاندنی کی سیر کر رہا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ کسی متردد ہاتھ نے نہایت آہستہ سے میرے دروازہ کو چھُوا، اس خیال سے کہ نجمہ ہوگی، میں بالکل خاموش رہا، اگرچہ اب اُس سے بگاڑ نہیں تھا!

لیکن تعلقات ایسے بھی نہیں تھے جس سے معلوم ہو کہ صلح ہو گئی، ایک دوسرے سے کبھی کبھی باتیں کرتے تھے لیکن ان میں حد تکلف برابر نمایاں رہتی تھی جس پر سے گذرنے کی قوت نہ پاتے تھے۔ اسوقت جبکہ ہر شخص اپنے کمرہ میں سونے کے لیے جا رہا ہے اُسکا اس غیر منتظر ملاقات کے لیے آنا ظاہر کرتا تھا کہ کوئی اہم مقصد ہے، اور یہ واقعہ اپنے پُراسرار ہونے پر دلالت کر رہا تھا باوجود اسکے میں اسوقت ایک عجیب گھبراہٹ کے ساتھ اس خفیہ ملاقات سے بھاگنا چاہتا تھا۔ ایک منٹ کے بعد اُسے شبخوابی کے ہلکے لباس میں دیکھکر میں حقیقتاً متحیر رہ گیا، وہ ہاتھ کمر پر رکھے ہوے آہستہ آہستہ میری طرف آئی، اُسکے ہونٹوں میں ایک معنی دار تبسم تھا، کہنے لگی "ابھی تک سوئے نہیں"۔

شروع میں مَیں کچھ سمجھا ساہیں کہ اُسنے کیا کہا، میرا دل دھڑک رہا تھا اور اسکا سبب میں نہیں بتا سکتا تھا، اُسے آدھی رات اپنے کمرہ میں تنہا دیکھ کر ایک عجیب حس میرے قلب میں پیدا ہوا۔ میں نے اب تک نجمہ کو اس حال میں نہ دیکھا تھا، اسکا سفید باریک لباس شبخوابی جس میں اسکے بازو پورے نہیں ڈھکے گئے تھے اپنے نیچے سے اُسکے خوبصورت جسم کو اس قدر نظر فریب طریقہ سے دکھا رہا تھا کہ چاند کی روشنی میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ نازنین عورت اک پری ہے۔ میں اِک عمیق لذتِ تماشا سے اُسے دیکھ رہا تھا اور تعجب کر رہا تھا کہ کیوں اب تک میں نے اُسکی طرف سے بے توجہی کی تھی۔ تو یوں کہیے نجمہ ایسی بدشکل عورت نہیں جو چاہی نہ جا سکے بلکہ حسین ہونے سے زیادہ اُس میں اِک کشش تھی جو انسان کو مسخر کر لیتی ہے اور جو ایسے بہت سے حسینوں کے مقابلہ میں جو انسان کی روح کو تسلی نہ دیں اعلان ظفر کرتی ہے؛ اسکے چہرہ میں کوئی کمی نہ تھی، اسکی باریک سیاہ ابروئیں، گہری نیلی آنکھیں، لمبے سیاہی مائل بال اُسے حسین کہلانے کے لیے کافی تھے، صرف اسکا دہانہ ذرا بڑا تھا، اور اس تمام خوبصورتی کو ناقص کرتا تھا مگر میں اس میں بھی کوئی فقدانِ مناسبت نہیں پاتا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ اس چہرہ میں اک چھوٹا دہانہ آہنگِ تناسب کے منافی ہوتا۔ بہر حال اِن تمام نقائص کے باوجود اسکی حالتِ روحی ایسی تھی کہ وہ مجھے حسین معلوم ہوتی تھی، وہ میرے پاس آئی اور مٹھی میں چھپائے ہوئے ایک چیز میری طرف بڑھا کر کہنے لگی "لو تمھارے لیے مٹھائی لائی ہوں"۔

"شکریہ عرض کرتا ہوں"

اسکے بعد کھڑکی تک آئی اور تھوڑی دیر تک سڑک پر سے گذرنے والوں کی سیر کرتی رہی،

میں خاموش تھا، پھر اپنی سایہ پر کی نوک سے میرے پانوں کو چھو کر کہنے لگی: "اب بھی مئے نہیں" اسکے بعد بہ طریق سرزنش بولی "شریر، جانتے ہو نا کہ چاہے جاتے ہو، اسی وجہ سے یہ ناز ہے، کیوں؟"

اسوقت میں بھی صبر نہ کر سکا:

"سنو نجمہ، میں التجا کرتا ہوں، جاؤ، کیا پھر مجھے دھوکہ دینا چاہتی ہو؟"

وہ بگڑ کر بولی:

"یعنی مجھے رد کرتے ہو؟"

پھر تیز نظر میری آنکھوں میں ڈال کر:

"بہت اچھا جاتی ہوں" اور یہ کہہ کے چلدی۔

میں اس مقابلہ میں مغلوب ہوا، اسکے پیچھے دوڑا، اُسکے ہاتھ پکڑ کے پھر کھڑکی تک لایا، اور کہا:

"دیکھو، تم نے جو کیا بڑی زیادتی ہے، مجھے تسخیر کر کے چلا جانا۔ کیا مجھے دیوانہ بنانا چاہتی ہو؟"

وہ اپنی غالبیت سے مطمئن خاموش تھی، میں اُسکی مظفریت کے مقابلہ میں اک عاجز و حقیر صید کی طرح بندھا ہوا تھا۔

اس رات کے بعد ہم میں اک آتشیں دورۂ عشق شروع ہوا۔ سیریں، ملاقاتیں، وعدے، سوگندیں، قسمیں، اسکے بعد شکایت، ابتلا، وعدہ خلافیاں، ظلم و ستم، روٹھنا بگڑنا، پھر رنج و الم، انتظار و فراق، اسکے بعد تغافل و تجاہل، غرضکہ میدانِ الفت میں کبھی خوش کبھی متردد اور آخر کار نا اُمید و خطرناک قدموں سے ہم نے قطعِ مسافت کی۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا ہے، تحسّر و ناکامی۔ اس گشت گذار میں ہم ایک ایسے مقام پر پہونچے کہ اک قدم آگے ڈالنا ہمیں قعرِ ہلاکت میں لیجاتا۔ یہ اس قدر یقینی تھا پھر بھی پیچھے قدم ڈالنے کی میں اپنے میں قوت نہ پاتا تھا، وہ اس تہلکہ سے جس طرح اور مشکلات میں اور دوسرے موقعوں پر اُس نے کیا تھا اک سحر آمیز قہقہہ لگاتی ہوئی نکل گئی، اور اسکے بعد میری ہنسی اُڑا کر مجھے چھیڑا کرتی۔ اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ نجمہ مجھے چاہتی نہیں نہ کبھی اُس نے مجھے چاہا تھا، بے شبہ اُس نے اپنے زخم خوردہ غرور کا انتقام مجھ سے لینا چاہا اور اس میں وہ کامیاب ہوئی۔ اتنے میں مَیں نے اُس دن معلوم کیا جس دن میں نے اُس سے شادی کی درخواست کی۔ میں اُس سے اک ابدی رشتہ کی کوشش کر رہا تھا، اور اُس نے اک بے انتہا قہقہے سے میری بات کو کاٹا اور کہا "اگر اک بدشکل عورت تم جیسے حسین آدمی کے لیے دستِ ازدواج بڑھائے تو وہ بدبخت ہوگی، اس لیے میری نصیحت ہے کہ آپ کسی ایسی عورت

سے شادی کیجیے جو آپ کے قابل ہو" پھر یکایک طرز کلام بدل کر اور نہایت سنجیدہ اور عزم کار ہو کر کہنے لگی " ہاں، اور میری یہ عرض بھی سُن لیجیے، اسکے بعد اس قسم کی باتوں کا ذکر نہ کیجیے گا، اگر آپ میرے دوست رہنا چاہتے ہیں تو جس طرح پہلے ملا کرتے تھے اُسی طرح ملا کیجیے، ورنہ یقین کیجیے کہ بالکل آپ سے قطع تعلق کر لوں گی۔

اس ضرب سے میری تمام قوتِ محاکمہ منجمد ہو کر رہ گئی، بالآخر میں نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا" لیکن نجمہ تم مجھے مار ڈالوگی، سوچو تو، میں تمھیں دیوانہ وار چاہتا ہوں "۔

وہ نہایت بے پروایانہ انداز سے اپنا شانہ ہلا کر بولی" لیکن میں تو تمھیں مطلق نہیں چاہتی" اتنا کہکر مجھے چھوڑ کے چلدی۔

اُس دن کے بعد سے میری اُسکی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ اب باسفورس پر رہتے ہیں اور میں یہاں اک ہوٹل میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ ایک دن میرا اُسکا پُل پر مقابلہ ہو گیا، مجھے دیکھتے ہی اُس نے اپنا مُنہ پھیر لیا۔ سنتا ہوں اک کپتان کو نجمہ سے محبت ہو گئی ہے اور تھوڑے دنوں میں اُنکی شادی بھی ہو جائے گی!

میرے دوست نے اپنی داستان ختم کر کے اک عمیق آہ سرد کھینچی اور خاموش ہو گیا، اِس سکوت میں اک ایسی یاس عظیم کی جھلک نظر آتی تھی کہ مجھے خوف ہوا کہیں نظمی اس نا امیدی کی وجہ سے کوئی دیوانگی کی حرکت نہ کر بیٹھے۔

(از ترکی)　　　　سید سجاد حیدر

مانوسِ اضطراب تھا دقفِ گداز تھا　　یہ دل ازل سے نذرِ ستم ہائے ناز تھا

میں محوِ اصل تھا نہ اسیرِ مجاز تھا　　اک راز تھا کہ محوِ تماشائے راز تھا

جس وقت میرے سامنے وہ مست ناز تھا　　دل میں تھا اک سرور جگر میں گداز تھا

آگاہ خود نہ اپنی حقیقت سے ہو سکا　　میں بھی عجیب عالم ہستی کا راز تھا

دل نے تڑپ کے کر دیے طے سارے مرحلے　　میں مبتلائے کشمکشِ ضبطِ راز تھا

لرزش میں جسکے نور سے تھی ساری کائنات　　وہ دل میں اپنے نکلے غمِ جانگداز تھا

قسمت سے اپنی خاک بسر پھر ہے آج کل　　وہ دل جو بار یابِ شبستانِ ناز تھا

مر کر بھی کشمکش سے فراغت نہ مل سکی　　کتنا طویل سلسلۂ غم دراز تھا

عبدالمجید (سالک)

سرمۂ تحقیق

بجواب

نقد انقد بیخودی

(سلسلۂ الناظر ماہ گذشتہ)

اعتراض (۹) جذبات۔

میں نے لکھا تھا کہ مرزا کے 'خیالات و جذبات' اس پر اعتراضوں کی توپوں نے وہ آتشباری کی کہ پناہ بخدا۔ مجھے مرزا داغ علیہ الرحمہ کا یہ شعر بیساختہ یاد آگیا:

غضب آیا، ستم ٹوٹا، قیامت ہو گئی برپا — یہ پوچھا تھا کہ تم مجھسے خفا اے میرجاں کیوں ہو

خلاصہ عبارت اعتراض:

"آجکل جو یہ ایک بیہودہ سا لفظ لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا ہے اسکے کیا معنی ہیں۔ کیا مصر میں جو سیکالوجی کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں اُن میں جذبات کا استعمال ایسے محل پر ہوا ہے۔ بھلا وہ لوگ زبان کی حفاظت کی خدمت انجام دینے کے اہل ہو سکتے ہیں جو ہر ایک شخص کی زبان سے ایک لفظ سنتے ہی بغیر غور و فکر استعمال کرنے لگتے ہیں کورانہ تقلید کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ تقلید کورانہ کے مرتکب محقق یا صاحب نظر نہیں کہلاتے۔"

یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جذبہ کشش کے معنوں پر بھی مستعمل نہیں ہے۔

جواب۔ جذبات کا لفظ غلط نہیں اور غلط بھی ہو تو غلط عام ہے غلط عوام نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اسکی جمع جذبات کیونکر بن گئی۔ اسے بر بنائے شہرتِ عام لکھنؤ کے سرمایۂ ناز مولانا مرزا محمد ہادی صاحب مرزا رسوا پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر سابق عربی و فارسی کرسچین کالج لکھنؤ و رکن رکین دارالترجمہ حیدرآباد دکن مصنف امراؤ جان ادا۔ شریف زادہ۔ مثنوی امید و بیم۔ مرقع لیلی مجنوں۔ خونی شہزادہ خونی مصور وغیرہ خوب سمجھا سکیں گے۔ جناب موصوف کرمی شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ کے اُستاد جناب طباطبائی کے عنایت فرما اور حریف ہیں۔ اگرچہ مرزا کی خاموشی بآواز بلند پکارتی ہے:

(غنی) کس زہرنگیِ مادعیِ مانہ شود کہ کفِ دست حریف ید بیضانہ شود

یہ بھی مشہور ہے کہ ترجمہ کے باب میں آج ہندوستان میں کوئی اُنکا جواب دینے والا نہیں اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے جاننے والے اعتراف کرتے ہیں - اور وہ فارسی، عربی اور اُردو پر یکساں قدرت رکھتے ہیں - اسی شہرت کی بنا پر میرے نزدیک نہ آپ پوچھیں نہ میں بتاؤں، حضرت طباطبائی مرزا صاحب سے حیدرآباد ہی میں پوچھ لیں - سیکالوجی کا علم ہو یا مصر کے ترجمے، یہ سب مرزا رسوا کی ہمہ دانی کا دم بھرتے ہیں - اگر فاضل معترض مرزا رسوا کو بھی جاہل سمجھنے کی جرأت کر سکتا ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون - رضا بقضائہٖ وتسلیماً لامرہ -

ہاں ایک بات رہ گئی - اگر کوئی امر مرزا سے پوچھنے میں مانع ہو تو حکیم قاآنی سے پوچھ لیجیے اور کیوں پوچھ لیجیے - اسکا سبب اسی اعتراض کے جواب سے ظاہر ہو جائے گا - اب میں کچھ مثالیں لکھتا ہوں کہ معترض نقاد اور ہندوستانیوں کا تو کیا ذکر، نہ دلی کے مصنفوں کو جاہل بناتے سمجھ کا، نہ لکھنؤ کے شاعروں اور انشا پردازوں کو - اور یہ اعتراض نہیں ایک حمام ہے جہاں سب ننگے نظر آتے ہیں -

لفظ جذبات کی مثالیں اتنی ہیں کہ انکے لکھنے کے لیے انسائیکلوپیڈیا کی سی جلدیں کافی ہو سکتی ہیں میں چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں -

(قلمروِ جذبات کی وسعت)

"وہ شخص جو مجھے گود میں لیے تھا میرے عہد طفلی کے جذبات کو سمجھ گیا"

(یوسف و نجمہ صفحہ ۲ - مولوی عبد الحلیم صاحب شرر)

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی نے شعر العجم جلد اول کے ابتدائی بارہ صفحوں میں اسے بیس جگہ لکھا - اور اگر شعر العجم کی سب جلدوں اور حضرت شبلی کی کل ادبی اور علمی تصنیفوں میں دیکھا جائے تو خدا جانے کتنے بار یہ لفظ اُنکے قلم سے نکلا ہوگا - (شعر العجم شبلی جلد اول و چہارم - صفحہ ۱ - ۱۲)

مدیر معارف (اعظم گڈھ) نے تقریظ گلکدہ (دیوان حضرت عزیز لکھنوی) میں یہ لفظ پانچ مرتبہ لکھا - (گلکدہ عزیز)

مدیر مخزن نے ساڑھے چار سطریں گلکدہ کی تقریظ میں لکھیں اور یہ لفظ دو مرتبہ لکھا - (〃)

مولوی عبد الماجد صاحب بی اے دریابادی مترجم سابق دار الترجمہ حیدرآباد دکن نے اپنی ایک کتاب کا نام فلسفۂ جذبات رکھا جو علم نفس پر ہے - اور کون بتائے کہ یہ لفظ کتنے مرتبہ لکھا -

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے گلکدۂ عزیز کی تقریظ میں پانچ صفحے لکھے اور پانچ ہی بار یہ لفظ لکھا۔ میں صرف وہ فقرہ لکھے دیتا ہوں جس میں جذبات فارسی اضافت کے ساتھ لکھا ہے

"انھیں جذباتِ مسرت و الم کے اظہار کی مزاولت سے انسان شاعر ہو جاتا ہے" (گلکدہ)

"پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا، اپنا سرخ و سفید چہرہ، سڈول ڈیل بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، اُمنگ میں بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی اُسے یاد آتی تھی" (سرخی مضمون "گذرا ہوا زمانہ" از سر سید احمد خان دہلوی مرحوم ایل ایل۔ ڈی)

"انگریز اپنی اولاد کو کشادہ پیشانی سے پالتے ہیں اور اُنکو خوش رکھتے ہیں اور اُنکے جذبات کی شگفتگی کے کھیل کھلاتے ہیں"۔ (از معاشرت انگریزی شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی مغفور)

"جس بات کا سچا ولولہ دل میں اُٹھے خواہ اُسکا منشا خوشی ہو یا غم حسرت یا ندامت ... یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے"۔ (مقدمہ شعر و شاعری شمس العلما حالی مغفور)

"انگھڑیاں۔ یہ لفظ جذبات محبت سے خاص وابستگی رکھتا ہے (سرخی مضمون "متروکات میں غلط فہمی" از محبی سید نور حسین صاحب آرزو لکھنوی)
رسالہ پیام یار (مجلہ) لکھنؤ۔ ماہ اگست سنہ ۱۹۲۰ء

"تمام جذبات و تخیلات کو عالم شہود میں لانا اپنے قابو کی بات نہیں۔
(چراغ سخن۔ جناب مرزا واجد حسین صاحب عظیم آبادی)

"انسان کے خیالات میں نت نئے تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں اس سے طرح طرح کی وجدانی کیفیتیں اور جذبات ظہور پذیر ہو کے جذب یا ہرب کیلئے تحریک ہوتی ہے"۔
خونی شہزادہ۔ مرزا رسوا لکھنوی مرزا محمد ہادی صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی)

"یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہی سے عشق نے تاثیر کرنی شروع کی ہو مگر ذکی اُس سے واقف نہ ہو کیونکہ اکثر جذبات آدمی کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اُن سے مدت تک بے خبر رہتا ہے"۔ (افشائے راز۔ صفحہ ۴۰۔ مرزا محمد ہادی صاحب مرزا رسوا لکھنوی)

اب نظم کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(باضافت فارسی) نکالا قدرتِ جذباتِ حسن و عشق نے ملکر
مہ کنعاں کو اپنے گھر سے اور لیلیٰ کو محمل سے
(مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی)

" خدا محفوظ رکھے عشق کے جذبات کامل سے
زمیں گردوں سے ٹکرائی جہاں دل ہلگیا دل سے (جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

" عشق ہے اک مؤثر حرکات
عشق ہے اک محرکِ جذبات (لسان القوم جناب صفی لکھنوی)

برائے خدا یہ تو فرمایئے کہ حکیم قاآنی اور حکیم مومن خاں دہلوی کے شعر میں جذبہ کن معنوں پر آیا ہے؟

گاہے چو کرم پیلہ کشی طیلسان سبز
گاہے زردے حیلہ کنی پیرہن قبا

یعنے بجذبہ ایم نہ شوریدہ از جنوں
یعنی بخلسہ ایم نہ پیچیدہ در ردا

(کلیات حکیم قاآنی مطلع قصیدہ: دوشم ندا رسید زدرگاہِ کبریا)

جھڑتے ہیں جذبۂ قلق سے شرار
ہے نفس سنگ و سنگ آتشبار (کلیات مومن صفحہ ۳۰۴)

اعتراض (۱۰) جذبہ کشش کے معنی میں بھی مستعمل نہیں ہے

جواب۔ یہ لفظ اسی معنی میں ایک نہیں ہزار جگہ آیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ع جسم خاکی ہوگیا داخل گڑھے میں گور کے
کھنچ گئی آخر یہ کشتی جذبۂ گرداب سے (دیوان خواجہ آتش علیہ الرحمہ صفحہ ۱)

ع بر میں عدو کے سوئے بغل سے مری اُٹھے
وہ کیا کہ سب کو جذبۂ دل سے عجب ہوا (کلیات مومن علیہ الرحمہ صفحہ ۱۰)

غالب ع میں بلاتا تو ہوں اُسکو مگر اے جذبہ دل
اُس پہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے (شرح طباطبائی میں یہ شعر صفحہ ۲۱۴ میں درج ہے)

" ع الٰہی جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے مجھسے " ۲۳۱

" ع جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا " ۲

جناب طباطبائی آخری شعر کی شرح میں لکھتے ہیں

"میرے اشتیاقِ قتل میں ایسا جذب و کشش ہے کہ تلوار کے سینے سے اُسکا دم باہر کھنچ آیا۔"

" ۲

حکیم سنائی :- بودہ چو یوسف بچہ ورفتہ باز تا فلک از جذبہ حبل المتیں
ظہیر فاریابی :- دل مرا چو گریباں گرفت جذبۂ عشق فشاند دامنِ ہمت ز خاکدانِ غرور

ہے یوں کہ زندہ زبانوں میں نئے الفاظ داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ جس لفظ کی سند سودا و میر و درد کے یہاں نہ ملے وہ زبان کا لفظ ہی نہ سمجھا جائے۔ میر سوز مرحوم کے زمانہ میں افعی کی جگہ ہفی محاورہ میں داخل تھا۔ اُنکا ایک قطعہ ملاحظہ ہو :

اوما رسیاہ زلف سچ کہہ بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے کاٹا نہ ہفی ترا بُرا ہو

اس پر جناب آزاد لکھتے ہیں کہ افعی صحیح ہے محاورہ میں ہفی کہتے ہیں (آبحیات آزاد دہلوی صفحہ ۱۹)

اعتراض ۱۱ میں نے لکھا تھا "ہر شخص مرزا کے کلام سے بقدر فہم لذت یاب ہوتا ہے چنانچہ اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ غالب

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد کام یاروں کا بقدرِ لبِ دنداں نکلا

اس پر ارشاد ہوا ہے۔

عبارت اعتراض :- غالباً آپ کا مقصود یہ ہے کہ 'یاروں' سے اغیار مراد ہیں۔ کوئی ہونٹ چاٹ کر رہ جاتا ہے کوئی ایک آدھ ڈاڑھ گرم کر لیتا ہے۔ حالانکہ دلّی کے محاورہ میں یاروں کا لفظ نفس متکلم پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ اس شعر کی شرح میں

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یہ بات مشہور ہے کہ ذوق نے 'یاروں' سے اپنی ذات مراد لی ہے یعنی میں نے بہت زور مارا۔"
دلّی ہی نہیں لکھنؤ میں بھی 'یاروں' کا لفظ نفس متکلم پر دلالت کرتا ہے یہ مثل سبھی کی زبان پر آتی ہے 'آنکھ بچی اور مال یاروں کا'

نفس متکلم کے معنی کی مثال :-

لائے گا کعبہ سے تو مفت ثواب اے زاہد حصہ پہلے ہی ٹھہر جائے ہمیں یاروں کا
(گلزار داغ صفحہ ۴ مطبع تیغ بہادر)

اغیار و احباب :-

نہ فرصت ہے نہ راحت ہے غزل اے داغ کیونکر ہو مگر کیا کیجئے مجبور جو ارشاد یاروں کا
(" صفحہ ۱۰)

اور سب سے زیادہ پُر لطف جواب یہ ہے کہ جناب طباطبائی بالقابہ بھی اس شعر کی شرح میں یار دل کا ہے سے وہی سمجھے ہیں جو یہ ناچیز سمجھا ہے

"یعنے جس میں جتنی قابلیت تھی اُس نے اُسی قدر لذت درد کو حاصل کیا ورنہ یہاں درد کی کچھ کمی نہ تھی"
(شرح طباطبائی صفحہ)

اعتراض (۱۲) ــ تماشا کرنا ــ دیکھنا ــ خلاصۂ عبارت اعتراض: "غالب مرحوم کا یہ مصرعہ اہل زبان نے کبھی پسند نہیں کیا:ــ حیرانیٔ نگاہ تماشا کرے کوئی : تماشا بازیگر کرتے ہیں"

جواب ــ فاضل معترض بھولتا ہے جس مصرعہ پر ایراد وارد کیا گیا ہے وہ غالب کا نہیں ہے بلکہ جناب طباطبائی کے عنایت فرما، اودھ پنچ کے اُستاد اور مرزا اوج مرحوم کے شاگرد رشید مولانا مرزا محمد ہادی صاحب رسوا و مرزا لکھنوی کا ہے اور پورا شعر یہ ہے:ــ

رسوا　حیرانیٔ نگاہ تماشا کرے کوئی　　صورت وہ سامنے ہے کہ دیکھا کرے کوئی
(خونی شہزادہ صفحہ ۲۲)

خانہ ویراں سازیٔ وحشت تماشا وہ کریں　　کیا مبارک ہیں مرے سامانِ بربادی مجھے
(گلکدۂ عزیز صفحہ ۹۰)

مرزا غالب کا شعر یوں ہے

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز　　تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

اب حضور کا یہ ارشاد کہ اہل زبان نے میرزا کا یہ مصرعہ کبھی پسند نہیں کیا، مجھ ناچیز کی سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کے نزدیک لکھنؤ کے مشہور شعرا تو ضرور اہل زبان ہونگے۔ اُنکے طرز عمل پر نظر فرمائیے۔ پسند کرنا کیسا اُنکو یہ اتنا محبوب ہوا کہ خود وہی کہنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ مرزا رسوا کی پسند تو آپ کے نزدیک بھی کوئی معمولی پسند نہ ہوگی۔ اور اگر اہل زبان سے غریب دلی والے مراد ہیں جن پر جناب طباطبائی نے اپنی شرح میں لکھنؤ والوں کی تقلید واجب قرار دی ہے تو جناب نے کسی کا قول پیش نہیں کیا جس پر نظر کی جائے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں میرے اُستاد کے یہاں نظم ہوا ہے۔

اعتراض (۱۳) داد کو پہونچنا ــ

میری عبارت یہ تھی:ــ پھر مرزا کی بلند پروازیوں کی داد کو پہونچنا اِنکے بس کی بات کہاں

اس پر کوہ آتش فشاں سے وہ آتش افشانی ہوئی ہے کہ دید کے قابل ہے ۔

عبارتِ اعتراض :۔

"داد کو پہونچنا شاید دادرسی کا ترجمہ ہے ۔ اُردو کا محاورہ داد دینا ہے ۔ فارسی میں داد کے معنی عدل و انصاف ہیں اور جتنے ملحقات اس لفظ کے ساتھ ہیں سب کے مطالب کسی نہ کسی طرح انصاف و عدل کی طرف منجر ہوتے ہیں ۔ مثلاً دادگستر، دادگر، داد آور، داد آفرید، داد آفریں، داددہ، دادستاں، داد فرمائے وغیرہ ۔ افسوس اسوقت اردو عجب آفت میں مبتلا ہے اگر اس آفت سے بچی تو گویا اللہ کے گھر سے پھری ۔ مگر نہیں بچنے کی امید بیکار ہے ۔ اس قسم کے ترجمہ سے اُردو ولغت میں کوئی زیادتی یا فصاحت میں کوئی ترقی ممکن نہیں البتہ مہملیت دن دونی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہے ۔"

جواب ۔ یہ رجز سب نے سن لیا ۔ کیا غضب ہے کہ سرکار نے اساتذہ کا کلام کبھی غلط انداز نظر سے کبھی نہ دیکھا ۔ اور پھر دعووں کی بلند آہنگی کا یہ عالم ۔ مقام عبرت ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ شاید یہ دادرسی کا ترجمہ ہے ۔ بیشک ایسا ہی ہے ۔ مگر یہ ترجمہ تجویز نا شاد نے نہیں کیا ۔ مرزا رفیع سودا کے کلام کو دیکھیے تو یہ ترجمہ آپ کو نظر آئے ۔ مجھے آج اتنی فرصت نہیں کہ سب سے پہلے مترجم کو ڈھونڈھ نکالوں ۔ اتنا جانتا ہوں کہ یہ دو معنوں میں آتا ہے ۔ اور اُردوے معلی کا ٹکسالی محاورہ ہے ۔ داد پانا ۔ فریاد کو پہونچنا

۱	پہونچیں گے اس چمن میں کبھی داد کو نہ ہم	جوں گل یہ چاکِ جیب سِلایا نہ جائیگا (کلیاتِ سودا ص ۱۹۳)
۲	گل دادِ عندلیب کو پہونچا تو کیا ہوا	فریاد کو مری ہے پہونچنا ترا عجب (ایضاً ص ۲۰۹)
۳	کب تری داد کو پہونچے ہے فلک اے بلبل	زخمِ گل کو جو رکھے بخیہ و مرہم سے دور (ایضاً ص ۲۲۲)
۴	اکدن میں جو نالہ کہاں پہونچا	داد کو میری آسماں پہونچا (مومن دہلوی)
	سمجھو تو کوئی داد کو پہونچو	عاشق کی فریاد کو پہونچو (میر تقی میر)

اعتراض (۱۴۷) زچہ تارے دیکھتی ہے

میری عبارت یہ تھی کہ کتابیں یوں دیکھی جاتی ہیں جس طرح زچہ تارے دیکھتی ہے ۔

عبارت اعتراض :۔

"سبحان اللہ کتاب دیکھنے کی تشبیہ اس سے بہتر ملنی مشکل ہے ۔ زچہ کی گود میں

بچہ طالبعلم کی بغل میں کتاب - زچہ نے تو بھر تارے دیکھے اور طالب علم نے چند ورقے مطالعہ کیا -
وہ اللہ اللہ بھائی کے کہتی ہوئی پردہ میں داخل ہوئی یہ صیغہ گردانتے مکتب پہونچا - وہ بامراد
رہی یہ نامراد رہا - یہ معلوم نہیں کہ جننے اور گوتھنے کی تکلیف زچہ کی طرح طالب علم نے اٹھائی
یا نہیں "

جواب اس میں شک نہیں کہ یہ عبارت دلکش ہے اگرچہ اعتراض یہ بھی ویسا ہی ہے
جیسے اور سب میں صرف وجہ شبہ عرض کردوں - وہ یہ کہ سمجھ کر نہ دیکھنا صرف رسم ادا کرونا -
اگر جناب کی موشگافیوں کا معیار قرار دی جائیں تو مرد شجاع اور شیر کی نہایت مشہور اور پرانی تشبیہ
بھی غلط ہو جائے - اسلیے کہ شیر میں شجاعت ہے مگر ڈھال تلوار نہیں باندھتا - میں حضرت آزاد
کی ایک ایسی ہی عبارت نقل کیے دیتا ہوں -

"آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح صفحوں سے عبور کر جاتے ہیں گویا بکریاں
ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں جہاں منہ پڑ گیا ایک لمبا بھی بھر لیا باقی کچھ خبر نہیں "
(آب حیات صفحہ ۱۴)

آزاد خوش نصیب تھے کہ اُن سے کسی نے ایسے سوال نہیں کیے جو میری قسمت میں تھے - میں معترض
علام کی تسکین کے لیے جناب طباطبائی کی شرح کا ایک مقام نقل کرتا ہوں شاید اُسے یاد آجائے
کہ ہر تشبیہ تام نہیں ہوتی -

نہ پوچھ وسعت میخانۂ جنوں غالب جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے اک خاک انداز

جناب طباطبائی فرماتے ہیں "خاک انداز وہ آلہ ہے جس سے مٹی کھود کھود کر پھینکیں لیکن یہاں
یہ وصف مقصود نہیں ہے بلکہ آلۂ خاک انداز کا محقر ہونا وجہ شبہ ہے اور اُسکا فقط خاک سے
بھرا ہونا مقصود ہے - (شرح طباطبائی صفحہ ۶۷ و ۶۸)

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے پڑھنے والوں سے معذرت کرلوں -
میں نے اُنکے مطالعہ کے متعلق یہ لکھ دیا تھا کہ کتابیں یوں دیکھی جاتی ہیں جس طرح زچہ تارے دیکھتی ہے
مگر اودھ پنچ کے یہ پرچے دیکھنے سے مجھے عبرت ہوئی کہ صرف آج کل کے طلبا ہی نہیں بلکہ وہ لوگ
بھی اسی طرح کتابیں دیکھتے ہیں جنکا دعوے یہ ہے

"ہم نے ایسا زمانہ پایا تھا کہ اُردو ایک لطیف زبان سمجھی جاتی تھی "
(اودھ پنچ ۲۲ - اپریل ۱۹۲۵ء صفحہ ۴ کالم ۲)

میں جانتا ہوں کہ ان الفاظ سے (بجنے اور گونجنے) زندہ دل معترض کو صرف زندہ دلی کا اظہار مقصود تھا، اور میں ان کے متعلق کچھ نہ لکھتا مگر معترض متبحر نے اعتراض کا نمبر دیدیا تھا مجھے بھی کچھ کہنا ہی پڑا۔

اعتراض (۱۵) ہیبت آفرینی، معجزہ آرائی، کافر ماجرائی وغیرہ

خلاصۂ اعتراض۔ یہ ترکیبیں نہیں چھپل پائیاں ہیں۔

جواب - ترکیب کا میدان نہایت وسیع ہے اور اُس کی وسعت کا اندازہ کرنا ہو تو خاقانی، قاآنی، نظیری، عرفی، ظہوری، شوکت، جلال اسیر، غالب اور مومن وغیرہ کے کلام پر نظر کی جائے میں دو چار مثالیں دیکر آگے بڑھتا ہوں۔

رقیب آفرینی :- رشکِ قتل کی ہائے رقیب آفرینیاں محشر نے خفتگانِ لحد کو جگا دیا (کلیات مومن صفحہ ۷۹)

سجدۂ ارم آفریں :- نسیم جہاں آباد وبش اگر بہار بیشہ وچمن میگذشت قشقۂ ہندوے سوسن باغ سجدۂ ارم آفرینی بال می گشت - جلوسیہ طغرا (رسائل طغرا) صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳

نزاکت آفرینی :- برق ..... در نزاکت آفرینی برق است صبح گلشن صفحہ ۷۸ (تذکرہ شعراء فارسی)

نفس مرگ آرا :- منت از بخیۂ عیسیٰ مکش بہر حیات ارزشِ مُردن بپرس از نفس مرگ آرائے من (قصائد عرفی صفحہ ۲۶)

مجنونِ وحشت آرا :- میں وہ مجنونِ وحشت آرا ہوں
نام سے میرے بھاگتا ہے عشق (کلیات مومن صفحہ ۱۱۱)

قیامت آرا :- تنگیِ عشق وحشت افزا تھی
تپشِ دل قیامت آرا تھی ” صفحہ ۲۸۹

کافر ماجرائی :- ادا ہوا عتاب پارسائی
بنے دیندار کافر ماجرائی ” صفحہ ۴۱۳

دو ترکیبیں اور ملاحظہ ہوں :-

خاطر نگہدار درویش :- کہ خاطر نگہدار درویش باش
نہ در بندِ آسایشِ خویش باش (بوستان بلبل شیراز علیہ الرحمہ)

خونِ دل آشامی :- بادہ وکاوِ غمزہ نظیری اثر نماند فارغ نشین کہ خونِ دل آشامی تو رفت (دیوان نظیری)

اعتراض (۱۶) شیکسپیر پرستان ہندی نژاد

خلاصہ عبارتِ اعتراض :- سامنے سیدھا سادہ اُردو لفظ موجود ہے مگر اُدبدا کے انگریزی جھاڑ یا عربی فارسی پتھر کھینچ مارتے ہیں - ایسی حالت میں اُردو ٹاٹ کی انگیا مونج کی بخیہ ہوئی جاتی ہے الخ

جواب - غالباً ٹاٹ کی انگیا مونج کی بخیہ سہو کاتب سے لکھ گیا یا قدانا کردہ یا لغزشِ قلم ہے اس لیے کہ اس مثل کا مفہوم یہ ہے کہ جیسی معمولی چیز ہو ویسا ہی معمولی اُسکا سامان بھی ہونا چاہیے - آپ نے اسے بے جوڑ (اَن مِل) کی جگہ پر لکھدیا ہے - بہرحال مجھے اصل اعتراض کے جواب سے بحث رکھنی چاہیے -

بندہ نواز میں نے جہاں تک اُردو پر نظر کی ہے مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ جس طرح اس زبان میں فارسی عربی کے پُرشوکت الفاظ کلام کے دبدبہ کو بڑھا دیتے ہیں اُسی طرح ہندی کے نازک اور سیدھے سادے الفاظ مزہ پیدا کردیتے ہیں - آپ خود اپنے مضمون کی قسط اول میں فرماتے ہیں "معجزہ آراست - سجدہ ریخت فارسی والوں نے کبھی نہیں کہا خواہ وہ ہندی نژاد ہوں یا ایرانی" دیکھیے سیدھا سادہ جملہ یوں ہو سکتا تھا کہ خواہ وہ ہندی ہوں یا ایرانی - مگر میری طرح آپ کے قلم سے بھی ہندی کے ساتھ نژاد نکل ہی گیا -

اسی پرچہ میں آپ فرماتے ہیں کہ "داد کے جتنے ملحقات ہیں سب کے معنی کسی نہ کسی طرح انصاف و عدل کی طرف منجر ہوتے ہیں" -

۶ - مئی کے پرچہ میں جناب نے لکھا ہے "ابوالفضل بھی اسی راہ کا سالک تھا" سیدھا سا جملہ یوں ہو سکتا تھا کہ ابوالفضل کا بھی یہی انداز یا طرز تھا -

اور کچھ آپ ہی پر موقوف نہیں اُردو کی شان ہی یہی ہے - اب میں اُن لوگوں کے کلام سے کچھ مثالیں دینا چاہتا ہوں جو قلمروِ زبان آوری میں کوس انا ولا غیری بجا گئے -

قمر منخسف : رہے ہر چوں قمرِ منخسف سدا بے نور سیاہ بختوں کے بالین قبر کی قندیل (دیوانِ ذوق ص۲۵)
گردن جھکائے روتا ہے وہ مالکُ الرقاب - (بند ۱۵ مطلع : یارب کسی کا باغِ تمنا خزاں نہ ہو ص۱۸۱ جلد سوم میر انیس)

عزم بالجزم تھے کیا فاطمہ کے پیاروں کے چھوٹی سی تیغ سے دم بند تھے کفاروں کے	بند ۴۲ " غل تھا اعدا میں کہ زینب کے پسر آتے ہیں ص۲۵ "
گھس گئے لاکھوں میں وہ دونوں شجاعِ ازلی	بند ۲۰ " دشتِ جنگاہ میں زینب کے جو پیارے آئے ص۶۵ "
اس عزّ و اعتلا پہ زباں بھی رُکی رہی	بند ۱۲۲ " جب نوجوان پسر شہِ دیں سے جدا ہوا ص۱۱۹ "
لاریب فیہ مصحفِ ناطق کی جا ہے ہیں	بند ۳۲ " رطب اللساں ہوں مدحِ شہِ خاص و عام میں ص۱۵۲ "

نزدیک تھا اہل کے گرے چرخ مقرنس بند ۴۸ مطلع جب رو چکے حضرت علی اکبر سے پسر کو ص ۱۹۵ جلد سوم میرانیس

دوٹانک کی کمان کو کیا دو ا بنا دیا تیروں کو کاٹ کاٹ کے تودا بنا دیا
رن کی زمیں کو خون کا دریا بنا دیا ہر جز و تن کو لا یتجزے بنا دیا
دیتے تھے تیر کٹ کے صدا الامان کی پتوں کی طرح اڑتی تھیں شاخیں کمان کی

(بند ۱۱۱ - مطلع: رطب اللساں ہوں مدح شہ خاص و عام میں ص ۱۵۳ ")

کیا کیا عزیز خلع بدن ہاے کر گئے تشریف یاں تئیں تمھیں لانا ضرور تھا - (کلیات میر ص ۳۶)

خلاصۂ عبارت حضرت طباطبائی: "جن مقاموں میں جھاڑ جھنکاڑ اور خارزار تھا وہاں جوش لالہ و گل دکھائی دیتا ہے تو اس انقلاب کون و فساد و جوش نشو و نما کے بیان میں ہمیشہ شعرا صنعت اغراق استعمال کرتے ہیں" (شرح طباطبائی ص ۴۵)

"پھر کجا تصور رکجا لہو کی بوند دونوں میں کیسا بون بعید ہے اور تباین طرفین سے تشبیہ میں حسن اور غرابت زیادہ ہو جاتی ہے" (" ص ۲۰۰)

"جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں سے تاج سجایا جسکی خوشبو شہرت عام بنکر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقاے دوام کی آنکھوں کو طراوت بخشی وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہوکے برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے" (آب حیات - آزاد - ص ۴۳۵ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور)

"عام اور مبتذل تشبیہیں جو اردو گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہوسکتا ہے اُن تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے بلکہ تقریباً ہمیشہ نت نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں" (یادگار غالب ص ۱۱۴ از حالی مغفور)

اب میں حیران ہوں کہ میں نے جو شکسپیر پرستان ہندی نژاد لکھا تھا تو اس میں کونسا لفظ تھا جو انگریزی جہاز یا عربی فارسی پتھر کہا جا سکتا ہے - انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہونیوالے ہندوستانی اب سے پہلے شکسپیر پر مٹے ہوئے تھے اور آج بھی اُنکی شیفتگی کچھ زیادہ کم نہیں ہوئی ہے - میں نے اگر اُنکو شکسپیر پرست کہا تو کیا گناہ کیا - اس سے قطع نظر کر لینے پر بھی آج کونسا ایسا پڑھا لکھا ہے جو شکسپیر کے نام سے واقف نہ ہو اور جسے یہ نہ معلوم ہو کہ انگریزی تعلیم پانیوالے شکسپیر کی قدر کیسی پرستش کرتے ہیں - میں اسم خاص کو کس لفظ سے بدلتا اور کیوں بدلتا - پرست عام ہے - بت پرست صنم پرست سے کون واقف نہیں - نژاد ایسا لفظ تو نہیں جس سے اتنی وحشت ہو - ضد کی اور بات ہے انصاف سے دیکھیے تو معلوم ہو جائے کہ آپ نے بھی وہی گناہ کیا ہے جو اس سرتاپا گناہ نے -

۲۲-اپریل کے پرچہ میں ہندی کے ساتھ نثر اردو آپ کے قلم سے بھی نکل گیا ہے۔ باقی مثالیں بخیال تطویل کلام ترک کرتا ہوں۔

اعتراض (۱۷) زبانِ حال

میں نے لکھا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ مرزا کے دیوان کی ایسی شرح لکھ دی جائے کہ دیوان بہ زبانِ حال پکار اُٹھے کہ حق شرح ادا ہوگیا۔ اسپر یہ ارشاد ہوا "اے حضرت دیوان کی دو زبانیں ہیں۔ ایک تو اپنی اُستادی کا ڈنکا بجاتی ہے اور دوسری الکن ہے لڑو لڑ و کرتی ہے۔"

اعتراض یہ ہے کہ دیوان صرف زبانِ حال رکھتا ہے تو پھر زبانِ حال کہنے کی کیا ضرورت تھی

جواب۔ کاش معترض نقاد نے اساتذہ کے کلام پر نظر ڈالی ہوتی۔ میں جواب میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ جو اس سراپا گناہ سے ارشاد ہوا ہے وہی تاجدار فصاحت میر انیسؒ سے فرما دیا جائے۔

رباعی: پیری سے بدن زار ہوا زاری کر — دنیا سے انیس اب تو بیزاری کر
کہتے ہیں زبانِ حال سے موئے سپید — ہے صبحِ اجل کوچ کی تیاری کر

اعتراض (۱۸) سیاہ پوش۔

میرے اس فقرہ پر کہ یہی وہ شرح ہے جسکی بگیا کُشی سے اشعار غالب سیاہ پوش نظر آتے ہیں معزز نقاد کہتا ہے کہ "خدا سمجھے پر یسمینوں سے یہ کسی حرف کا منہ کالا کیے بغیر چھوڑتے ہی نہیں"۔

جواب۔ یہ ایسی بات ہے کہ جسکا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ خدا معترض علام کو جزائے خیر دے جسنے حسنِ تعلیل کی یہ داد دی۔ میرے نزدیک یہاں اُسے صرف اظہار زندہ دلی مقصود تھا حقیقت میں اعتراض نہیں مگر اعتراض کا نمبر دیدیا گیا تھا اسلیے کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی۔ میں دو چار شعر لکھے دیتا ہوں جن میں حسنِ تعلیل ہے شاید اس سے کسی کو کچھ مزا مل سکے۔

رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد — یہ خوف تھا کہ دامنِ گُل پر پڑے نہ گرد — انیس
گریۂ دارم کہ تا تحت الثریٰ آبست و بس — نالۂ دارم کہ تا اوجِ ثریا آتش ست — غالب
دود سودائے تتق بست آسماں نامیدمش — دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدمش

اعتراض (۱۹) "حضرت چھری پھرائی نہیں جاتی پھیری جاتی ہے۔ جس کسی پر آپ اعتبار کیجیے اُس سے پوچھ لیجیے"۔

جواب۔ جو بات نہ معلوم ہو اُسکا پوچھ لینا عیب نہیں۔ مگر بخود ناشاد اُن لوگوں سے پوچھ چکا ہے جنکا اعتبار ساری دنیا کو ہے اور ہونا چاہیے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں چھری ہو یا خنجر سب پھیرے بھی

جاتے ہیں اور پھرائے بھی جاتے ہیں۔

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر — تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لیکر (دیوان ذوق ص۲۲ مطبع نامی لکھنو)

ہماری سخت جانی بس نہ ٹھہری کھیل ہی ٹھہرا — قسم ہے تمکو گردن پر چھری تم پھیر کر رہنا (گلزار داغ ص۱۲ مطبع تیغ بہادر)

میں تمام بزرگوں کے تا یا کیا اماں
وہ حلق پہ خنجر کو پھرا یا کیا اماں — قول جناب امام حسین علیہ السلام (مرزا دبیرؒ مطلع مرثیہ: جب اصغر بے شیر گئے نہر لبن کو)

سو خنجر اک گلے پہ یہ کیونکر پھرائیں گے۔ — بند ۴۵ مطلع: نکلی جو نہیں تیغ حسینی غلاف سے۔ ص۹۵ جلد۲۔ انیس

گردن پہ تو بھینا کے پھرایا نہیں خنجر۔ — بند ۷۳ مطلع مرثیہ: اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر۔ ص۳۲۹ "

سر پیٹ کے مندیل فرشتوں نے گرا دی
ظالم نے چھری حلق پہ سید کے پھرا دی — مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ مطلع: جب اصغر بے شیر گئے نہر لبن کو

اسکے عوض پھرائے چھری میرے حلق پر۔ — بند ۱۱۰ مطلع: روح سخن فدائے حسین شہید ہو ص۲۲۲ جلد۲ انیس

جلدی پھرادے حلق پہ شہ کے چھری کی دھار۔ — قول ابن سعد ملعون بند ۲۴۹ - مطلع
رطب اللساں ہوں مدح شہ خاص و عام میں۔ ص۱۵۲ "

(باقی)

محمد احمد بیخود موہانی

حیلہ ساز آہوں نے۔ کیا کیا رسا ہو کر — کوئے یار تک پہونچیں سب مگر دعا ہو کر
عشق ہو گیا رسوا۔ غم سے ہمنوا ہو کر — اسکی ابتدا ہوگی غم کی انتہا ہو کر
اے نگاہِ عالم سوز۔ صرف زخمِ دل کب تک — چھیڑ سازِ ہستی کو زمزمۂ قضا ہو کر
کیا کرے مریضِ غم۔ زیست کی تمنا کو — آئے جو دوا بنکر۔ جائے جو قضا ہو کر
اس قدر تلوّن کیا۔ اے نگاہِ محشر خیز — کچھ ذرا ٹھہر دل میں۔ صبر آزما ہو کر
تلخکام ہستی نے۔ لذتِ بقا پائی — زندگی کا بگڑا کیا۔ عشق میں فنا ہو کر
جستجوئے مقصد میں۔ رہنِ غم رہا برسوں — غم غلط ہوا دل کا۔ ترکِ مدعا ہو کر
میری چشمِ گریاں کی۔ جلوہ ریزیاں دیکھیں — ہر سرشک دریا ہے آنکھ سے جدا ہو کر
مشربِ محبت میں۔ معصیت ہے شکوہ بھی — شکوہ سنجِ غم کیا۔ بندۂ وفا ہو کر
ذوقِ بیگناہی تھا۔ اس نگاہ کو ورنہ — میرے دل میں کیوں آتی تیر بے خطا ہو کر
چارہ ننگ وحشت ہے۔ آبلوں سے مشکل تھا — روشناس مرہم ہوں۔ خار آشنا ہو کر
[illegible] لاکھوں۔ طور کر دیے پیدا — سرمہ بن آنکھوں نے رو کشِ حیا ہو کر
اے امیرِ دیوانہ۔ حسرتِ خموشی کب تک — کچھ جنوں نوازی کر اب غزل سرا ہو کر

تجلیات

(مقتبس از ٹالسٹائی و آسکر وائلڈ)

(۱)

یہ عام خیال ہے کہ ایک رہزن، ایک قاتل، یا ایک جنگجو سپاہی اپنے پیشہ کی برائی کا دل میں اقرار کرکے ضرور پشیمان ہوتا ہے، لیکن حقیقت یوں نہیں ہے۔ وہ لوگ جنکو انکی بدقسمتی یا انکی گمراہی نے ایک خاص پیشہ کا عادی بنا دیا ہے (خواہ پیشہ کیسا ہی ذلیل و قابل نفرین کیوں نہ ہو) زندگی اور دنیا کا جائزہ ایک ایسے زاویۂ نگاہ سے لیتے ہیں جو اُنکے افعال کو مستحسن و محمود بتاتا ہے۔ اور اس غرض سے کہ اُنکی نظر تصویر عالم کا محض ایک رُخ دیکھے وہ رہتے ہی ایسے لوگوں کی معیت میں ہیں جو اُنکے ہم پیشہ ہیں یا کم از کم اُنکی طرح اُنکے پیشوں کو قابلِ آفرین سمجھتے ہیں۔

جب ہم کسی رہزن کو اُسکے کسی "کارنامہ" پر فخر کرتے ہوئے یا کسی قاتل کو اُسکے کسی "شہکار" پر نازاں ہوتے دیکھتے ہیں تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر یہ لوگ احساسِ ہمدردی کو پامال کرکے اور ان افعالِ قبیحہ کے مرتکب ہو کر یوں لن ترانیاں کرتے ہیں۔ لیکن یہ حیرت صرف اس لیے ہے کہ وہ دائرہ جس میں یہ لوگ رہتے ہیں محدود ہے اور خصوصاً اس لیے کہ ہم خود اُس محدود و متعین دائرہ سے خارج ہیں۔ کیا ہم یہی جذبہ اُسوقت نہیں محسوس کر سکتے جبکہ دنیادار صاحبِ ثروت اپنی دولت پر ناز کرتا ہے، تجربہ کار و جنگ آزما سپہ سالار اپنی فتوحات پر بلند آہنگی سے نعرۂ امتیاز لگاتا ہے۔ یا وہ شخص جو کسی منصبِ جلیلہ اور ذمہ دار عہدہ پر فائز ہوتا ہے اپنے اقتدار کا غلط اظہار کرتا ہے؟ پھر دل آزاری، قتل اور چوری نہیں تو کیا ہے؟

یہ ایک عام عقیدہ ہے کہ ہر شخص میں اپنی مخصوص عادتیں اور خصلتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص مہربان ہے یا دوسرا بے رحم، کوئی دور اندیش و عقلمند ہے کوئی سادہ لوح و غبی وغیرہ لیکن یہ غلط ہے۔ ہم کسی آدمی کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں بے رحمی کے مقابلہ میں رحم کا جذبہ یا حماقت کے بہ نسبت عقل کا احساس زیادہ ہے یا بالکل اسکے برعکس، لیکن اُسکی نسبت یہ کہنا کہ وہ مہربان و عاقل ہے یا دوسرے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بے وقوف و ضدی ہے، ہرگز صحیح نہیں۔ تاہم

دنیا انسانی تقسیم یوں ہی کرتی آئی ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔

انسان کی مثال دریا کی ہے۔ تمام دریاؤں میں پانی تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن ہر دریا کہیں تنگ ہوتا ہے کہیں تیز رفتار کسی جگہ کشادہ کہیں آہستہ خرام، کبھی صاف کبھی غلیظ، کہیں سرد کہیں گرم۔ بعینہ ہر شخص میں خواص انسانی تو ایک ہیں، لیکن کہیں ایک خصوصیت ظاہر ہوتی ہے اور کہیں دوسری۔ جبکہ دوسرے خواص چھپے رہتے ہیں یا کم ظاہر ہوتے ہیں اور انسان اکثر اپنی غلط فہمی اور جہالت کے صدقے بر وقت تقسیم اپنے کو اپنے ہی سے مشابہ نہیں رکھتا اور انسان انسان نہیں رہ جاتا۔

―――――:(۲):―――――

کائنات میں غم سے زیادہ کسی جذبہ کو اثر پیدا کرنے کی قوت و صلاحیت نہیں بخشی گئی۔ خیالات اور احساسات کی وسیع دنیا میں کوئی جذبہ ایسا نہیں جو غم کی طرح انسان کے دل میں اپنی آتشیں لرزش پیدا کرکے اُسے روحانی بلندیوں پر پہونچاتا ہو، آہ۔ یہ ایک زخم ہے جس سے خون جاری ہو جاتا ہے اگر محبت کے ہاتھ کے سوا کوئی اور ہاتھ اسے چھو لے۔ مگر نہیں، محبت کا ہاتھ بھی اگر اس زخم کو مَس کرے تو بھی اس میں سے خون ہی جاری ہوگا۔ یہ اُسکی نفرت ہے جس سے کسی طرح مفر نہیں مگر کون کہہ سکتا ہے کہ آخرالذکر حالت میں خون درد کی کلفت کی وجہ سے جاری ہوگا یا لذت و لطافت کی وجہ سے۔ جس سرزمین پر غم ہے وہ بہت مقدس و بلند سرزمین ہے ایک دن لوگ اسکی حقیقی عظمت سے آگاہ ہوکر رہیں گے۔

واعظ خشک اپنی بے معنی اور سرتا پا مہمل تقریر میں غم کو ایک راز بتاتا ہے مگر آہ غم تو عین انکشاف راز ہے اور اصل حقیقت۔ غم سے پہلے جو نقوش تاریک یا دھندلے نظر آتے ہیں اب نکھر کر صاف اور روشن ہو جاتے ہیں۔ غم ایک روشنی ہے ایک خندۂ ضیا ہے جسکی خنک آسمانی رنگ کی روشنی میں کائنات ہم سے ایک ذرہ کو بھی نہیں چھپا سکتی، یہ باریک جالی دار پردہ ہے جسکی آڑ میں ہم پوشیدہ ترین خزینے روز روشن کی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ غم بلند ترین اور بیش بہا جذبات انسانی میں سے ہے۔ یہ تمام امتحانات کا تحقیقی و تفصیلی جواب ہے۔

مسرت اور قہقہہ کے شکستہ سازکی آڑ میں ممکن ہو کہ مستقبل کی کسی خوشی کے منتشر نغمے خوابیدہ ہوں مگر غم کی آڑ میں ہمیشہ غم ہے۔ یہ بالکل یقینی ہے جس میں شبہ کو ذرا بھی دخل نہیں۔ غم مسرت کی طرح کوئی چیز پوشیدہ اور زیر نقاب نہیں رکھتا۔ مسرت میں آیندہ مسرت کا امکان ہے مگر غم میں آیندہ غم کا

تیقن - یہ ایک طلائی ہنر ہے جسکی رقیق پانی کی تہ میں تمھیں چاند کا عکس چاندہی نظر آئے گا مچھلی نہیں - آرٹ کی بہترین تعریف یہ ہے کہ نقل اور اصل میں کوئی فرق نہ رہے - ظاہر باطن کا حقیقی آئینہ دار ہو - روح وجسم یوں تحلیل ہوں کہ ایک چیز بنجائیں - پھر کیا میں غلط کہتا ہوں کہ غم کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی آرٹ سچا نہیں - غم ہی بلند ترین عظمت اور عین حقیقت ہے - میری زندگی میں ایک وقت ہوتا ہے جب مجھے غم ہی عین ایمان نظر آتا ہے -

جلیل قدوائی اناوی

میں' اور میرا بچپن

ہائے کیسی زندگی بچپن میں تھی راحت رساں
میں شکار درد و غم کب تھا نصیب دشمناں

ماں کا ہنس دینا اچانک میری صورت دیکھکر
مُنہ پہ مُنہ رکھکر کبھی وہ چوسنا ننھی زباں

میرے چلانے پہ گہوارہ ہلا دینا کبھی
رس بھری آواز سے دینا تھپک کر لوریاں

محو انداز تبسم تھے لب نازک مرے
بات کرنے کو ترستی تھی یہ ننھی سی زباں

دُکھ بھرے دل سے کبھی رونا وہ ڈاڑھیں مار کے
ہچکیاں لیتے ہوے کرنا کبھی شور و فغاں

مُنہ کو اپنے پھر نہ کھولا شور و شیون کے لیے
رعب طاری ہوگیا مجھ پہ جو کھائیں گھڑکیاں

مطلع امید روشن تھا نظر کے سامنے
یوں نہ محو خواب تھا میرا دل عبرت نشاں

وہ بھی کیا دن تھے کہ مجکو ہوش تک آیا نہ تھا
چلچلاتی دھوپ کیسی ہوتی ہے دیکھا نہ تھا

میری رگ رگ میں خوشی کی لہر تھی دوڑی ہوئی
غم سے تھا بیگانہ میں غم کا مجھے کھٹکا نہ تھا

روح فرسا میرے وہ نالے نوالے عیش تھے
دل بلائے ناگہانی سے کبھی دھڑکا نہ تھا

آنکھ جھپکی، کھل گئی، پھر کھلکھلا کر، ہنس دیا
یہ طلسم زندگی پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

ہوش کے آتے ہی دروازے ستم کے کھل گئے
مدعائے زندگی کیا ہے یہ میں سمجھا نہ تھا

سب کرشمے ہیں یہ اپنی خوبیِ تقدیر کے
موج ہستی میں نہاں طوفاں ہے یہ دیکھا نہ تھا

اے دل ناعاقبت اندیش تجھ سے کیا کہوں
اب ترستا ہوں میں ایسا یوں کبھی ترسا نہ تھا

اقدس حیدرآبادی

سفرنامۂ مظہری

سفرناموں کا تعلق فنِ تاریخ سے پوشیدہ نہیں، لیکن ہر سفرنامہ کا نصب العین مختلف ہوتا ہے بعض سفرنامے علمی مقاصد کو پیش نظر رکھکر لکھے جاتے ہیں بعض معاشری یا ملکی اغراض سے۔ اسوقت جو سفرنامہ ہمارے سامنے ہے وہ بیشتر علمی و تعلیمی مقصد کو پیش نظر رکھکر مرتب کیا گیا ہے۔ اسکا نام سفرنامۂ مظہری ہے۔ یہ دراصل چند یادداشتوں اور نوٹوں کا مجموعہ ہے جو حاجی مظہر علیم صاحب انصاری مرحوم ردولوی نے اپنے چہار دہ سالہ مدتِ سفارت محمدن ایجوکیشنل کانفرنس و انجمن ترقی اُردو میں سپردِ قلم کیے تھے۔ اس سفرنامہ کی سلاستِ زبان اور سلامتِ مذاق کی ضمانت کیلئے صرف یہ تحریر کرنا کافی ہے کہ اسکی تدوین و ترتیب مرحوم کے بڑے بھائی مولوی محمد علیم صاحب انصاری ناظمِ دینیات مسلمان بورڈنگ ہاؤس الہ آباد یونیورسٹی نے فرمائی ہے جنکا نام متعدد تصانیف و تراجم کی وجہ سے علمی طبقہ میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ مولانا موصوف نے ان نوٹوں کو یکجا کرکے واقعات کے تسلسل اور مضامین کی روانی کا لحاظ کرتے ہوے کتابی صورت میں جمع کردیا ہے۔ جس سے اُنکا مقصود اپنے مرنیوالے عزیز بھائی کے فرزندانِ معنوی کی بقا اور اُنکی اولادِ صلبی کی امداد ہے۔

کتاب کے نفسِ موضوع کی بابت یہ بتانا ضروری ہے کہ اسکے ابتدائی چند اوراق اصلاً ایک رپورٹ کی شان رکھتے ہیں جنکا منشا مصنفِ مرحوم کے نزدیک غالباً اپنے فرائض کے ضابطہ کی تعمیل تھا۔ اسکے بعد جہاں سے انجمن ترقی اُردو کی سفارت کا آغاز ہوتا ہے طرزِ بیان بہت دلچسپ اور ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم نے جن جن مقامات کا دورہ کیا ہے اُنکی مختصر تاریخی اہمیت اور مقامی خصوصیت بھی ضرور مدنظر رکھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں ضرورت سمجھی ہے مشہور اور بے اصل تاریخی افسانوں کی تغلیط بھی کردی ہے۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی کے حملۂ ہندوستان کی جو وجہ بتائی جاتی ہے اُس میں عوام کی وہم پرستی کی طرف اشارہ کردیا ہے (ذکر سومنات صفحہ ۱۴۰) جس تاریخی مقام پر مصنف کا گذر ہوا ہے اُسکے کتبے اور ضروری حالات بھی دیدیے ہیں۔ موقع بموقع دلفریب مناظر کے تذکرے جنسے مرحوم نے "جنّت نگاہ" کا حظ اُٹھایا ہے سننے والوں کو "فردوس گوش" کا لطف دیتے ہیں۔ اگرچہ کتاب کا مقصودِ اصلی جیسا کہ عرض کیا گیا مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا استقصاء تھا لیکن بغور پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے دل میں ذاتی طور پر ایک خاص درد ہے کہ جہاں اہل اسلام کو انحطاط کے عالم میں دیکھتا ہے دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

مصنف کو صرف ضابطہ کی خانہ پُری ہی پر قناعت نہیں بلکہ یہ بھی منظور ہے کہ جس طرح ہو سکے اپنی ہمت کو عوام کالانعام کے اُبھارنے کی جدوجہد میں وقف کر دے۔ قدیم شرفائی علم سے بے توجہی اور گروہ عوام کی بے حسی کا رونا اس دَرد سے رویا ہے کہ پڑھنے والے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے (صفحہ ۴)۔ اسی دردِ قومی کا اثر ہے کہ جب دَورانِ سیاحت میں مصنف کا گذر اُن عظیم الشان اسلامی یادگاروں پر ہوتا ہے جو اسلاف اپنی عظمت کی نشانیوں کے طور پر چھوڑ گئے ہیں اور جنکو اُنکے پست ہمت اخلاف محفوظ رکھنے سے بھی قاصر ہیں تو وہ بیتاب ہو جاتا ہے

گرے مکانوں میں ہم پکارے مکیں تمہارے کدھر سدھارے
جھکے ستوں نے کیے اشارے کہ سب نے رستہ لیا زمیں کا

مثال کے لیے وہ موقع دیکھو جہاں مرحوم نے مالدہ کی جامع مسجد کا نظارہ کرنے کے بعد اپنے جذباتِ دلی کا دریا بہا دیا ہے (صفحہ ۱۳۱)۔ علیٰ ہذا مسلمانوں کے معاشرتی تنزل، متولیانِ اوقات کی فرض ناشناسی اور ریاستوں کی غفلت شعاری کا ماتم اس بلند آہنگی سے کیا ہے کہ طبیعت پر خاص اثر ہوتا ہے۔

اسی سلسلہ میں کہیں کہیں قدرتی طور پر مذہبی جوش اور توغل کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور ملتِ حنفیہ کے پیرووں میں بدعات پرستی کا مرض مسلّط پا کر مصنف اپنے غم و غصہ کے جذبات کو چھپا نہیں سکتا اور بمصداق "الدین النصیحۃ" اظہارِ تاسف بلکہ ملامت سے کام لیتا ہے (صفحہ ۵۷ و ۶۱) لیکن اس سے یہ شبہہ نہ کرنا چاہیے کہ ان تمام خیالات کا محرک ایک جذبۂ عصبیت ہے جو ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ حاشا بلکہ جہاں ضرورت سمجھی ہے وہاں دوسرے خیال و عقیدہ کے افراد کی سچائی اور راستبازی کا تذکرہ نہایت فیاضی اور بے تعصبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک خاص بات جو اس سفرنامہ میں قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ چودہ برس کی طویل مدت اور اقطاع ہند کی سیاحت کے دوران میں مصنف مرحوم کو جن اصحاب سے سابقہ پڑا ہے اور ملاقات کا اتفاق ہوا ہے اُنکے خصائل و عادات، طرزِ ماندو بود حتٰی کہ سلسلۂ نسب کی بھی تفصیل کر دی گئی ہے۔ اور اس طریقہ سے یہ کتاب اپنے اندر تعلیمی مواد کے علاوہ تاریخی، مقامی اور افرادی معلومات کا کافی ذخیرہ رکھتی ہے۔ میرے خیال میں شائقین علم اصحاب کو اسکی قدر کرنا اور اعانت کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ کتابِ مذکور ۲۵۰ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ اور دیباچہ و فہرست ملا کر ۲۷۰ صفحوں کی کتاب ہے۔ یہ کتاب مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ناظمِ دینیات مسلمان بورڈنگ ہاوس یونیورسٹی الٰہ آباد سے دو روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول میں مل سکتی ہے

ضیا احمد ایم۔ اے بدایونی

سرِّ فنا

رہا نہ دل میں وہ احساسِ مدعا باقی / نہ روح میں ہے وہ بیتابیِ دعا باقی
وہ لب پہ شوق و طلب کی حلاوتیں نہ رہیں / نہ وہ کلام میں رنگینیِ دعا باقی
فسانۂ شبِ ہجراں کی لذتیں نہ رہیں / نہ اب ذرا ہوسِ ظلمِ ناروا باقی
شرارتیں نگہِ شوق کی ہوئیں رخصت / رہا نہ ولولۂ آہِ نارسا باقی
دلِ حزیں میں تڑپنے کی وہ سکت نہ رہی / نہ تارِ اشک کا اب کوئی سلسلا باقی
کھٹک کہیں نہ رہی دردِ جاں نواز کی اب / نہ وہ لطیف خلش دل میں اب ذرا باقی
غضب تو یہ ہے کہ ہے سازِ عاشقی خاموش / نہ گفتگو کوئی باقی نہ ماجرا باقی
نہ اب وہ عرضِ مطالب میں شوخیِ عنواں / نہ اب وہ شوق کی نیرنگیِ ادا باقی
رہی نہ وصل کی لذت نہ ہجر کی کلفت / دوائے درد نہ اب دردِ بے دوا باقی
یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا / کہ اب نگاہ میں عبرت نہیں ذرا باقی
نہ اب وہ ذوقِ عبادت کی سعیِ لاحاصل / نہ اب وہ لذتِ عصیاں کا ولولا باقی
نہ وہ بیاضِ حقیقت پہ نقش آرائی / خیال میں نہ رہا رنگِ ماسوا باقی
بڑا غضب یہ دلِ شعلہ آرزو نے کیا / کہ مدعی کا پتہ ہے نہ مدعا باقی
رہا نہ تارِ رگِ جاں میں ارتعاشِ خفی / نہ اب وہ نغمۂ بے لفظ و بے صدا باقی
خبر نہیں ہے کہ کیا حال ہے کہاں ہوں میں / بقا کا ہوش نہ اب ہستیِ فنا باقی

جو سب لیا ہے تو یہ سوز و ساز بھی لے لے
یہی رہا ہے کہ اب امتیاز بھی لے لے

مگر جو دل میں یہ شعلہ سا تھرتھراتا ہے / نگاہِ لطف کا شاید ہے آسرا باقی
جو کچھ نہیں نہ سہی دل تو خون ہوتا ہے / کہ عشق کی ہے ابھی شانِ ارتقا باقی

مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے
غرض کہ نشو و نمائے روح کی اسی میں ہے

اصغر گونڈوی

نظرے خوش گذرے

آگرہ سے، اسی سال کے شروع میں ایک ماہوار رسالہ شمع کے نام سے نکالا گیا ہے جسکی ادارت مسٹر محمد حبیب پروفیسر مسلم یونیورسٹی اور مسٹر حسن عابد جعفری بیرسٹرایٹ لا آگرہ کرتے ہیں۔ الناظر کے سامنے ابتدائے کار سے یہ مقصد رہا ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو زبان اُردو کی خدمت پر توجہ دلائی جائے اور اس لحاظ سے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ قوم کے دو لائق اور ہونہار نوجوان بالآخر اپنی مادری زبان کی خدمت پر آمادہ ہوے ہیں۔ البتہ جب ہم نے شمع کے متعدد پرچوں میں یہ دیکھا کہ حبیب صاحب رسالہ کے لیے مضامین انگریزی میں لکھتے ہیں اور کسی سے ترجمہ کراکے شایع کرتے ہیں تو ہمیں بہت افسوس ہوا۔ حبیب صاحب کا وطن نواح لکھنؤ ہے۔ اُردو اُنکی مادری زبان ہے، علیگڈھ میں جو مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز ہے، اور جہاں ترقیِ اُردو کی منضبط کوششوں کا سب سے پہلے سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، برسوں تعلیم پائی؛ اور وہیں اب کئی سال سے بحیثیت معلم رہتے ہیں، مگر کیا یورپ میں چند سال جاکر رہنے کا یہ اثر ہے کہ اب وہ اپنے خیالات کا اظہار بھی اپنی زبان میں نہیں کر سکتے۔

بہرحال ہمیں امید ہے کہ حبیب صاحب کو اپنے اس طرز عمل کی ناموزونیت کا جب احساس ہوگا تو وہ اُردو میں لکھنے پر توجہ فرمائیں گے اور یقین ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں نہایت روانی کے ساتھ لکھنے لگیں گے۔ اُردو تو ایسی آسان زبان ہے کہ بنگال، مدراس و بمبئی وغیرہ کے اصحاب جنکی مادری زبان اُردو نہیں ہے نہایت شستہ اور پاکیزہ اُردو لکھتے ہیں۔

شمع کی ظاہری و معنوی حالت مخزن مرحوم کی یاد دلاتی ہے۔ اور ہماری دلی دعا ہے کہ اسے مخزن ہی جیسی قبولیت عام حاصل ہو۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ۔ حجم ۹۶ صفحہ۔ اور کاغذ، لکھائی، چھپائی سب دیدہ زیب ہے۔

پنجاب کے زندہ دل باشندوں نے اُردو زبان کی خدمتگذاری میں جو شرف حاصل کیا ہے وہ کم سے کم ہمارے اہل شہر کے لیے لایق عبرت ہے۔ لکھنؤ والے مدعی ہیں کہ ہم اہل زبان ہیں مگر اُردو کی خدمت کرنے کے لیے جب اُن سے کہا جاتا ہے تو وہ کانوں میں کھچیاں بھر لیتے ہیں۔ پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی،

ناچ، گانا، تھیٹر، سینما، سرکس، گھوڑدوڑ، غرضکہ دنیا کے جتنے کھیل ہیں سب کے لیے اہل لکھنؤ کے پاس وقت بھی ہے اور روپیہ بھی۔ مگر اُردو ادب کی خدمت کے لیے نہ وقت نکالا جا سکتا ہے نہ روپیہ جیب سے نکلتا ہے۔ اہل لکھنؤ کی ادبی خدمات بس مشاعروں تک محدود ہیں کیونکہ اس میں زبانی واہ واہ کے سوا کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اہل لکھنؤ کی اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ یہاں کوئی رسالہ کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اور جو دو ایک ٹوٹے پھوٹے دیئے ٹمٹما رہے ہیں، اُنکی سخت جانی بھی یہاں کے لوگوں کی فرض شناسی کی رہین منت نہیں بلکہ باہر کے ہوا خواہانِ اُردو کی قدردانی سے اُنکی کفالت ہوتی ہے۔

اہل لکھنؤ کی بے حسی اور بے اتفاقی پر کہاں تک ماتم کیا جائیگا، اسوقت اہل پنجاب سے ایک شکوہ کرنا ہے۔ گذشتہ جون میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنے دیرینہ غایبانہ کرمفرما مولوی محمد شفیع ایم اے پروفیسر اورنٹیل کالج سے ملا تو اُنھوں نے اورنٹیل کالج میگزین کا پہلا پرچہ مجھے عنایت فرمایا۔ یہ رسالہ اورنٹیل کالج کی طرف سے کالج کے متعدد پروفیسروں کی اڈیٹری میں نکلتا ہے۔ میرے کرم فرما اس کے چیف اڈیٹر ہیں۔ سال میں تین پرچے اسکے شایع ہونگے۔ اور عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، ہندی، و پنجابی، چھ زبانوں کے متعلق اس میں مضامین ہوا کرینگے۔ عربی، فارسی و اُردو کے اڈیٹر پروفیسر محمد اقبال (مشہور شاعر نہیں) ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ چونکہ میرے کرم فرمانے ریویو کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اسلیے واپسی میں مجھے اسکو تمام وکمال پڑھنے کا موقع ملا۔ اور مجھے اسکے پُرمغز مضامین پڑھکر جہاں مسرت ہوئی کہ اُردو کے خدمتگذاروں میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کا اضافہ ہوا وہیں یہ محسوس کرکے افسوس ہوا کہ ایسے عمدہ پرچہ کی اُردو عبارت میں متعدد موٹی موٹی غلطیاں جائز رکھی گئی ہیں۔ پنجاب کے عام رسائل و اخبارات اگر صحت زبان کی طرف سے کسی قدر بے پروائی کریں تو شاید چنداں قابل لحاظ ہو۔ مگر جو رسالہ اورنٹیل کالج کے زیر اہتمام شایع ہو اُسے یقیناً ایسے اسقام سے پاک ہونا چاہیے۔ پروفیسر محمد شفیع اور پروفیسر محمد اقبال کے مضامین میں کم، مگر پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے مضمون میں تو بکثرت غلطیاں ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:-

اس عہد کے اکثر حصہ ادب کی غیرحاضری کا ثبوت دے سکتی ہے —— سلطان کی زندگی کا دوسرا رُخ جسکو مورخین نے قطعاً فراموش کردیا ہے طرح کیا جا سکتا ہے —— اور جنگلوں میں شکار کے پیچھے اپنے لشکر سے جدا ہوکر اکثر آوارہ ہوجاتا ہے —— غریب بُڑھیا کے چھپڑے کے لیے اپنا گھوڑا تیز کردیتا ہے، بُڑھیا ساتھ نہیں نبھ سکتی پہنچتی ہے —— کل میں سب دن اسکے برابر بیٹھ کر شکار کھیلتا رہا۔"

رسالہ کا چندہ تین روپیہ ہے۔

معارف پریس اعظمگڈھ سے کلیات شبلی اُردو حال میں شایع ہوا ہے - مولانا شبلی نے مرزا غالب کی طرح اپنے اُردو کلام کو اگرچہ "بے رنگِ من است" سے تعبیر نہیں کیا گو یہ واقعہ ہے کہ انکے دل میں اُسکی اہمیت نہ تھی اور اُنکے جانشینوں نے بھی اُسکے ساتھ سوتیلے بھائیوں ہی کا سا برتاؤ کیا۔ لیکن جس طرح رفتارِ زمانہ نے غالب کو شکست فاش دی تھی بعینہٖ وہی سلوک مولانا کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے اپنے فارسی کلام کے متعدد چھوٹے چھوٹے مجموعے بڑے اہتمام سے چھپوائے تھے مگر اُنکی قدردانی اس سے زیادہ نہیں ہوئی کہ دیوان شبلی کا دوسرا ایڈیشن تقریباً پندرہ سال تک نہ نکلا - اور غزلوں کے مجموعے بھی بارہ سال میں تین بار سے زائد نہیں چھپے - اور اب جو سادہ کلیات ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا ہے تو دیکھیے اسکے طبع ثانی کی کب نوبت آتی ہے -

اسکے برخلاف اُردو کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ گذشتہ سات آٹھ سال کے اندر دس چھوٹے بڑے ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں -

جو کلیات اعظمگڈھ سے شایع ہوا ہے اُس میں اکثر تو وہی چیزیں ہیں جو ہمارے مرتبہ مجموعۂ کلام شبلی میں تھیں، کچھ اضافے بھی ہوے ہیں، جن میں جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے سلسلہ کی نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور جنھیں ہم نے قصداً پریس ایکٹ کے ہاتھوں نقصان اُٹھانے سے بچنے کے لیے ۱۹۱۸ء میں نظر انداز کر دیا تھا -

البتہ تعجب ہے کہ ہمارے مجموعہ میں جو تھوڑی سی غزلیں اور متفرق اشعار تھے اُنھیں کیوں کلیات سے خارج کر دیا، در انحالیکہ اُن میں سے متعدد غزلیں معارف میں چھپ چکی ہیں - ایک بات اور قابل شکایت ہے کہ دار المصنفین کے لیے جن صاحب نے یہ مجموعہ کافی محنت سے مرتب کیا تھا اُنکا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے - مولوی معین الدین ندوی کو یقیناً اسکی خواہش نہ ہوگی، مگر ایسی صورت میں کہ وہ دار المصنفین کے کوئی کارکن نہیں بلکہ آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں، اعظمگڈھ کے احباب کو اسکا خیال کرنا چاہیے تھا -

مولانا شبلی کے کلام کے متعلق کچھ کہنے کا اب وقت نہیں رہا، اور نہ یہ بتانے کی حاجت ہے کہ کتاب کی طباعت وغیرہ کس درجہ کی ہے - معارف پریس یا دار المصنفین اس بارے میں کسی سند اور سفارش کے محتاج نہیں - قیمت عہ ہے -

---

انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ اُردو کے جولائی نمبر میں مرزا فصیح کا ایک مشہور مرثیہ

شایع کیا گیا ہے، جسکا مطلع ہے

جب مشک بھر کر نہر سے عباسؑ غازی گھر چلے

خدا جانے مجبی مولوی عبد الحق صاحب سے یہ کس نے کہدیا کہ "فصیح کا یہ مرثیہ اتبک غیر مطبوعہ ہے" حالانکہ آج نہیں بلکہ پچیس تیس برس اُدھر اسکے مطبوعہ نسخے لکھنؤ کی گلی گلی میں بکتے تھے، اور غالباً چوک کے مرثیہ فروشوں کے یہاں اتبک بکتے ہوں گے۔

جنٹلمین بکڈپو لکھنؤ نے جاسوسی کے اُس قصہ کے سلسلہ میں جو مسٹر ظفر عمر بی اے نے نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری میں بیان کیا ہے، ایک کتاب بہرام کی رہائی شایع کی ہے۔ کتاب کی قیمت ۱۲ ہے۔

سرمدی جہنم سے اس درجہ خوف زدہ کر دیتی ہیں کہ جسم لرز جاتا ہے، اعضا سن ہو جاتے ہیں، اور عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر طرح کے خرافات و اوہام کے سامنے سر جھکانے، اور ہر چیز سے کانپنے لگتا ہے۔ اس تخویف و تہدید کے بعد مذہب انسان کو وہ دروازے دکھاتا ہے جنمیں جانے سے اِن تمام خطروں اور مصیبتوں سے بچاؤ ہو سکتا ہے، مگر اُنپر بھی مذہبی پیشواؤں کی دربانی ہوتی ہے جو احبار و رُہبان و مشائخ کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں اور صرف اُس شخص کو گذرنے دیتے ہیں جو داخلہ کی فیس پہلی ادا کر چکا ہو۔ یہ فیس کبھی دل و جان سے تکریم و تعظیم کی شکل میں انکے سامنے پیش کی جاتی ہے اور کبھی اسکے ساتھ زر و جواہر کی تھیلیوں کا ہونا یا قومی خزانہ سے کسی بڑی رقم کا اِن مقدس دربانوں کے لیے مقرر ہونا بھی لازمی ہوتا ہے، اگر یہ فیس ادا نہ کی جائے تو وہ روح کو اُسکے مالک تک پہونچنے نہیں دیتے، اور اُسوقت تک برابر روکے رہتے ہیں جب تک اپنا نذرانہ وصول نہ کر لیں۔

علمائے سیاست کہتے ہیں کہ مستبد حکمراں بھی اپنا استبداد اسی قسم کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ وہ بھی ذاتی شان و شوکت، جابرانہ غرور و نخوت، فوجی قہر و جبروت اور قتل و غارت کی ہولناکیوں کے ذریعہ انسان کو یہاں تک ذلیل و خوار اور مجبور و مرعوب کر دیتا ہے کہ از سرتاپا مطیع و منقاد اور غلام و خدمتگار بن جائے اور اپنی نسبت یقین کرنے لگے کہ وہ بھی چوپایوں میں سے ایک چوپایہ ہے جو صرف اس لیے پیدا ہوا ہے کہ اپنے آقا کی چاکری اور غلامی کے لیے نئی نسلیں پیدا کیا کرے۔

وہ کہتے ہیں کہ اسی وحدت مقاصد و نتائج کی بنا پر یہ دونوں استبداد فرانس جیسے آزاد ملک میں بھی پیرس کے باہر باہم بغلگیر اور ایک دوسرے کے مددگار نظر آتے ہیں۔ اور روس جیسے پست ملکوں میں تو ان میں وہی تعلق ہے جو قلم و کاغذ میں ہوتا ہے، جب وہ انسان کے بدبخت بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

انکا خیال ہے کہ مذہبی اور سیاسی استبدادوں کی اِس شدید باہمی مشابہت کی وجہ سے انسانی آبادی کا اکثر حصہ، یعنی عوام، اپنے حقیقی معبود اور ظالم حاکم کے مابین چنداں فرق نہیں کرتے۔ کیونکہ انھیں دونوں کی تعظیم کرنا پڑتی ہے، دونوں کے سامنے بے چون و چرا سر جھکانا پڑتا ہے، دونوں کو یکساں طور پر حاکم مطلق تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس طرح خدا ہر قسم کی باز پرس سے برتر ہے اُسی طرح مستبد حاکم کو بھی عوام ہر طرح کی جواب طلبی سے

پرے اور اُسکی نگرانی اپنے لیے ناجائز سمجھتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ چونکہ عوام اپنے معبود اور ظالم بادشاہ کو بہت سے حالات و صفات و اسماء میں مشترک پاتے ہیں، اس لیے ظالموں کی تعظیم و تقدیس بھی قدرتاً ویسے ہی خوف و رجاء کے ساتھ کرتے ہیں، جیسے خود پروردگار عالم کی۔ اُنھیں اتنی سمجھ کہاں کہ "لایسئل عما یفعل" "منعم" اور "جل شانہ" وغیرہ الٰہی صفات اور "غیر مسئول" "ولی نعمت" اور "جلیل الشان" وغیرہ شاہی القاب کا درمیانی باریک فرق سمجھ سکیں۔

اسی صورت حال کا نتیجہ تھا کہ گذشتہ زمانوں میں مستبد بادشاہوں کو موقع مل گیا کہ الوہیت کے دعوے کریں، جنکی نوعیت اور کامیابی رعایا کی ذہنی استعداد کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی تھی، اور یہی دیکھ کر کہا گیا ہے کہ ہر مستبد اپنے لیے قدوسیت کی کوئی نہ کوئی شان ضرور تجویز کیا کرتا ہے۔ تاکہ اسکے ذریعہ خدا کا اُسکی زمین میں شریک بن سکے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم اُسکی ایک نہایت برگزیدہ اور محبوب مخلوق مانا جاسکے، اور اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو اتنا تو ہر مستبد ضرور کرتا ہے کہ استبداد پسند مذہبی پیشواؤں کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ ملا لیتا ہے، جو خدا اور مذہب کا نام لے کر مخلوق پر اُسکا ظلم و ستم مضبوط کرتے پھرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں "خاندان داؤد" اور "شاہ قسطنطین" بانیٔ قسطنطنیہ کا اپنی سلطنتوں میں مذہب کی اشاعت پر اس سرگرمی سے کمربستہ ہونا "فلپ دوم" شاہ اسپین، اور "ہنری ہشتم" شاہ انگلستان کا مذہب کی حمایت میں اِس زور شور سے اُٹھنا اور "محکمۂ احتساب" قائم کرکے "بدعقیدہ" لوگوں کا اس بیباکی سے خون بہانا، "حاکم بامر اللہ فاطمی" اور دوسرے عجمی بادشاہوں کا صوفیہ و مشائخ کی تائید و اعانت میں اس قدر فیاضی سے کام لینا، جا بجا تکیے اور خانقاہیں قائم کرنا، یہ سب محض اس لیے تھا، کہ مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی ہمدردی حاصل ہو تاکہ اپنا ظلم و جور بے روک جاری رکھ سکیں۔

ماہرین سیاست کا خیال ہے کہ مذہبی اور سیاسی استبدادوں کے مابین ایک ایسا قوی رشتہ موجود ہے کہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، دونوں لازم و ملزوم ہیں، جہاں ایک جاتا ہے، وہاں دوسرے کا پہونچنا بھی یقینی ہے، جب ایک زائل ہوتا ہے تو دوسرا بھی رخصت ہوجاتا ہے، جب ایک میں کمزوری یعنی اصلاح ہوتی ہے تو دوسرے میں بھی ضرور ہوتی ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ مسیحیت کو پیش کرتے ہیں، کہ جب پروٹسٹنٹ فرقہ کی شکل میں اُس میں اصلاح

ہوئی اور سکسونی قوموں میں مقبول ہوگئی تو سیاسی استبداد میں بھی تخفیف و اصلاح رُونما ہوئی، برخلاف اسکے رومن کیتھولک فرقہ نے چونکہ مذہبی اصلاح قبول نہیں کی اس لیے اس میں کوئی سیاسی اصلاح بھی بڑے پیمانہ پر نہ ہوسکی۔

غرضکہ تمام ائمۂ سیاست ہمزباں ہیں کہ سیاست و مذہب ہمیشہ شانہ سے شانہ ... جوڑے چلتے ہیں اور یہ کہ سیاسی اصلاح کا سب سے زیادہ آسان اور قریبی راستہ مذہبی اصلاح ہے۔

اُنکا خیال ہے کہ مذہب کے ذریعہ سیاسی اصلاح کی ابتداء سب سے پہلے حکماءِ یونان نے کی۔ اُنھوں نے اپنے مستبد اور سرکش حکمرانوں کو پابند کرنے اور اُنکا اقتدار توڑنے کے لیے یہ چال چلی کہ توحیدِ الٰہی کی جگہ شرک کو رواج دیا۔ یہ عقیدہ اُنھوں نے اشوریوں سے اخذ کیا، اور مصری افسانوں کے خرافات کی اُس میں رنگ آمیزی کرکے یہ سوانگ بنایا کہ نظام کائنات ایک خدا کے ہاتھ میں نہیں بلکہ متعدد معبودوں کے ہاتھوں میں ہے، ہر معبود ایک ایک شعبہ کا ذمہ دار ہے۔ اور اپنے دائرۂ عمل میں پوری آزادی رکھتا ہے۔ چنانچہ عدل وانصاف کی باگ ایک دیوتا کے ہاتھ میں ہے، جنگ دوسرے کے، سمندر تیسرے کے، بارش چوتھے کے۔ غرضکہ ہر ہر چیز کا الگ الگ دیوتا ہے، پھر سب دیوتاؤں کے سر پر ایک بڑا دیوتا ہے جسے خدا کہتے ہیں اور جسے انکی نگرانی اور انکے باہمی اختلافات میں مداخلت کا منصب حاصل ہے۔

جب ان فلاسفہ نے اِس عقیدہ کو اپنی فصاحت و قوت استدلال سے دلوں میں خوب پختہ کردیا، تو یونانی پبلک نے بڑی آسانی سے انکی یہ سیاسی دعوت قبول کرلی کہ بادشاہ بھی مقام وحدانیت سے نیچے اُتریں اور زمین میں بھی حکومت کا وہی نظام قائم ہو جو آسمان پر ہے۔ چنانچہ اُس نے پورے روحانی جوش و خروش کے ساتھ یہ مطالبہ اس بلند آہنگی سے کیا کہ بالآخر بادشاہوں کو مجبوراً سر جھکا ہی دینا پڑا۔ اسی عقیدہ کی بدولت بعد میں ایتھنز اور اسپارٹا میں جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں، رومانیوں نے بھی اسی کی پیروی کی، اور انھیں اصول پر اب تک تمام سلطنتوں اور جمہوریتوں میں مختلف وزارتوں پر نظامِ حکومت بٹا ہوا ہے۔

لیکن اس باطل عقیدۂ شرک سے جہاں یہ فائدہ ہوا تھا، بعد میں یہ عظیم الشان نقصان بھی ہوا کہ ہر طبقہ کے چالاک لوگوں کو الٰہی صفات اور روحانی تصرفات کے بیہودہ دعوے کا موقع مل گیا، جسکی پہلے بجز خاص خاص جابر بادشاہوں کے اور کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔

چونکہ یہ عقیدہ مختلف وجوہ سے عام انسانی طبائع کے موافق تھا اس لیے غیر معمولی سرعت سے مقبول ہو کر عام ہو گیا اور اُسکے ذریعہ مستبدوں کے اعوان و انصار اور خدمتگاروں کی ایک جرار فوج تیار ہو گئی۔

اس مشرکانہ دور کے بعد توراۃ آئی اور اپنے ساتھ ایک نئی روح اور ایک نیا نظام عمل لائی۔ اُس نے بنی اسرائیل میں شرک کی عمارت ڈھادی اور دیوتاؤں کی جگہ فرشتوں کو دیدی۔ مگر بعض اسرائیلی بادشاہوں کو خالص توحید نہ بھائی اور انھوں نے دست اندازی کر کے اُسے مسخ کر ڈالا۔

پھر انجیل نے آکر نرمی و بُردباری کی تعلیم دی اور وحدانیت پر از سر نو زور دیا، مگر اُسکے اولین داعی و مبلغ اُن پست اقوام کو جنھوں نے متمدن اقوام سے پہلے اُنکی دعوت پر لبیک کہا تھا، پوری طرح یہ بات نہ سمجھا سکے کہ "باپ اور بیٹے" کے الفاظ مجازاً استعمال کیے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِن اقوام نے یہ الفاظ حقیقی معنی میں لے لیے اور یقین کر لیا کہ مسیح، خدا کے سچ مچ ویسے ہی بیٹے ہیں جیسے انسانوں کے نسبی بیٹے ہوا کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو بڑی تقویت اس امر واقع سے پہونچی کہ وہ اپنے ظالم حکام کو پہلے ہی سے خدا کا بیٹا مانا کرتی تھیں، اس لیے اُنھوں نے گوارا نہ کیا کہ حضرت مسیح کو اُن سے کم رتبہ پر رکھیں۔ اس طرح مسیحیت نے بھی سابق مذاہب کی طرح بہت جلد اپنا اصلی چولا بدل ڈالا اور ارباب کلیسا کی تعظیم و تکریم میں اس قدر غلو کیا کہ اُنھیں آسمانی بادشاہت کا نائب، معصوم، قانون سازی کا اہل، اور شریعت میں تغییر و تبدیل کا مجاز قرار دیدیا۔ اگرچہ بعد میں پروٹسٹنٹ فرقہ نے اِس قسم کے اکثر امتیازات مسترد کر دیے اور مسیحیت کی ایک حد تک اصلاح کی۔

سب سے آخر میں اسلام، عقل و حکمت کا عَلم لینے کیلیے ظاہر ہوا، اُس نے شرک کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا، جمہوریت (ڈیموکریسی) اور امرائیت (ارسٹوکریسی) کے بین بین سیاسی آزادی کے اصول قائم کیے، توحید کو غیر متزلزل بنیادوں پر استوار کیا، اور دنیا کے سامنے خلفائے راشدین جیسی ایک حکومت پیش کی جسکی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی، حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں بھی پھر ویسی حکومت قائم نہ ہو سکی۔

خلفائے راشدین نے قرآن خوب سمجھا تھا، اُسی پر انکا عمل تھا، اور وہی شمع ہدایت بنکر اُنکی رہنمائی کرتا تھا۔ چنانچہ اُسی کی روشنی میں اُنھوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جس نے ہر قسم

کے امتیازات اُٹھا دیے، حتیٰ کہ اپنے سب سے بڑے عہدہ دار، یعنی خلیفہ، اور قوم کے ایک ادنیٰ دریوزہ گر، دونوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ اسلامی خلیفہ کو نہ کوئی امتیاز حاصل تھا، نہ اُسکی معیشت ہی کسی حیثیت سے فقیروں سے بہتر تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان اسلامی حکمرانوں نے مسلمانوں میں برادری، رواداری اور مشترک خانگی و اجتماعی زندگی کے ایسے گہرے رشتے قائم کر دیے تھے کہ اُن حقیقی بھائیوں میں کم ملتے ہیں جو ایک ہی باپ کے سایۂ عاطفت میں پلتے اور ایک ہی ماں کی گود میں کھیلتے ہیں۔

اسلام نے ہر قسم کا روحانی و مذہبی اقتدار اُٹھا دیا تھا، اُسکے ہاں نہ کوئی پوپ تھا، نہ پروہت۔ بجز ایک رسول کے (اور وہ بھی صرف تبلیغِ شریعت میں) کسی انسان کو بھی معصومیت کا درجہ حاصل نہ تھا۔ اُس نے وہ تمام ہتکڑیاں بیڑیاں توڑ کر پھینکدی تھیں جنمیں انسان ہمیشہ قید کیے جاتے تھے، اور وہ تمام امتیازات و اختیارات باطل کر دیے تھے جو دوسرے مذاہب میں مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہو گئے تھے۔

لیکن افسوس! جاہلوں کے ہاتھوں یہ دین بھی مارا گیا۔ انھوں نے اُسکی ہدایت پسِ پشت ڈالدی اور اسکی روشن پیشانی پر ذلت و خواری کی مُہر لگا دی۔ افسوس یہ دین وہی دین ہے جسکے اعوان و انصار، اخیار و ابرار، علما و عرفا، سب کے سب دستبُردِ زمانہ سے گُم ہو گئے مستبد حکام نے پرورش کی اور اُسے قوم میں شقاق و نفاق، تفریق و تقسیم، قتل و غارت، اور اپنی ہوسناکیوں کا آلہ بنا لیا۔ دیگر پیروانِ مذاہب کی طرح اُنھوں نے بھی اُس میں قسم قسم کی زیادتیاں اور اضافے کیے اور اُسے اس درجہ بگاڑا کہ اب عوام کیا خود خواص تک حق و باطل کی تمیز سے درماندہ نظر آتے ہیں۔ اُسے اس قدر مشکل اور پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس موجودہ شکل میں کوئی بھی اُسکے احکام و واجبات، فرائض و مستحبات و آداب پر پورا پورا عمل نہیں کر سکتا۔

اِس تحریف و تشدید کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب امت مذہب پر نہ چل سکی تو اُسے اپنی کوتاہی محسوس ہوئی اور یقین ہو گیا کہ نجات و فلاح اور محاسبۂ نفس کی راہ ناقابلِ گزر ہے، اس پر گام زن ہونا قدرتِ انسانی سے باہر ہے۔ ظاہر ہے جب انسان کی پستی اس قدر بڑھ جاتی ہے تو نفس ذلیل ہو جاتا ہے، سر جھک جاتا ہے، آواز پست ہو جاتی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جرأت مفقود ہو جاتی ہے، کہ جس پر شریعت، نظامِ حکومت، اور انضباط

و عدالت کا مدار ہے ۔

امتِ اسلامیہ کی اس غفلت اور ڈھیل نے امراء و حکام کے سامنے ظلم واستبداد کی راہیں کھولدیں ۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑی دلیری سے حدود اللہ کو شکست کر دیا اور امتِ مرحومہ کو ذلیل و خوار کرکے اپنا غلام بنالیا

بعض اہل نظر نے اُن تمام امور کا استقصا کیا ہے جو اسلام میں نہ تھے مگر مسلمانوں نے غیروں سے اخذ کر لیے ہیں ۔ مثلاً پاپائیت، اور اُسکے مظاہر، بزرگوں کی تعظیم درجۂ عبادت تک، اسلاف کی مذہبی تقلید، بطریقوں، گرڈینالوں، شہیدوں اور ہر ہر شہر کے اسقفوں کی طرح علٰحدہ علٰحدہ مذہبی عہدے، قدیسیوں کی ظاہری شکل وصورت کی نقل، پادریوں کا تجرد، دیروں کی طرح خانقاہوں کی تعمیر، رہبانیت کا رواج، مسیحی پیشواؤں کی طرح فرقِ مراتب، لباس، اور بالوں کا اختلاف، گرجا کی مساجد میں نقل، اُنکی آرائش میں اسراف وغلو مسیحی نمازوں کی اسلامی عبادتوں میں تقلید، راگ و سرود کا عبادت میں شمول، مسیحی گرجوں کی طرح قبروں پر مساجد کی تعمیر، مزاروں کی زیارت کے لیے شدِّ رحال (سفر) اُن میں چراغاں کرنا، اُنکے آگے جھکنا، اہل قبور سے طالبِ امداد ہونا، بزرگوں کے عمامہ وعصا وغیرہ سے برکت حاصل کرنا، ولیوں کا ذکر سُن کر سینہ پر ہاتھ پھیرنا جس طرح عیسائی سینہ پر اُنگلی سے صلیب کا نشان بناتے ہیں

اسکے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں مسلمانوں نے دوسروں سے لیکر مذہب میں داخل کر دی ہیں ۔ چنانچہ "حقیقت" کو "مسیحی" "سِر" سے اخذ کیا ہے، "وحدۃ الوجود" کو "مسئلۂ حلول" سے، "مولد نبوی" کو "میلادِ مسیح" سے "محفلِ میلاد" کو "مسیحی عیدِ میلاد" سے، جھنڈے اُٹھانا صلیب اُٹھانے سے، دیواروں پر خلفا کے ناموں اور دعاؤں کا آویزاں کرنا، تصویروں اور بتوں کے دیواروں پر آویزاں کرنے سے، صوفیوں کا مراقبہ، بتوں کے سامنے آسن مار کر قلب کی یکسوئی کے لیے بیٹھنے سے ۔ غرضکہ یہ اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جو باہر سے آگئی ہیں، اسلام کو اُن سے کوئی سروکار نہیں ۔

اسی طرح کتاب وسنت سے براہِ راست ہدایت حاصل کرنے سے منع کرنا رومن کیتھولک پادریوں سے ماخوذ ہے جو انجیل سمجھنے سے اپنے علاوہ اور سب کو روکتے ہیں، یا یہودیوں سے جنھوں نے تورات کا دروازہ بند کر دیا ہے اور پورے مذہب کا دارومدار "تلمود" پر کر دیا ہے جسکا چھوٹا [illegible] وں کے ہاں "فقہ" کے نام سے مشہور ہے ۔

اسی طرح فلاک کے ذریعہ غیب معلوم کرنا، ستاروں کی گردش سے خوف زدہ ہونا، آگ کی تعظیم کرنا، لوبان دانیوں کو عبادت گاہوں میں رکھنا .... مجوسیوں سے لیا گیا ہے۔

ان بدعات و خرعبلات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی سب استبداد کی بڑھانے والی اور غلامی کی بیڑیاں انسان کے پیروں میں ڈالنے والی ہیں۔ یہی وہ راہ ہے جس پر چل کر تمام مذاہب بگڑے اور انسان پر شقاوت چھائی۔ مسیحیت کے بگڑنے کی بھی یہی صورت ہوئی تھی، چنانچہ مسیحی محققین نے صاف کہدیا ہے کہ انکا پورا مذہب حتیٰ کہ عقیدہ تثلیث بھی کہ جس پر موجودہ نصرانیت کا دارومدار ہے، محض ایک اضافی شے ہے، خود حضرت مسیح کے اقوال میں اسکا پتہ نہیں۔ موجودہ مسیحیت کی بنیاد جن اصول و عقائد پر ہیں، سراسر من گڑھت ہیں جن میں سے بعض تو خود عیسائیوں کے خود ساختہ ہیں، اور اکثر دوسری قوموں سے لیے گئے ہیں۔ چنانچہ ماہرین مصریات کو قدیم مصری عبادت خانوں اور گورستانوں سے ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جن سے مسیحیت کی اکثر الٰہیات کا پتہ چل گیا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے تلمود اور انکی بدعتوں کی اصلیت بھی معلوم ہوگئی ہے کہ وہ کلدانی افسانوں اور خرافات سے ماخوذ ہیں۔ عیسائیت و یہودیت ہی نہیں بلکہ مشرق قریب کے تمام مذاہب کی خرافات کے متعلق بھی تحقیق ہوگیا ہے کہ سب کی سب مشرقی علما، و فلاسفہ کی گڑھی ہوئی ہیں اور اصل دین سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔

غرضکہ جتنی بدعتوں نے بھی ایمان کا خوشنما چہرہ بگاڑا ہے، تمام کی تمام ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہیں اور ایک ہی مقصد رکھتی ہیں، یعنی انسان کو استبداد کی بھاری زنجیروں سے جکڑیں، صرف جسم ہی کو نہیں بلکہ دل و دماغ کو بھی، کیونکہ آزاد دل و دماغ کسی حال میں بھی استبداد قبول نہیں کر سکتا۔

استبداد اور علم

مستبد حکمراں کا برتاؤ اپنی رعایا سے بالکل ویسا ہوتا ہے جیسا دغاباز سرپرست کا دولتمند یتیموں سے ہوتا ہے۔ چونکہ اُن کے مال و متاع میں غبن و تصرف کا موقعہ اُسی وقت تک ہے جب تک وہ بے سمجھ اور نابالغ ہیں، اس لیے اُسکی مصلحت ہمیشہ یہی ہوتی ہے،

کہ وہ بالغ نہ ہونے پائیں۔ بعینہ اسی طرح مستبد بھی ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ اُسکی رعایا کبھی بھی صحیح علم سے روشناس نہ ہونے پائے کیونکہ خوب جانتا ہے اُسکا یہ ظلم و استبداد اُسی وقت تک ہے جب تک رعایا جہالت کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں پڑی ہے۔ اسی مناسبت سے تشبیہ دی گئی ہے، کہ اگر مستبد حاکم، پرندہ ہوتا تو چمگادڑ ہوتا اور اندھیری رات میں مخلوق کو شکار کرتا پھرتا، اور اگر وحشی جانور ہوتا تو گیدڑ ہوتا اور تاریکی میں انسانی مرغیوں کو اُٹھا لے جایا کرتا!

علم، انوار الٰہی میں سے ایک نور ہے۔ جس طرح خدا نے درخشاں آفتاب کو روشنی، حرارت اور زندگی کا سرچشمہ بنایا ہے۔ اسی طرح علم کو ظلم و جور کی پردہ دری کرنے، شر و فساد کی حقیقت کھولنے، قلب میں حرارت پیدا کرنے اور سر میں خودداری قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ پھر مستبد اسے کیونکر پسند کر سکتا ہے؟

مستبد، شعر و ادب سے نہیں ڈرتا، البتہ اگر لفاظی کے پردے دلوں کو گرما دینے والی حکمت، سوتوں کو جگا دینے والی فصاحت اور جرار فوجوں کو جمع کر دینے والی بلاغت ہوتی ہے، تو البتہ وہ شعر و ادب سے بھی کانپ جاتا ہے، لیکن چونکہ اُسے خوب معلوم ہے کہ کمیت و حسان، مانٹسکیو[1] اور شیلر[2] جیسے آتش زباں شعرا، و فصحا، کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، اس لیے وہ ادبی علوم سے زیادہ نہیں ڈرتا۔

اسی طرح ان مذہبی علوم سے بھی وہ خائف نہیں ہوتا، جنکا تعلق صرف قیامت و آخرت سے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے علوم نہ تو قلب سے غفلت کی کائی دور کر سکتے ہیں نہ آنکھوں سے عمایت کے پردے، بلکہ ان میں انہماک رکھنے والے عموماً ایک طرح کے مجنون اور مخبوط الحواس لوگ ہوتے ہیں جنھیں عملی زندگی اور دنیا کے سود بہبود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ایسے از کار رفتہ لوگوں سے مستبد کو کیا خوف ہو سکتا ہے؟ اور اگر کبھی کبھی اُن میں کوئی اولوالعزم ہو جاتا ہے، شہرت پاتا ہے، عوام میں اقتدار حاصل کر لیتا ہے تو مستبد اُسے چمکار کر پاس بلاتا ہے اور اپنے خوان استبداد پر سے چند لقمے اُٹھا کر اُسکے منہ میں ٹھونس دیتا ہے تاکہ ہمیشہ بند رہے اور اگر کھلے تو اُسکی تائید میں کھلے۔

---

(۱) ایک مشہور فرنچ فلاسفر اور مصنف (پیدائش ۱۶۸۹ء۔ وفات ۱۷۵۵ء)

(۲) شہرۂ آفاق جرمن شاعر (پیدائش ۱۷۵۹ء۔ وفات ۱۸۰۵ء)

مولوی عزیز مرزا مرحوم

- ...یالات عزیز ؏؍
- وکرم ماسی ؏؍

خواجہ عباد اللہ اختر

- صدیق اکبر ؏؍
- ...ہت شنید ۶؍
- ...ساہر سلام ؏؍
- ...داد ؏؍
- ...شق ؏؍
- ...یوان حافظ مع شرح ؏؍

منشی انوار الحق ایم اے

- تاریخ ابو البشر ؏؍
- ...ۃ الحبیب ؏؍
- ...الق اسلام ؏؍

...یا اللہ بی اے

- ...گی ؏؍
- ...الکرام ؏؍
- ...سان الغیب جلد اول ؏؍
- جلد دوم ؏؍
- جلد سوم ؏؍
- جلد چہارم ؏؍

...مسعود بی اے

- ...اب زرین ؏؍
- ...نصاب اردو ؏؍
- ...ب کا تعلیمی نظم ؏؍

مولانا حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب ؏؍
- کمل دیوان حسرت ؏؍

سید سجاد حیدر بی اے

- خیالستان ؏؍
- ثالث بالخیر ۸؍
- زہرا ۱۲؍

مسٹر مظفر عمر بی اے

- چلدون کا کلب ۹؍
- نیلی چھتری ؏؍
- بہرام کی گرفتاری ؏؍
- مستقبل اسلام ؏؍

پروفیسر فیروز الدین مراد

- تحفہ سائنس ؏؍
- بادل کے بچے ؏؍
- خونابۂ عشق ؏؍

حکیم احمد شجاع بی اے

- باپ کا گناہ ؏؍
- حسن کی قیمت ؏؍
- مینا ۱۲؍

منشی عبد المجید سالک بی اے

- راہ و رسم منزلہا ۸؍
- چھپا ہوا گرا افسانے ؏؍
- پتھر (دیگور) ۸؍

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ؏؍
- شباب لکھنؤ ؏؍

مولوی عبد الماجد بی اے

- فلسفہ جذبات ؏؍
- مکالمات برکلے ؏؍
- پیام امن ؏؍
- تصوف اسلام ؏؍
- نعوذ و نشان ۸؍

منشی محمد لطیف بی اے

- اکبر ؏؍
- اورنگ زیب ؏؍
- رنجیت سنگھ ؏؍
- لارڈ کلایو ؏؍

پروفیسر نواب علی ایم اے

- معارج الدین ؏؍
- تذکرۃ المصطفیٰ ؏؍
- صحف سماوی ؏؍
- شمع سخن ۱۰؍

پروفیسر محمد الیاس برنی ایم اے

- اسرار حق ؏؍
- جذبات فطرت ؏؍
- معارف ملت ؏؍
- مناظر قدرت ؏؍
- علم المعیشت ؏؍

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن ؏؍
- حیات امام مالک ؏؍
- خلافت عثمانیہ اور اسلام ؏؍
- خلافت اور ہندوستان ۸؍
- خلافت اور دنیائے اسلام ۶؍

مولوی عبد السلام ندوی

- اسوۂ صحابہ ۲ جلد ؏
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز ؏؍
- انقلاب الامم ؏؍

مولوی عبد الباری ندوی

- مبادی علم انسانی ؏؍
- برکلے کا فلسفہ ؏؍

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ ؏؍
- سیر انصار ؏؍
- سیر الصحابیات ؏؍

مولوی عبد الرزاق ندوی

- اسوۂ حسنہ ؏؍
- میلاد نامہ جدید ۸؍
- ٹرکی اور یورپ ۶؍

مولوی محمد یونس فرنگی محلی

- روح الاجتماع ؏؍
- ابن رشد ؏؍

خواجہ حسن نظامی

- قرآن آسان قاعدہ ؏؍
- میلاد نامہ ؏؍
- محرم نامہ ؏؍
- فاطمی دعوت اسلام ؏؍
- ذکر غوث پاک ۱۲؍
- کرشن جیون ؏؍
- سیپارۂ دل ؏؍
- کم تو موت ؏
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲؍
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲؍
- خطوط حسن نظامی ۱۲؍
- بیوی کی تعلیم ؏؍
- بیوی کی تربیت ؏؍
- اولاد کی شادی ؏؍
- جنگ بیتی کہانیاں ۸؍
- آپ بیتی ؏؍
- بچوں کی کہانیاں ۱۰؍
- سیر دہلی ۱۲؍
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ ؏
- غدر دہلی کے افسانے ؏
- یزید نامہ ؏
- طمانچہ بر رخسار یزید ؏؍
- اردو کی دعائیں ۸؍
- تسکین اساس ۸؍
- روزنامچہ ہند ۱۲؍
- کبرو کے غیبی نوشتے ۸؍
- اسلام کا انجام ۶؍
- تسخیر مہر و قمر ۱۰؍

مولوی عبد الراشد الخیری

- الزہرا ۱۲؍
- صبح زندگی ؏
- شام زندگی ؏
- شب زندگی ؏؍
- نوحۂ زندگی ۱۲؍
- نور شہوار ۱۰؍
- منازل السائرہ ؏؍
- سراب مغرب ۸
- بنت الوقت ۸
- قطرات اشک ؏
- جوہر قدامت ؏
- عروس کربلا ؏
- یاسمین شام ؏
- تیغ کمال ؏
- ماہ عجم ؏
- آفتاب دمشق ؏؍
- سمنا کا چاند ؏

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن ؏
- گلستان جاں ؏
- نگارستان ؏
- صحابیات ؏
- تاریخ الدولتین ؏

یاس عظیم آبادی

- چراغ سخن ؏
- نشتر یاس ۸

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۷۱ — جلد ۲۹

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

کف و کھانسی کی دوا

کھانسی اُم الامراض ہے۔ یہ مثل بالکل درست ہے۔ کیونکہ کھانسی کی وجہ سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں سردی سے ابتدا میں کھانسی ہوتی ہے۔ اگر بروقت علاج نہ کیا گیا تو سانس کی نلیوں میں بلغم جمع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ دم کی رُکاوٹ اور پسلیوں میں درد۔ بخار۔ دق۔ سل۔ مراق وغیرہ مختلف امراض میں مریض مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہذا سردی یا کھانسی شروع ہوتے ہی مناسب دوا استعمال کرنا لازم ہے۔ ایسے مہلک مرض کے قلع قمع کرنے کیلئے ڈاکٹر ایس کے۔ برمن کی ایجاد کردہ "کف و کھانسی کی دوا" از حد مفید ہے۔ وقت ضرورت کے لیے ہر گھر میں اسکی ایک شیشی موجود رکھنی چاہیے۔ قیمت فی شیشی کلاں ۱۴؍ ایک روپیہ چار آنہ۔ خورد ۱۰؍ دس آنہ۔ محصول ڈاک و پیکنگ ۸؍ آٹھ آنہ و ۶؍ چھ آنہ

دمہ دم کے ساتھ ہے یہ بات صریح غلط ہے

کیونکہ ڈاکٹر برمن کی ایجاد کردہ "دمہ کی دوا" عرصہ ۴۲ سال سے ہندوستان کے ہر حصہ میں شہرت کے ساتھ مفید ثابت ہوئی اور لاکھوں مریض ہر سال شفا پا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مریض بازاری زیادہ تر نشیلے اجزا دھتورہ بھنگ بلاڈونا۔ پوٹاش وغیرہ مضر اشیا آمیز دوا استعمال کرکے بجائے فائدہ کے نقصان اُٹھا کر مایوس ہو بیٹھتے ہیں۔ اور عمر غیر طبعی میں مارے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کی کیمیائی اصول سے بنائی ہوئی "دمہ کی دوا" ایک بیش قیمت جوہر ہے۔ اسکی ایک ہی خوراک سے دمہ موقوف ہو جاتا ہے اور کچھ روز کے استعمال سے جڑ سے نابود ہو جاتا ہے۔ اور کبھی دمہ کا دورہ نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ آزما کر دیکھیے۔ قیمت فی شیشی ۱۸؍ ایک روپیہ آٹھ آنہ محصول ڈاک ۶؍ چھ آنہ

مفصل حال دریافت کرنے کے لیے بڑی فہرست مفت منگا کر دیکھیے

نوٹ۔۔ ہماری دوائیں ہر جگہ ہر ایک دوا کے دکاندار و ہمارے ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں دوا منگانے سے پہلے آپ اپنے مقام کے دکانداروں سے دریافت کیجیے

ڈاکٹر ایس کے برمن پوسٹ بکس ۵۵۴ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ ۔ لنکا رام جیتی ٹربل ہال ۔ چوک ۔ لکھنؤ

مطبوعاتِ جدیدہ

تصانیف مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

حکایاتِ لطیفہ - لڑکوں اور لڑکیوں کو عمدہ پیرایہ میں اچھی اور کام کی باتیں بتلانے کے لیے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے جسے وہ آسانی سے پڑھ کر سمجھ لیں اور بغیر یہ خیال کیے ہوے کہ کوئی اُنکو نصیحت کر رہا ہے عمدہ مثال سے سبق حاصل کریں۔ کتاب کے تین حصے ہیں حصہ اول میں ۱۷۸ - حصہ دوم میں ۱۱۳ - اور حصہ سوم میں ۱۲۲ حکایتیں ہیں۔ قیمت فی حصہ عہ

لطائفِ عجیبہ؛ چٹکلوں اور ظریفانہ باتوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا دل بہت لگتا ہے اسلیے لطیفوں کو بھی نصاب تعلیم میں جگہ دیگئی ہے - اس کتاب میں بھی عجیب لطیفے جمع کیے گئے ہیں - حصہ اول میں ۲۶۰ حصہ دوم میں ۲۴۶ - اور حصہ سوم میں ۲۱۹ لطیفے ہیں - قیمت فی حصہ عہ

تصانیف خواجہ حسن نظامی دہلوی

دہلی کا آخری سانس - خواجہ صاحب کی کتاب "غدر دہلی کے افسانے" بہت مقبول ہوئی ہے یہ اسکا نواں حصہ ہے جسمیں بمبئی کے فارسی اخبار احسن الاخبار سے ۴۶-۱۸۴۷ء کے حالات تبصرہ درج کیے ہیں - قیمت عہ

روزنامچہ - خواجہ صاحب نے دسمبر ۱۹۲۰ء سے دسمبر ۱۹۲۱ء تک اپنا روزنامچہ ایک اخبار میں شایع کر دیا تھا اب کتابی صورت میں چھاپا ہے قیمت [illegible]

انتخاب صحاح ستہ

مولوی نیاز علی صاحب پنشنر اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس نے حدیث شریف کی مشہور چھ کتابوں سے ۹۵۰ حدیثیں منتخب کرکے اُن کا ترجمہ شایع کیا ہے - اور ناظرین کی آسانی کے لیے ایک فہرست بلحاظ مطالب مرتب کر دی ہے تاکہ جس مضمون کی حدیث درکار ہو بآسانی ملجائے - آخر میں بنظر احتیاط اصل عبارتِ حدیث بھی درج کر دی ہے - اور قیمت محض رفاہ عام کی غرض سے صرف عہ رکھی ہے -

شعر الہند (حصہ اول)

مولانا شبلی مرحوم کی شعر العجم کے انداز پر اُنکے شاگرد رشید مولانا عبد السلام ندوی نے شعر الہند ترتیب دی ہے جسمیں قدما کے دور سے لیکر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے - ابھی صرف پہلی جلد شایع ہوئی ہے قیمت للعہ

سیر الانصار (حصہ دوم)

پہلا حصہ اسی سال کے شروع میں شایع ہوا تھا، اب دوسرا حصہ بھی تیار ہو گیا ہے دونوں حصوں کے مطالعہ سے جلیل القدر اصحاب رسول کے عادات و اخلاق اور تمام معاشرت کا اندازہ کیا جا سکیگا جنکی [illegible]

کی ثنا و صفت میں خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص لطف آتا تھا۔ قیمت حصہ اول ۸؍ حصہ دوم ۸؍

جلال الدین خوارزم شاہ

اُردو کے مشہور ادیب جناب سید سجاد حیدر (یلدرم) بی اے نے ترکی زبان کے مشہور مصنف نامق کمال بک کے ایک تاریخی ڈرامہ کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ قیمت ۱۲؍

لیلیٰ - یا - محاصرۂ غرناطہ

لارڈ لٹن کا وہ مشہور انگریزی ناول جسکا ترجمہ کسی زمانہ میں جسٹس سید محمود مرحوم نے تہذیب الاخلاق میں شایع کرنا شروع کیا تھا۔ اب مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر تہذیب النسواں کے خلف اصغر سید امتیاز علی صاحب تاج نے ترجمہ کرکے شایع کیا ہے۔ کتاب قابل دید ہے۔ قیمت ۸؍

نغمۂ زار

پنجاب کے مشہور شاعر جناب حفیظ جالندھری کا مجموعۂ کلام۔ قیمت ۱۲؍

شاہان مالوہ

منشی امیر احمد علوی بی اے نے جنکے مضامین سے ناظرین الناظر برابر لذت اندوز ہوتے رہتے ہیں سلاطین مالوہ و گجرات کے حالات خاندان تغلق کے آخری زمانہ سے عہد شہنشاہ اکبر تک لکھے ہیں۔ کتاب کے ادبی محاسن بیان سے باہر ہیں۔ قیمت ۱۲؍

سفرنامۂ مظہری

جسکا ریویو آپ گذشتہ نمبر میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس میں حاجی مظہر علیم انصاری مرحوم کے چہاردہ سالہ سفروں کا عطر پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف دور و دراز حصص اور بہت سے مشہور اور غیر معروف تاریخی مقامات کے ہر قسم کے حالات اس سفرنامہ میں ملیں گے۔ قیمت ۸؍

حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ

نواب مرزا یار جنگ مولوی مرزا سمیع اللہ بیگ صدر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد کی یہ کتاب پہلے "ہند عہد اورنگ زیب میں" کے نام سے گذشتہ سال شایع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔ اب دوبارہ نئے نام سے شایع کی گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن کے بھی چند نسخے موجود ہیں۔ قیمت ۸؍ جدید ایڈیشن ۱۲؍

انتخاب مخزن

لاہور کے مشہور رسالہ مخزن کے دو انتخاب پہلے شایع ہوچکے ہیں اب تیسرا انتخاب شایع ہوا ہے جسمیں تمام مضامین شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر مخزن کے لکھے ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ مجموعہ خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔ قیمت ۸؍

قصائد ذوق

ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب جج ہائیکورٹ الہ آباد نے باضافہ دیباچہ و فرہنگ قصائد ذوق کا ایک خوشنما ایڈیشن شایع کرایا ہے۔

قیمت ۸

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۷۱ جلد ۲۹ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء

سرمۂ تحقیق

بجواب

نقد النقد بیخودی

(سلسلۂ الناظر ماہ اگست سنہ ۱۹۲۵ء)

یہاں تک میں نے اُن اعتراضوں کے متعلق کچھ لکھا جو مجھ پر کیے گئے تھے صرف ایک دعوے کی حقیقت دکھا دینا ہے، انشاء اللہ مضمون اُسی پر تمام ہوگا - اب یہاں سے معترض علام نے صدر المحققین مرزا غالب پر کرم کیا ہے - اسکا اجمالی جواب صرف اس خیال سے کہ معترض کی دل شکنی نہ ہو لکھتا ہوں، مفصل جواب میری شرح میں نظر آئے گا - اللہ جانتا ہے کہ میں کسی سے اُلجھنا نہیں چاہتا - جناب طباطبائی نے جو اعتراض اُٹھانے کے قابل کیے ہیں وہ میں اپنی بساط بھر اُٹھا چکا ہوں، خدا نے چاہا تو میری شرح میں سب کا جواب شافی نظر آئے گا - جنابِ طباطبائی کے اعتراضوں کا جواب دینا اُردو زبان بولنے والوں کے لیے واجبِ کفائی تھا - میں نے اس واجب کو ادا کرنے کی سعی کی ہے - اب یہ خدا جانے اور اہلِ انصاف کہ میری سعی مشکور ہوئی یا نہیں -

جس طرح اُردو کی بربادی پر معترض نقاد کا دل کُڑھتا ہے اُسی طرح میرا بھی۔ کیا غضب ہے کہ میں سنگسار کیا جاتا ہوں۔ میں معترض نہیں مجیب ہوں۔ عجب تماشا ہے کہ جس نے مرزا غالب ایسے یگانۂ دہر پر بایں بیگناہی اتنے تیر مارے کہ کلیجا چھلنی کر دیا، اُس سے تو کسی نے کچھ نہ پوچھا، اور میں جو اُن تیروں کو نکالنا چاہتا ہوں تو مجھ پر پتھر برسائے جاتے ہیں۔ معترض نقاد کے انداز سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے:

خدا کے واسطے اسکو نہ ٹوکو یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

میں نے جناب طباطبائی کی کسی عبارت پر اعتراض کرنے کا ارادہ نہیں کیا، ورنہ جس طرح میری اُردودانی پر تیر باراں ہو رہا ہے وہی حالت یا اُس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی اُن جناب کی نظر آتی۔ اور اگر جناب موصوف کے ایسے دوستوں نے مجبور کیا، تو خدا گواہ ہے یہ عالم ہوگا

بوسۂ بے ادبم آں قدر آورد ہجوم کہ لب لعل ترا فرصتِ دشنام نداد

میں نے تو اُن اعتراضوں کا جواب جیسا دیا ہے خود معترض نقاد اور حضرت طباطبائی اپنے دل میں سمجھ لیں گے زبان سے کہیں یا نہ کہیں۔ الحمدللہ ابھی اردو لکھنے والے بھی ہندوستان میں باقی ہیں اور خدا انکے جانشینوں کو غریب اُردو کی حمایت اور قدردانی کے لیے رہتی دنیا تک رکھے۔ وہ بھی اگر اپنے فیصلہ کا اعلان نہ کر سکے تو اپنی جگہ پر تو کچھ نہ کچھ فرمائیں گے۔

جناب طباطبائی کی شرح سے میں اسوقت دو نمونے پیش کرتا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ پہلے کے متعلق سہو کاتب کے سوا شاید کچھ نہ کہا جا سکے، اور دوسرے کا جواب اسقدر خوبصورت ہوگا کہ جواب دینے والا اپنی عبارت پر خود حیران ہوگا:۔

۱۔ بھلا ناممکن الوقوع کونسی ترکیب ہے؟

اور صرف یہی ایک مقام ہے جہاں میں خود ناظرین کو شرح طباطبائی کی زیارت کی تکلیف دیتا ہوں اور اگر وہ اتنی زحمت بھی نہ اُٹھائیں تو میں حاضر ہوں

۲۔ جناب طباطبائی مرزا کے اس شعر کی شرح میں

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہُوا

فرماتے ہیں "اس شعر میں معنی کی نزاکت یہ ہے کہ شاعر حرکتِ لبِ عیسیٰؑ کو صدائے عیسیٰؑ کی حرکت سے مقدم سمجھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں پہلے حرکت لب ہی کی اوجھڑ سے مرگیا اور حریفِ دمِ عیسیٰؑ نہ ہوا" الخ

حرکتِ لب کی اوجھڑ، اور لب بھی کون، لبِ عیسیٰؑ۔ کیا کہنا ۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر

حقیقت میں کچھ بحث کرنا ہے تو میں نے جو غزل غالب کا حل لکھا ہے اُسپر ہو ورنہ ایسی مضمون نگاری سے تو شاید کوئی فائدہ نہیں جسمیں سو میں ایک اعتراض بھی ایسا نہ ہو جسپر قلم اُٹھانے کی ضرورت ہو۔

عرق نشستہ زنیدم رخ نکوے ترا　　　زمن مرنج کہ میخواہم آبروے ترا

کلام غالب پر معترض علام کے اعتراضات

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں　　　یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

ان اعتراضوں کا جواب دینے سے پہلے یہ کہدینا ضروری ہے کہ دوسرے پرچے میں جہاں معترض نے مرزا کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں وہاں لہجہ بہت نرم ہے اور میں اس ترحم کا شکر گزار ہوں۔ پہلے پرچہ میں زیادہ شدت تھی۔

اعتراض ۲۰-۱ عربی محاورہ ہے "اصلاح ذات البین" چنانچہ قرآن (مجید) میں ہے اصلحوا ذات بینکم۔ مرزا غالب اسے اصلاح بین الذاتین لکھتے ہیں۔

جواب۔ اسے مرزا کی غلطی سمجھنا کیا ضرور ہے، ممکن ہے کہ سہو کاتب ہو۔ اصلاح بین الذاتین مرزا کے رقعہ میں ہے جسکی نسبت مرزا نے شاید کہیں نہیں لکھا کہ اسکا پروف میری نظر سے گذر چکا ہے۔ جناب طباطبائی تو مرزا کے اُس دیوان (اُردو) میں سہو کاتب کے قائل ہوتے ہیں جسکی نسبت وہ اپنی شرح میں زور دیکر فرماتے ہیں کہ اس دیوان کا پروف خود مرزا نے دیکھا ہے۔ چنانچہ مرزا کے دو شعروں کے متعلق یہ فرمایا ہے

۱　کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق　　　ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

۲　افسردگی نہیں طرب انشائے التفات　　　ہاں درد بنکے دل میں مگر جا کرے کوئی

ارشاد طباطبائی ۵۲۵ میں کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے یہاں کی یا یہ ہونا چاہیے (شرح طباطبائی)

" طرب انشا بہت انوکھی ترکیب ہے۔ غالب سے ایسی رکاکت بعید ہے۔ عجب کہ انھوں نے طرب افزائے التفات کہا ہو، بلکہ یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ (ر ص ۲۴۲)

اور کچھ یہی دو مقام ایسے نہیں جہاں جناب شارح سہو کاتب کے قائل ہوے ہوں جس نے وہ شرح اچھی طرح دیکھی ہے وہ ایسے مقامات کا شمار بھی بتا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کے قابل تو یہی امر ہے کہ جہاں کوئی اصلاح دینا ہوئی سہو کاتب کے قائل ہوگئے، جہاں اعتراض کرنے کی لہر آگئی سہو کاتب کا خیال دریا بُرد ہوگیا۔ ان اشعار میں جو اصلاح تجویز ہوئی ہے اُسپر اسوقت

کچھ لکھنا ضرور نہیں۔

بہرحال اگر فاضل معترض اور قابل شارح کو یہی اصرار ہے کہ نہیں مرزا سے غلطی ہوئی اور ضرور ہوئی تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ ایسا ہی ہوگا۔ مرزا نہ فرشتہ تھے نہ امام، نہ نبی تھے نہ خدا۔ غلطی ہوئی ہوگئی۔

اعتراض ۱۲-۲ "تجدید عہد محاورہ ہے، مگر مرزا غالب فرماتے ہیں ع کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے۔ آخر اس اضافت مقلوبی سے کیا فائدہ الخ

جواب - اعتراض کا جواب دینے سے پہلے یہ کہہ دینا ہے کہ جتنے اعتراض معترض باخبر نے کیے مجھے سب سے زیادہ یہی پسند آیا اسلیے کہ گو یہ اعتراض صحیح نہیں مگر مجیب کو دماغ پر زور دینے کی ضرورت تو محسوس ہوتی ہے ورنہ اور اعتراضوں کے جواب میں دفتر کے دفتر اُلٹ دینے اور بہت سا وقت عزیز معترض نقاد کی مسند پر قربان کر دینے کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔ بھلا اس سے دماغ کی کیا ضیافت ہو سکتی ہے کہ ایسا میرؔ نے بھی کہا سوداؔ نے بھی کہا، ذوقؔ نے بھی کہا انیسؔ نے بھی کہا۔

اب میں اپنی شرح کا ایک صفحہ نقل کیے دیتا ہوں جس سے جناب طباطبائی کا اعتراض اور اعتراض پیدا کرنے کی کوشش اور میرا جواب معلوم ہو جائے گا۔ غالب

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی		کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ارشاد جناب طباطبائی: یہاں مصنف نے تفنن کلام کی راہ سے (تجدید عہد تمنا) کے بدلے (عہد تجدید تمنا) کہا ہے۔ گو محاورہ سے الگ ہے مگر معنی درست ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ دھوکا کھایا جیسے (اصلاح ذات البین) کے مقام پر اصلاح بین الذاتین لکھ گئے۔ وہ فقرہ یہ ہے کہ "اگر خدانخواستہ مجھ میں اور مولوی صاحب میں رنج پیدا ہوتا تو آپ بہت جلد اصلاح بین الذاتین کی طرف متوجہ ہوتے"۔

بیخود: اس ناچیز کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب معنی درست ہیں تو اعتراض کی کیا وجہ۔ اور اعتراض کی تائید کے لیے رقعۂ غالب کی عبارت نقل کر دیگئی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ شارح مرزا پر اعتراض کرنے کا کُل سامان لیس کر کے بیٹھا ہے اور ذرا سا موقع ملے تو ترکش خالی کر دینے پر تُلا ہوا ہے۔ اور اس اہتمام سے صاف ظاہر ہے کہ شارح مرزا سے کہاں تک حُسن ظن رکھتا ہے اور یہ بھی آئینہ ہو جاتا ہے کہ اُسے اعتراض آفرینی کے مقابلہ میں شرح کلام کی کچھ پروا نہیں۔ اب میں ان کا فرق بیان کرتا ہوں۔ عہدِ تجدید تمنا اور تجدید عہد تمنا میں فرق ہے، اور اتنا نازک کہ حضرت طباطبائی سا سخن فہم جناب طباطبائی سا نقاد اُلجھتا ہے اور اعتراض جڑ دیتا ہے۔

تجدید عہد تمنا کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے جو تمنا کرنے کا عہد کیا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے یا اُس میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے یا اپنے کو عہد پر مضبوطی سے قائم رکھنا مقصود ہے اسلیے ہم تجدید عہد کرتے ہیں یعنے نئے سرے عہد کرتے ہیں کہ تمنا ضرور کریں گے۔ اور عہد تجدید تمنا کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے ہم نے صرف تمنا کی تھی، یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تمنا ضرور کریں گے لیکن اب ناکامی و مایوسی کے بعد ہم جو ہاتھ مل رہے ہیں اُس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم تمنا کرکے پچتانے ہیں بلکہ عہد کر رہے ہیں کہ تمنا کی تجدید ضرور کریں گے۔ ان دونوں باتوں کا فرق ظاہر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر کو اضافت مقلوبی (یہ لفظ فاضل مضمون نگار کا ہے) سے کیا تعلق ہے اور تجدید عہد کے محاورہ سے کیا علاقہ۔ جس طرح تجدید عہد محاورہ ہے اُسی طرح عہد کرنا بھی محاورہ ہے۔

صاف لفظوں میں شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ عالی ہمت اور منچلے ہیں ناکامی اُنکے ارادوں کو پست نہیں کرتی بلکہ جتنی ناکامیاں زیادہ ہوتی جاتی ہیں اُتنی ہی اُنکی ہمت بلند اور عہد استوار ہوتا جاتا ہے۔ (شرح بیخود (غیر مطبوعہ) صفحہ ۲۷۵۔)

اعتراض ۲۲-۳　　　تنافر

خلاصۂ عبارت اعتراض: تنافر عیب ہے مگر غالب مرحوم فرماتے ہیں ع

کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جواب۔ تنافر عیب ہے۔ وہ مرزا کے یہاں ہو یا کہیں اور۔ لیکن یہ عیب ایسا ہے جس سے کوئی بتلا نہیں بچا۔ اسکی ہزاروں مثالیں دیجا سکتی ہیں۔ ہاں نثر عاری میں تنافر زیادہ اعتراض کے قابل ہے جیسا یہاں ہے:

"تیرے اشتیاق قتل میں ایسا جذب و کشش ہے کہ تلوار کا دم اُسکے سینہ سے باہر کھنچ آیا ہے"
(شرح طباطبائی صفحہ ۲۱)

اب میں تنافر کی چند مثالیں ایسے شاعر کے کلام سے پیش کرتا ہوں فصاحت جسکا کلمہ پڑھتی ہے:-

گھوڑے کو کسی باگ پہ پھلتے نہیں دیکھا (بند ۹۹ مطلع: دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر، انیس طاب ثراہ)

شہباز اجل صید پہ پر کھول کے آیا۔ (بند ۹۱　"　"　")

وہ تیز منہ کہ کوہ کو کھانے مثال کاہ۔ (بند ۸۶ مطلع: رطب اللساں ہوں مدح شہ خاص و عام میں۔ صفحہ ۱۵۲ جلد سوم")

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا کے مصرعہ کی جو موجودہ صورت ہے اس میں غضب کا تنافر ہے، تین کاف ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ لیکن حسن ظن کا قدم درمیان میں ہوتا تو یہ مقام مشکل ایسا تھا کہ بے تامل

کہدیا جاتا کہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اسلیے کہ اگر 'کہ' 'جو' سے بدل جائے تو کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی اور 'کہ' کہنا پڑھتے وقت زبان رُکتی ہے۔ اور یہ وہ کراہت ہے جو موزوں طبع بچوں کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ مرزا سے اسکی توقع رکھنا سوء ظن نہیں تو کیا ہے۔ اور یہی حال میر انیس مرحوم کے آخری مصرعہ کا ہے وہاں بھی 'کہ' جو سے بے تکلف بدلا جا سکتا ہے۔ اور اگرچہ انیس مرحوم کے پہلے دو مصرعوں میں جو عیب تنافر ہے وہ مصرعوں کو تلپٹ کیے بغیر نکل نہیں سکتا لیکن اہل ذوق انکی خوبی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ تنا ملکر پہلا مصرعہ تو اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ع۔ گھوڑے کو کسی باگ پہ پھٹتے نہیں دیکھا۔

تنافر کے مسئلہ میں مجھے جناب طباطبائی کا یہ قول بہت پسند ہے جو غالب کے اس شعر کی شرح میں لکھا ہے:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اور اسکے پسند آنے کی وجہ یہ ہے کہ انصاف سے بیگانہ نہیں۔

"(جو) کا واؤ وزن سے ساقط ہوگیا، اور یہ درست ہے بلکہ فصیح ہے لیکن اسکے ساقط ہو جانے سے دو یائیں جمع ہو گئیں اور عیب تنافر پیدا ہو گیا، لیکن خوبیِ مضمون کے سامنے ایسی باتوں کا کوئی خیال نہیں کرتا۔" (شرح طباطبائی صفحہ ۲۱)

لیکن وہ شعر جس پر اسوقت بحث ہو رہی ہے اُس میں اس قول طباطبائی سے کام لینے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ سہو کاتب کے احتمال کی گنجایش زیادہ ہے اور 'کہ' جو سے بدلا جا سکتا ہے۔

اعتراض ۲۳-۱۲ **اثبات - پیچ**

مرزا غالب فرماتے ہیں   نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا   کیا شارح یہ نہ بتائے کہ اثبات مذکر ہے۔ غالب کبھی بات کی پیچ، کبھی بات کا پیچ کہتے ہیں۔

جواب - حقیقت یہ ہے کہ جناب طباطبائی نے شرح لکھتے وقت اور حضرت ادبار الشعرا نے شرح اور مضمون لکھتے وقت صرف اپنی نظر پر جو ایسی ہے اور اپنے حافظہ پر جو ایسا ہے تکیہ کیا۔ اور اساتذہ دہلی و لکھنؤ کے کلام پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ حالانکہ یہ چیزیں اکثر شباب مرحوم کے ساتھ اور کبھی کبھی پہلے ہی چلی جاتی ہیں۔ اس اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر کیا شاید سب کے سب اعتراض ایسے کیے جن پر تحقیق سر بگریباں ہے۔ مذکر اور مؤنث کی بحث چھیڑی تو مختلف فیہ کا نام تک نہ لیا۔ یعنی بعض لفظ ایسے بھی ہیں کہ مذکر بھی بولے جاتے ہیں اور مونث بھی۔ ایسے لفظوں میں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ہر اُستاد کسی ایک صورت کو مرجح سمجھتا ہے۔ کبھی ترجیح و عدم ترجیح سے بحث نہیں کرتا، ردیف شعر یا اُسکا مذاق صحیح

جس مقام پر تذکیر کو پسند کرتا ہے مذکر باندھ جاتا ہے مثلاً معراج زیادہ تر مونث سمجھا جاتا ہے مگر شیخ ناسخ مذکر باندھتے ہیں۔ اور اس محل پر حق انھیں کی طرف ہے:

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی　　عزیزو گر نہیں معراج ممکن عرش اعظم کا

یہاں عرش اعظم کا اور عرش اعظم کی کہنے میں جو فرق ہے اُسے کچھ وہی لوگ سمجھتے ہیں جنکے کان سدھے ہوے ہیں جنکا ذوق سلیم ہے اور جہاں شاعر کا مذاق صحیح مونث کو مرجح سمجھتا ہے وہاں مونث لکھا جاتا ہے اور اہل ذوق نے مختلف فیہ الفاظ کے صرف مذکر یا مونث قرار دیے جانے پر زیادہ زور نہیں دیا، اسکا راز یہی ہے کہ انھوں نے زبان کے دائرہ کو تنگ کرنا بہتر نہ سمجھا۔ علاوہ اسکے مرزا کی جلالت قدر وہ تھی کہ اگر کسی لفظ کو خلاف جمہور مذکر یا مونث باندھ جاتے تو اُسی طرح قابل ملامت نہ ٹھہرتے جس طرح میر و سودا و درد۔ یہ اس ناچیز کا خیال ہے۔ دنیا کو ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مختلف فیہ کی مثال:

مذکر۔ خط کو روے یار پر نشو و نما ہوتا نہیں　　سبزۂ بیگانہ گل سے آشنا ہوتا نہیں (شیخ ناسخ مرحوم)

مونث۔ آنسو بہا تو رشتہ بپا مرغ دل ہوا　　دانہ نے کی جو نشو و نما دام ہو گیا (وزیر مغفور)

اب وہ مثالیں لکھی جاتی ہیں جن میں ایک ہی شاعر نے ایک لفظ کو مذکر اور مونث باندھا:

مذکر۔ تم فاتحہ بابا کا دلا دیجیو بیٹا (بند ۱۹ مطلع۔ جب خیمہ میں رخصت کو شہ بحر و بر آئے۔ ص ۲۰۷ جلد سوم انیس)

مونث۔ سوم گئے بھوکے یہی مرضی تھی خدا کی　　ان کھانوں پہ دو فاتحہ شاہ شہدا کی (بند ۸۰ مطلع۔ اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر ص ۲۲۹ ج انیس)

مذکر۔ ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　　موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا (کلیات سودا ص ۱۸۸)

مونث۔ بسکی یوں کوچہ ہستی کی ہے سم　　نے میں سے جوں نالہ گذر کر گیا (" ص ۲۰۸)

اعتراض ۲۴-۴۷　تانیث قلم

"غالب فرماتے ہیں۔ ع۔ ہے قلم میری ابر گوہر بار تو کیا شارح قلم کی تانیث تسلیم کرلے"

یہ تو وہ عبارت ہے جو فاضل مضمون نگار اودھ پنچ نے لکھی ہے، حضرت طباطبائی اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں:

"مصنف مرحوم کی زبان پر قلم بتانیث تھا، اور اُنکے تلامذہ ابھی تک اس وضع کو نباہے جاتے ہیں، مگر اصل یہ ہے کہ لکھنؤ و دہلی میں بتذکیر سب بولتے ہیں۔ فخر شعرائے دہلی مرزا داغ کا کلام دیکھو۔ تعجب یہ ہے کہ مصنف بھی قلم کو بتذکیر باندھ چکے ہیں۔ ع۔ فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے۔"

جواب - جہاں حضرت طباطبائی تعجب ظاہر کرتے ہیں مجھے تعجب آتا ہے۔ مرزا کے دیوان میں قلم

دو چار جگہ بھی مونث نہیں ملتا۔ پھر اسکا فیصلہ کیونکر ہوا کہ قلم مرزا کی زبان پر تانیث تھا۔ ہاں شاید اُردوے معلّٰی اور عودِ ہندی میں جناب طباطبائی کی نظر سے گزرا ہو۔ میرے پاس یہ کتابیں اسوقت موجود نہیں' اس لیے میں صرف انھیں دو مصرعوں کو مدنظر رکھ کر جواب دیتا ہوں۔ جناب طباطبائی کی اس عبارت سے (جس میں مرزا کے دو مصرعے لکھے ہیں' ! ہے قلم میری ابرِ گوہر بار ۲ فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے) تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قلم کو مختلف فیہ جانتے تھے اور جہاں مناسب نظر آتا تھا مذکر یا مونث باندھ جاتے تھے۔ اور دہلی کے متعلق یہ کہنا دل کو لگتی ہوئی بات نہیں کہ وہاں قلم کو سب بتذکیر بولتے ہیں۔ اگر' بولتے ہیں' سے زمانۂ موجودہ مراد ہے' تو پھر کہا جائیگا کہ اس قول سے مرزا کے زمانہ کو کیا تعلق ہے۔ اس حالت میں تو صرف یہی کہدینا کافی تھا کہ اب دہلی والے بھی باتفاق مذکر بولتے ہیں۔ لیکن یہ بھی اُسوقت کہا جا سکتا تھا جب اُن متقدمین سخن آفرینوں کی نظم و نثر پر نظر کر لی گئی ہوتی جنپر آج کی دلّی ناز کرتی ہے۔ اور اگر اس سے مرزا غالب مرحوم کا زمانہ مراد ہے تو یہ قول تحقیق کے خلاف ہے۔ دُور کیوں جائیے' مرزا کے معاصر حضرت مومن نے بھی قلم کو مونث باندھا ہے:

غیر کے خط لکھنے کو تم نے تراشی ہے قلم
ورنہ میرے استخواں کیوں ہوگئے قط گیر سے (کلیاتِ مومن صفحہ ۱۸۱)

اور یہی ایک مثال' سب بتذکیر باندھتے ہیں' کے رد کر دینے کو کافی ہے۔ خداے سخن حضرت میر کے یہاں بھی قلم کی تانیث کا سراغ ملتا ہے:

کسی کو شوق یارب اور اس سے بیش کیا ہوگا
قلم ہاتھ آگئی ہوگی تو سو سو خط لکھا ہوگا + (کلیاتِ میر صفحہ ۳۵)

(باقی)

محمد احمد بیخود موہانی

میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

دیدم کہ عقابے ز نشیمن بہ ہوا خاست
اندر طلب طعمہ پر و بال بیاراست

نازاں بپرِ خویش کہ در وے ہمی گفت
امروز ہمہ ملک جہاں زیرِ پر ماست

ناگہ ز کمیں گاہ یکے سخت کمانے
تیرے بزہ آورد و قضا بر دِ بر او راست

از خوردنِ آں تیر زمانے بشگفتش
کیں آہن و ایں تیر پریدن زکجا خاست

چوں نیک نظر کرد پرِ خویش درو دید
فریاد برآورد کہ از ماست کہ بر ماست،

گاے کے گوشت کا استعمال قدیم اہل ہند میں

از بابو راجندر لال مترا ال-ال-ڈی، سی-آئی-ای؛

مترجمۂ مولوی نجم الغنی صاحب قریشی لائبریرین دار الترجمہ حیدرآباد

ذیل کا مضمون بابو راجندرلال مترا ایل ایل ڈی سی آئی ای کے انگریزی مضمون "Beef in Ancient India" کا اُردو ترجمہ ہے۔ اصل مضمون پہلے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ میں چھپا تھا، اور پھر بابو صاحب موصوف کی مشہور کتاب " انڈو ایرینز" (باب چہارم) میں شایع ہوا۔ بابو راجندرلال مترا سنسکرت زبان اور ہندو علوم کے نامی گرامی فاضل ہیں، اور ان علوم کے متعلق اُنکی تحقیقات و راے نہایت باوقعت اور مسلم الثبوت مانی جاتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد ضخیم اور عالمانہ کتابیں اُنکے تبحر کی شہادت دیتی ہیں۔ خود ذیل کے مضمون سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ کس قدر تحقیق کے ساتھ مدلل طریق پر لکھتے ہیں۔

انگریزی سے اُردو میں اس مضمون کو مولوی نجم الغنی صاحب (لائبریرین دار الترجمہ) نے ترجمہ کیا ہے اور راقم الحروف نے اسکی نظر ثانی کی ہے۔ پوری احتیاط کی گئی ہے کہ ترجمہ صحیح اور اصل مضمون کے مطابق ہو۔

مجھے امید ہے کہ اس محققانہ تحریر کو پڑھکر ہر منصف مزاج شخص کو ماننا پڑیگا کہ ہندوؤں کی معتبر مذہبی کتابوں سے گاؤکشی کی کہیں ممانعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ گاے کی قربانی اور گاے کا گوشت کھانا بعض مذہبی رسموں میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حق پسند اور محب وطن اہل ہند کیلیے مناسب ہے کہ اس قسم کی صحیح معلومات کی جہاں تک ہو سکے عام اشاعت کرتے رہیں تاکہ ان بیجا تعصبات اور غلط فہمیوں میں شاید کچھ کمی آجائے جنکی وجہ سے اس بدنصیب ملک میں آئے دن جھگڑے اور خون خرابے ہوتے رہتے ہیں۔ فقط

راقم سید ہاشمی فریدآبادی

اس مضمون کا عنوان میرے اکثر ہموطنوں کو یقیناً بہت ہی ناگوار معلوم ہوگا، لیکن ساتھ ہی اسکے وہ دلچسپی جو کوہ ہمالہ کے اس طرف آنے والی قوم آریا کی ابتدائی معاشرت کی تاریخ سے متعلق ہے، میرے خیال میں ضرور میری معذرت کی وکالت کریگی۔ ایک خوردنی شے کی حیثیت سے گائے کے گوشت کا تصور جسکو اہل ہنود بھگوتی دیوی کا دنیاوی قائم مقام خیال کرتے ہیں، اُنکے نزدیک اسقدر دل ہلا دینے والا ہوتا ہے کہ لاکھوں راسخ العقیدہ اور مذہبی ہندو تو اپنی روزمرہ کی بول چال میں اسکا نام تک لینا پسند نہیں کرتے، اور اس ملک میں گاؤکشی بہت سی افسوسناک اور خوں ریز لڑائیوں کا باعث ہوچکی ہے۔ باینہمہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مواشی کُشی پہ لوگوں کو ذرا بھی ترس نہ آتا تھا، اور گوشت نہ صرف کھانے کی عمدہ چیزوں میں شمار کیا جاتا تھا، اور نہ صرف مہماں نوازی کی ایسی ہی علامت سمجھا جاتا تھا جس طرح زمانۂ قدیم کے یہودی اپنے معزز مہمان کے لیے "موٹا تازہ بچھڑا" ذبح کرنے کو سمجھتے تھے بلکہ اُس زمانہ کے متقی و پرہیزگار ہندوؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ گائے کا گوشت مُردے کے ساتھ کرنا نہایت ضروری امر ہے اور اس لیے وہ مرگھٹ پر مُردے[1] کے ساتھ جلانے کے لیے لازمی طور پر گائے کو ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ قول ایسے انگریزوں کو جو اسکے متعلق لوگوں کے موجودہ جذبات سے واقف ہیں، اور خود بہت سے ہندیوں کو ممکن ہے کہ چونکا دے، مگر وہ اسناد جن پر یہ قول مبنی ہے ایسی مستند اور مسلم الثبوت ہیں جنکے ماننے میں انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوسکتا۔

میرے ہموطنوں میں اچھے ذی علم لوگ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ مقدس ویدوں نے ایک زمانہ میں گومیدا یا گاؤکشی کی رسم کو فرض قرار دیا تھا۔ گو یہ لوگ (یعنی میرے ہموطن) یہ سمجھتے ہیں کہ گویا وہ ایک رسمی بات تھی اور اس لیے اسکو حقیقی گاؤکشی پر مبنی نہیں کرتے، اور اس طریقہ سے اُسکو اس طرح راز میں رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کے لیے شروع ہی سے یہ بات ایک معمہ ہوجائے یا اس طریقہ سے اسکو بیان کرتے ہیں کہ اس میں کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی حتیٰ کہ جب اس مضمون پر متوفی پروفیسر ولسن نے اپنی توجہ منعطف کی تو اُسوقت اس معاملہ کو پر اسرار معمہ بنا دینے کی کوشش یہاں تک کامیاب ہوچکی تھی کہ پروفیسر موصوف بھی مذبذب[2] ہوگئے مگر پھر بھی

---

[1] ملاحظہ ہو جلد دوم "زمانۂ قدیم کے ہندوؤں کی کریاکرم کی رسمیں"۔

[2] یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب اُنھوں نے سنسکرت کی تعلیم شروع ہی کی تھی اور اُس وقت تک وہ اُسکے سرچشمہ تک نہیں پہونچے تھے بلکہ اُنکا دارومدار پنڈتوں کے قول پر تھا۔ ورنہ بالآخر اس مضمون کے متعلق کوئی شک و شبہہ نہ تھا۔ اسکے لیے اُنکا نوٹ دیکھو [illegible]، ہندو تفسیر جلد اول صفحہ ۳۴

اس جیسے عالم اور نقاد سے ۔ ۔ ۔ ۔ سچی بات بالکل مخفی نہ رہ سکی ۔ چنانچہ پروفیسر موصوف کتاب میگ ڈنلڈ کے اپنے ترجمہ کے ایک حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ " قدیم زمانہ میں ہندوؤں کے رسم و رواج سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے یا گائے کی قربانی یعنی گومیدایا اشنامیدا کی رسم عام طور پر ہوا کرتی تھی ۔ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ قربانی حقیقی قربانی نہ تھی بلکہ رسمی تھی یعنی یہ کہ قربانی کی رسم قربانی کے جانور پر ادا کرنے کے بعد اسکو چھوڑ دیا جاتا تھا ۔ لیکن اس فقرہ کا متن مذکورہ بالا خیال کی تائید نہیں کرتا کیونکہ گایوں کے خون سے ندی بہ جانے کا استعارہ ظاہر کرتا ہے کہ خون بہایا گیا تھا ۔ اصل کتاب کے الفاظ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ " سرابھی کی بیٹیوں کے خون سے پیدا شدہ " جس سے مطلب گائیں ہیں ۔ کیونکہ سرابھی وہ مشہور گائے ہوتی تھی جو سمندر کے تلاطم سے پیدا ہوتی تھی اور جسکی نسبت مشہور تھا کہ اپنے پرستاروں کو منہ مانگی مراد دیتی ہے ۔ سرابھی کی بیٹی کا لفظ گائے کے معنی میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے "[۵۵]

لیکن قابل پروفیسر کی یہ دلیل تو انکے زمانہ سے بھی بہت پہلے اس ملک کے لوگوں کے دلوں میں خود بخود پیدا ہوئی تھی اور اسکا یہ جواب دیا جاتا تھا کہ خون کا لفظ صرف قربانی کے استعارہ کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو قدیم تحریرات کے صاف و صریح معنی لیا کرتے تھے مگر ساتھ ہی اسکے دلیری سے یہ فرض بھی کر لیتے تھے کہ اس طرح جو جانور قربان کیے جاتے وہ قربانی کرنے والے کی فوق الفطرت قوتوں کی بنا پر یقیناً پھر زندہ ہو جاتے تھے ۔ اس قسم کی دلیل اگرچہ خوش عقیدہ عوام الناس کے لیے قابل تشفی ہو مگر اس سے اصلی سوال معقولیت کی قلمرو سے اس قدر دور جا پڑتا ہے کہ اس سے قطع نظر ہی کر لینا بہتر ہوگا ۔ لیکن یہ سوال تو مذہبی سے مذہبی ہندو بھی کر سکتا ہے کہ معزز، پرانے اور تارک الدنیا شاعر والمیک نے اپنے بھائی واسستھا منی کے آنے کی خوشی میں صراحتاً اپنے مہمانوں کی دعوت کے لیے بہت سے گائے کے بچھڑے آخر کیوں ذبح کیے تھے ؟ واسستھا تو ایک (سمرتی) شرعی قانون کی کتاب کا مصنف بھی تھا، جو لوگوں کی مذہبی معاشرت کے قواعد و ضوابط بتاتی ہے ۔ نیز یہ منی ویدوں میں بھی ایک ممتاز شخصیت رکھتا ہے ۔ ان مہمانوں کے واسطے جو بچھڑے ذبح کیے گئے تھے اگر وہ بھی دوبارہ زندہ کیے گئے، تو یہ عمل مہمانوں کے گوشت نوشجان کرنے کے بعد ہوا ہوگا ۔ والمیک نے واسستھا کے استقبال کے لیے جو تیاری کی تھی اسکا ذکر کتاب اتر رام چرت میں

---

[۵۵] دوسرا مضمون صفحہ ۳۵۲ ۔

کیا گیا ہے اور وہ عبارت ایسی قابل بیان ہے جسکو میں بغیر کسی معذرت کے تمام وکمال نقل کرتا ہوں۔
اس عبارت میں عزلت نشیں والمیک کی جھونپڑی کے سامنے کا سماں دکھایا گیا ہے جہاں
اس رشی کے دو چیلے وہاں کی گھما گھمی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں :-

"بھانڈیانہ = سودھاتاکی! ذرا ہمارے خانۂ محقر کو تو دیکھو!
والمیک کا مقدس زاویۂ عزلت چہل پہل کا گھر نظر آتا ہے۔ آج اُسے اپنے غیر معمولی
مہمانوں کا انتظار ہے۔ جنگلی ہرن غیر معمولی ٹکڑے کھا رہے ہیں، ہوا میں مزے مزے
کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔

سودھاتاکی = ضرور کوئی عجیب وغریب سبب ہوا ہے جسکی وجہ سے ہمارے سفید داڑھی والے
بوڑھوں نے اپنے سبق کو آج ملتوی کیا۔

بھانڈیانہ = ہاں سبب ہے اور وہ بھی کوئی معمولی سبب نہیں ہے۔

سودھاتاکی = تو براہ کرم بتائیے تو کہ آج کس بوڑھے بکرے کی آمد کا انتظار ہے؟

بھانڈیانہ = کیسی شرم کی بات ہے! مذاق کرتے ہو۔ مشہور و معروف واسستھا وسرتھ کی
رانیوں کو رشی یارنگا سے ہمارے آقا کے گھر کو لا رہا ہے اور انکے ساتھ ارندھاتی
بھی ہے۔

سودھاتاکی = کیا واسستھا!

بھانڈیانہ = ہاں! وہی۔

سودھاتاکی = معاف کیجیے مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ ہمارے ہاں کوئی بھیڑیا یا
شیر مہمان آنے والا ہے۔

بھانڈیانہ = یہ کیونکر؟

سودھاتاکی = ورنہ اُسکی دعوت کے لیے موٹے تازے بچھڑے کیوں فراہم کیے جاتے؟

بھانڈیانہ = ہاں! کیا تمہیں معلوم ہی نہیں کہ ویدوں میں جن میں ہماری مقدس شریعت
مندرج ہے، یہ ہدایت ہے کہ صاحبِ خانہ اُن لوگوں کو جو شریعت میں کمال رکھتے ہوں شہد
کا کھانا، اور اُسکے ساتھ بیل، بچھڑے یا بکرے کا گوشت پیش کرے اور اسی برتاؤ کا وہ اچھوتا
اُن برہمنوں سے استحقاق رکھتا ہے جو ویدوں کے عالم ہوں"*

(* اسکا حاشیہ صفحہ ۱۳ پر دیکھیے)

اسی طرح واستہانے اپنی باری پر جب وسوامترا، جانکا، ستانندا، جاماد گنیا، وغیرہ عالموں اور دوستوں کی دعوت کی، تو "موٹے تازے بچھڑے" کو ذبح کیا۔ نائب مہاویرا چرت میں مذکور ہے کہ جب وہ جاماد گنیا کو منانے لگا تو اسکو یہ کہکر لالچ دیا کہ "بچھیا قربانی کے لیے تیار ہے اور کھانا گھی میں پکایا گیا ہے، تو عالم ہے آپ ایک عالم کے گھر آئے ہیں (دعوت کی شرکت سے) ممنون کریے"۔

مثالیں بلا شبہ ایسی ہیں جو قصے کہانیاں کہلانے والی کتابوں سے اخذ کی گئی ہیں، مگر ساتھ ہی اسکے یہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ نا وقتیکہ انکے مصنفین کے پاس کافی طور سے اس اطمینان کا دستیفہ فراہم نہ ہو لیا ہوتا کہ ناظرین ضرور انکے خیال ہوں گے اس وقت تک وہ کیونکر ایسی بات کہکر ناظرین کے جذبات کو ٹھیس لگاتے۔

کارل برک نے اپنے مضمون "ہندوؤں کی مذہبی تقریبات" میں اس موضوع پر توجہ کی ہے اور لکھا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس موقع پر (یعنی مہمان کے لیے) گاؤکشی کرنے کا دستور تھا اور اس لیے مہمان کو گوگھنا یعنی گاؤکُش کہتے تھے"۔ شادی بیاہ کی رسم میں گاؤ کو پُن کرنے کے منتر پر اس نے لکھا ہے کہ "وہ مفسر جسکی شرح کی ہم نے پیروی کی ہے اس منتر کو لکھتے وقت تمہید میں کہتا ہے کہ ایک مہمان جو شاندار طریقے سے استقبال کا مستحق ہو سکتا ہے اسکو یا تو روحانی پیشوا، پجاری، زاہد و پارسا شخص، شہزادہ، دولہا، دوست ہونا چاہیے۔ یا کوئی ایسا شخص ہو جسکی آمد پر گائے کو مارنے کے لیے ضرور باندھے رکھنا چاہیے اور اسی سبب سے مہمان کو گوگھنا یا گاؤکُش کہتے ہیں"۔

منو ہر موسم میں ہر قسم کے گوشت کے استعمال کو صرف اس تھوڑی سی رکاوٹ کے ساتھ جائز رکھتا ہے کہ ایک ٹکڑا اس میں سے کسی دیوتا، بزرگوں کی ارواح یا کسی مہمان کو کھانے سے پہلے دیدیا چاہیے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "گوشت کو خرید کر یا کسی سے لیکر جو شخص دیوتاؤں کی یا ارواح کی پرستش کرنے کے بعد (گوشت) کھاتا ہے تو وہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا" (جلد ۲۲)۔

---

۵۴ (حاشیہ صفحہ ۱۷) دیکھو ہندو ناٹک جلد ۱ صفحہ ۳۳۹ - یہ ترجمہ ذرا آزادی سے کیا گیا ہے مگر اصلی واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ اگر اسکا لفظی ترجمہ دیکھنا مقصود ہے تو اس ناٹک کے چوتھے ایکٹ کا شروع کا کیا ہوا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

۵۵ [illegible]यते वत्सतरी सार्पिष्य[illegible] पच्यते ।
[illegible]: श्रोत्रियुग [illegible] सिद्धुषरवन॥ [illegible]३

۵۶ انڈیا ٹمک بری سرچیز جلد ۷ صفحہ ۲۰۸ - ایضاً جلد ۷ صفحہ ۲۸۹ -

اور گو وہ بحیثیت ایک کھانے کی چیز کے گائے کے گوشت کی صراحت نہیں کرتا۔ تاہم انسانوں کے کھانے کے لیے جن جانوروں کی اُس نے فہرست لکھی ہے ان میں وہ لکھتا ہے: "جنگلی سُور، سیہی، چھپکلی، گودھا، (گونا)، گوڈاکا (گینڈا)، کچھوا، خرگوش۔ عقلمند، واضع قوانین پیر کی پانچ انگلیاں رکھنے والے جانوروں کو کھانے کے قابل بتاتے ہیں، اور تمام اُن چوپایوں کو بھی جنکے دانتوں[۵۹] کی صرف ایک قطار ہوتی ہے بجز اونٹ کے" اور اس طرح کھانے کے قابل جانوروں میں گائیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جبکہ اُسے یہ علم تھا کہ اُن کا ایسے چوپایوں میں شمار ہوتا ہے جنکے دانتوں کی صرف ایک ہی قطار ہوتی ہے۔ اگر وہ گایوں کو کھانے کے چوپایوں میں شامل نہ کرتا تو یقیناً وہ اس خیال کو ظاہر کر دیتا اور اُنکو اونٹوں میں شامل کرتا۔ مگر اس دلیل کی بنا پر اُسکا منشا یقینی طور پر قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ برہمچاری کے گھر واپس آنے کے موقع پر گائے کے گوشت کے استعمال کی جو ہدایتیں دیتا ہے اُس میں اُس نے بالکل اپنے مطلب کی صراحت کر دی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "جب اپنے فرض کو نہایت پابندی سے ادا کرنے کی بدولت اسکی واجبی طور پر ستایش کیجائے اور اپنے حقیقی یا روحانی باپ سے وید کا مقدس ہدیہ حاصل کر چکے تو پھر اُسے (یعنی برہمچاری کو) ایک شاندار بستر پر جو پھولوں کے ہاروں سے بسا ہوا ہو بیٹھنا چاہیے۔ اور مادھوپرکا (یعنی شہد کا کھانا) کی رسم کے[۵۸] مطابق اسکے باپ کو چاہیے کہ اسکی سنا کحت سے قبل گائے نذر کرے۔" ایک اگلے فقرے[۵۹] میں وہ یہ بھی رائے دیتا ہے کہ بادشاہوں اور دوسرے معزز مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے" شہد کے کھانے" کے ساتھ گائے کا گوشت بھی ہونا چاہیے۔

راجہ اشوک اپنے پہلے فرمان میں لکھتا ہے کہ "زمانۂ سابق میں شاہ پیاداسی انکھانانی کے شاہی مطبخ اور مندر میں لاکھوں جانور گوشت[۶۰] کھانے کے لیے مارے جاتے تھے"۔ اس قول سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کس قسم کے جانور تھے۔ البتہ مواشی کُشی ضرور ہوتی تھی۔ پھر چونکہ اسوقت وہ ہندو بھی تھا اور شاستر کے قوانین کا پیرو بھی۔ پس یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ بھیڑ اور بکریوں ہی پر اکتفا نہ کرتا ہوگا۔

مہابھارت اور راماین سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ اُسوقت گومیدا کی رسم منائی جاتی تھی یعنی قربانی کے لیے مواشی کُشی کی جاتی تھی مگر ان میں جانوروں کی تصریح نہیں ہے اور نہ صاف طور

۵۷ منو جلد ۵ صفحہ ۱۸ ۵۸ ایضاً جلد ۳ صفحہ ۳ ۵۹ ایضاً جلد ۳ صفحات ۱۲۰-۱۱۹

۶۰ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۶ صفحہ ۴۹

پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ گائے کا گوشت کھایا بھی جاتا تھا۔

لیکن گائے کا گوشت کھانے کے متعلق قدیم طبی کتابوں میں زیادہ وضاحت سے لکھا ہوا ہے۔ کتاب چرا کا سان ہتیا میں، جسکا پانچویں یا چھٹی صدی قبل مسیح کے واقعات سے آغاز ہوتا ہے، ایک باب خوراک کے متعلق بھی ہے جسکے ایک شعر کا مطلب یہ ہے کہ "گائے کا گوشت، بھینسے اور سور کا گوشت روزانہ[۱۱] نہیں کھانا چاہیے"۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی شے تھی جسکا شمار کھانے کی چیزوں میں ہوتا تھا۔ اگر یہ مچھلی، دہی اور جَو کی روٹی کی طرح گوشت بھی مہنگا تھا اور اسلیے روزانہ اسکا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ گائے کا گوشت حاملہ عورتوں کو کھلانا چاہیے۔ کیونکہ اسکے متعلق اسوقت یہ خیال تھا کہ اس سے رحم کو قوت پہونچتی ہے۔ سوسروتا اپنی کتاب میں کھانے کے باب میں لکھتا ہے کہ خاص خاص بیماریوں میں گائے کا گوشت نہ کھانا چاہیے[۱۲]۔ زمانۂ قدیم کی دوسری طبی کتابوں میں بھی ایسی ہی باتیں ملتی ہیں۔ اور کسی کتاب میں بھی اسکی قطعی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ عہد متوسط کی بعض کتابوں میں خاص طور سے تاکید کی گئی ہے کہ غشی کے دوروں[۱۳] سے صحت یاب ہونے کے لیے گائے کے گوشت کا شوربا دینا چاہیے۔

سوسترا، کلپا، اور گرہیا دونوں سوستروں میں اور خود ویدوں میں اس سے بھی کم تامل اور سکوت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں صاف صاف یہ تصدیق موجود ہے کہ گائے کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ نیز ان میں تفصیل کے ساتھ اُن مواقع کا ذکر کیا گیا ہے جنمیں جانوروں کو مارنا اور

---

[۱۱] कुचिकाश्च किलाटाश्च शौकरं गव्य माहिषे ।
मत्स्यान दधि च माषाश्च यवकाश्च न शीलयेत् ।
चरकं अन्नपाना विध्यध्यायः ।

[۱۲] गव्यं केवलवातेषु पीनसे विषम ज्वरे ।
शुष्क काश श्रमात्यग्नि मांसक्षयहितश्च तत् ।

[۱۳] गवां मांसे बाहिनन सर्व क्लेश सहन्तथा ।
तक्रासिद्धा यवागुः हान घृता व्यापदाविनाशिनी ।
तैल व्यापदिशस्तत्र कपिशा पाकशाधिता ।
गव्य मांसरसे साम्ला विषमज्वर नाशिनी

کھانا واجب ہے۔ ازانجملہ گوبھیلا یہ کہتا ہے کہ سرادھا[۱۷۵] کی رسم میں گائے کا گوشت ضرور ہونا چاہیے۔

یجر وید کی برہمنا میں جو ویدک رسم و رواج کا ذخیرہ ہے اور جس میں ہند قدیم کی مذہبی معاشرت کا نہایت وضاحت سے حال معلوم ہوتا ہے، ایسی بیسیوں رسموں کا ذکر ہے جنکی ادائی میں چوپایہ کے گوشت کی ضرورت پڑتی تھی - اور اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ خاص خاص دیویوں کو خوش کرنے کے لیے فلاں قسم کے جانور کو مار کے اُن کا گوشت چڑھانا چاہیے - چنانچہ کامیا اشتیس یا چھوٹی قربانیوں میں خاص دعاؤں کے ساتھ (RIII C XVII) بِشنو وشنو کے لیے ٹھگنے قد کا بیل قربان کرنا چاہیے - اندرا کے لیے جو قربانیوں کا بانی اور ورترا کا تباہ کرنے والا ہے، ایک ایسا سانڈ قربان کرنا چاہیے جسکے سینگ جھکے ہوے ہوں اور ماتھے پر ٹیکا بھی ہو - پھر اُسی کے لیے جسکو ہوا کا دیوتا بھی مانا جاتا ہے، ایک موٹے پیروں والی گائے (پرشنی سکتا) قربان کرنا چاہیے پھر اسی کے لیے جسکی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دشمنوں کو تباہ کرنے والا یا کڑک چمک کا دیوتا ہے، ایک سفید ٹیکے اور جھکے ہوے سینگوں والا سانڈ قربان کرنا چاہیے - وشنو اور ورونا کے لیے ایک بانجھ گائے - اشو دھیا کی قربانی کے لیے ایک ایسی گائے جسکا بچہ حال ہی میں اسقاط ہو گیا ہو - اندرا اور اگنی کے لیے ایک ایسا سانڈ جو کسی شادی یا کسی دوسری رسم کے موقع پر پن کیا جا چکا ہو - برہمنس پتی کے لیے ایک سینگ کٹا ہوا بیل، پشن کے لیے ایک کالی گائے، دایو کے لیے صرف ایک بیا ہتو والی گائے - اندر کے لیے جو ہماری قوتوں کو تقویت پہونچانیوالا ہے، ایک بھورا بیل سوتیا کے لیے چتی دار یا ابلق بیل - مترا اور ورونا کے لیے ایک دورنگی گائے - رُودرا کے لیے ایک سرخ گائے - سریا کے لیے ایک سفید بانجھ گائے - مترا کے لیے ایک سفید بیل - دایو کے لیے ایک ایسی گائے جس سے سانڈ نے بے موسم قربت کی ہو - بھاگا کے لیے ایک ایسی گائے جو جوڑی کیلیے تیار ہو قربانی کرنی چاہیے - وقس علی ہذا اشامید کی رسم کے متعلق ایک قانون ہے جس میں یہ بھی درج ہے کہ قربانی کے جانور (اپنے اپنے دیوتاؤں کے لحاظ سے جنپر قربانی کے واسطے وہ تجویز کیے گئے ہوں[۱۷۶]) رنگ اور عمر میں مختلف ہونے چاہئیے۔

راجاسویا، واجاپیا، اوراشامیدھا وغیرہ بڑی بڑی تقریبوں میں گاؤکشی ضرور کیجاتی تھی اور پہلی دونوں تقریبوں میں گوساوا (گاؤکشی) کی رسم ایک لازمی شے تھی - جسکے متعلق یہ یقین تھا کہ اس رسم کے منانے والے کو دنیا ہی میں آزادانہ حکومت ملجاتی ہے اور آخرت میں اس

---

[۱۷۵] तस्मा उक्षे ... गौ : ۱

[۱۷۶] تاتیا برہمنا جلد ۳ صفحہ ۲۵۸

قسم کی آزادی کہ جہاں اسکا جی چاہے چلے پھرے جس طرح گائے جنگل[۱۶] میں کھلے بندوں پھرا کرتی ہے۔
کتاب تاتیا برہمنا میں جہاں اشومیدھا کا ذکر کیا گیا ہے وہاں تجویز کیا ہے کہ ۱۸۰ پالتو جانور
اُس موقع پر قربان کیے جائیں۔ ان جانوروں میں گھوڑے، بجار، گائیں، بکرے، ہرن، اور نیل
گائیں[۱۷] وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح ایسے مواقع پر مذبح میں بہت سے وحشی چوپایوں کو لایا کرتے
لیکن اُنکو ہمیشہ بند کرکے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس تحریر سے صاف طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس
مقصد کے لیے کتنے چوپایوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی، شاید مہمانوں کی تعداد کے اعتبار سے چوپایوں
کی تعداد میں کمی بیشی ہو جاتی ہو۔ کیونکہ مہمانوں میں صاحبانِ تخت و تاج شریک ہوتے تو اُن کے
ساتھ والوں کی بھیڑ کی بھیڑ بھی آتی اور انکی خواہشیں شاہانہ پیمانہ پر پوری کی جاتی تھیں۔ باینہمہ
یہ صاف ظاہر ہے کہ [illegible] قربانی بھی صرف ایک یا دو گایوں سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔
بلکہ "دس مرتبہ اٹھارہ (اٹھارہ ذ یعنی ۱۸۰) راسوں میں جنکی ضرورت کتاب برہمنا میں بتائی ہے لازمی
طور پر بہت سے بجار، گائیں اور بچھیاں مختلف عمر اور رنگوں کی قربان کی جاتی تھیں۔
[illegible] برہمنا سے ایک اور رسم کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں چوپایوں کی ایک بڑی تعداد ماروتوں
کو خوش کرنے اور [illegible] پجاریوں کے بہرہ اندوز ہونے کے لیے ہلاک کی جاتی تھی۔ اس رسم کو
"پن چاس ورادیا سارا" یا پنج سالہ موسم خزاں کی قربانیاں کہتے تھے۔ بظاہر زمانہ قدیم میں یہ
رسم بالکل اسی طرح منائی جاتی تھی جس طرح آج کل کے ہندو درگا پوجا کی رسم رچایا کرتے ہیں۔
یہ رسم مسلسل پانچ سال تک منائی جاتی تھی جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے مگر ہر موقع پر اصل رسم
صرف پانچ روز تک ہوتی اور اُسوقت سے شروع ہوتی جب نیا چاند اُس جھومر کے ساتھ نکلے جسے
ویسا کا کہتے ہیں۔ یہ ستمبر یا اکتوبر کے مہینے میں ہوتا تھا۔ اس رسم کا سب سے ضروری رکن یہ تھا
کہ سترہ بغیر کوہان والے پانچ سالہ ٹھگنے سانڈھ اور اتنی ہی، چھوٹے قد والی تین سالہ بچھیاں جمع کیجاتیں۔

---

[۱۶] यथा गौः अरण्ये स्वच्छन्द चारी, एव मयं ब्रह्म लोकेऽपि स्वतन्त्रो भवति ।

[۱۷] तस्माद्दृष्टा दशिनो संहितो धूमरोहित इत्यादि भिरनुवाकैः उक्ताः प्रत्यनुवाक मष्टा दश संख्या मिलित्वाऽशीत्यधिकशत संख्याकाः पशव आलब्धव्याः

سانڈوں کو پُن کرکے چھوڑ دیا جاتا تھا اور بچھیوں کو مقررہ دعائیں پڑھکر اور رسمی پوجا پاٹ کرکے تین تین بچھیاں روز ذبح کیا کرتے تھے اور بقیہ دو بچھیوں کو آخری قربانی کے دن ان تین بچھیوں میں شریک کرکے ذبح کرتے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ اس سال کی قربانی کا خاتمہ ہوگیا۔

سامادید کی کتاب تانڈیہ برہمنا میں اس رسم کا پتہ چلتا ہے اور اُس میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہر سال کے لیے مختلف رنگوں کے چوپائے ہونے چاہئیے۔ اس کتاب کی تحریر کے مطابق پہلے سال میں رسم اسوتا کے منانے کے لیے چاند کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ ہونی چاہیے اور باقی آیندہ ہر سال کیلیے کاتک کی چھٹی تاریخ نہایت مناسب مانی گئی ہے[۱۸]۔ ویدک کے ایک قصہ کے مطابق رسم یجنا کا بانی ایک شخص پرجاپتی کو قرار دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں وہ یہ چاہتا تھا کہ مالدار اور صاحب حکومت ہوجائے۔ چنانچہ "اُس نے رسم یجنا سارادیا کو منانا ضروری سمجھا اور اس ارادہ کے مطابق قربانی بھی کی۔ پھر وہ مالدار اور صاحب حکومت ہوگیا"۔ وید میں مذکور ہے کہ جو شخص بڑا ہونا چاہے اُسکو چاہیے کہ یجنا سارادیا کے توسط سے پرستش کیا کرے پھر وہ یقیناً بڑا شخص[۱۹] ہوجائیگا۔ نیز ایک اور جگہ لکھا ہے کہ جو شخص اس رسم کو مناتا ہے اسکو قطعی خودمختار حکومت مل جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دانشمند مسمی کنڈا کو اسی کے ذریعہ مل بھی چکی ہے[۲۰]۔

گاے کے کباب

کتاب اسوالایانا سترا میں بہت سی مختلف قربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے جنکا ایک جزو مواشی کشی بھی تھا۔ ان قربانیوں میں رسم گرھیا سوترا خاص توجہ کی مستحق ہے اس رسم کو سلاگاوا یا "سیخ کی گاے" یعنی کباب گاؤ کہتے تھے۔ یہ رسم یا تو موسم خزاں (سرت) یا موسم بہار میں منائی جاتی تھی جبکہ چاند آردرا[۲۱] کی نچھتر میں ہوتا تھا۔ اس رسم کے لیے مناسب گاے وہ سمجھی جاتی تھی جو خاکی سفید چتی دار ہو[۲۲] - اور پورے گلے میں سے چھانٹ کے نکالی گئی ہو۔

---

[۱۸] यष्ठ्न्या शरदि कातिके मासि यजेत् । सप्तम्या मष्टम्यां वाश्व युजो पक्षेतु वत्सतरी रेवालभे रन् उक्ष्णो विसृजेयुः

[۱۹] تانڈیا برہمنا جلد ۲ صفحہ ۲

[۲۰] स्वाराज्यं वा एष यज्ञः । एतेन वा एक यावा कान्दमः स्वाराज्यम गच्छतु । स्वाराज्यं गच्छति ।

[۲۱] शरदि वसन्ते वार्द्रया । ४, ६, २ ।

[۲۲] श्रेष्ठं स्वस्य यूथस्य ४,६.२[۲۲] ग्राकुष्ठि च्छादसम् ।४, ६, ४ ।

سیاہ چتیاں بھی قابل[24] اعتراض نہ تھیں اور کمیسر کالی یا نیلی گاے جس پر سرخی نمودار ہو یعنی ارغوانی فام بھی[25] بے عیب سمجھی جاتی تھی - اس قسم کی گاے کو منتخب کرنے کے بعد ہی اسکو ایسے پانی سے نہلایا جاتا تھا جس میں دھان اور جو بھیگے ہوے ہوں - اور پھر اسکو اُسوقت تک کے لیے چھوڑدیا[26] جاتا تھا جب تک کہ اُسکے پورے دانت نہ نکل آئیں - اسکو وید کے چند الفاظ کہکر رُدرا سے منسوب کرکے چھوڑتے تھے - وید کے وہ الفاظ یہ ہیں: "رُدرا کے نام پر جو بڑا دیوتا ہے جاؤ بھیاؤ پھولو"[27] وغیرہ -

قربانی کے لیے مناسب مقام وہ تھا جہاں لوگوں کی آمدورفت کم ہو یعنی گانوں یا شہر کے باہر کا مشرقی یا شمالی حصہ جہاں سے نہ گانوں نظر آسکے نہ وہ مقام شہر سے - قربانی کا وقت آدھی رات کے بعد تھا لیکن بعض کے نزدیک صبح[28] کے وقت کو ترجیح ہے -

تمام ضروری انتظامات مکمل ہونے کے بعد ایک پوجاری کو جو برہمن ہو اور قربانی کی تمام تفصیلی باتوں سے خوب واقف اور تجربہ[29] کار بھی ہو مقررہ بھجنوں کو کہکر چند چیزیں آگ پر چڑھاکر یہ رسم شروع کرنی چاہیے اور پھر قربانی سے متعلق مقررہ طول کا ایک ڈنڈا زمین میں گاڑ دینا چاہیے - یہ (ڈنڈا) پلاسا درخت کی ہری ٹہنی ناتراشیدہ اور سادی ہونی چاہیے - ورنہ دوسری رسموں میں اس ٹہنی کو (جسکو یوپا کہتے ہیں) اچھی طرح چھیل کر اور خوب سجا کر زمین میں گاڑتے تھے - اسکے بعد رسّی کے دو ٹکڑے مہیا کیے جاتے - ایک ٹکڑا تو کُسا گھاس کا ہونا چاہیے اور دوسرا پلاسا اور آتی جیسی زمین پر پھیلنے والی گھاس کا - ان میں سے ایک ٹکڑے کو تو اسی ڈنڈے کے اطراف میں باندھ دیتے ہیں اور دوسرے کو گاے کے داہنے سینگ میں - پھر اسی رسی کو ڈنڈے میں لٹکا دیتے ہیں جسکا رخ پچھم کی طرف ہوتا ہے - مذکورۂ بالا کاموں کو کرتے وقت کچھ منتر بھی پڑھتے جاتے ہیں -

---

۲۴ कामं कृष्णा मालोहवाश्यत् ४,६,६ ۲۵ कल्माष मित्येक ।४,५।

۲۶ व्रीहियववती भिरद्भिर भिषिच्य । ४, ६, ६।

۲۷ रुद्राय महादेवाय जुष्टो वर्द्धस्वाग्ने ।४६.६। میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس فقرہ میں رودرا اسم ہے اور مہادیوا "بڑا دیوتا" صفت یا مہادیوا اسم ہے اور رُدرا "خونخوار" صفت - آجکل جانوروں کی قربانی مہادیوا کے نام پر نہیں لی جاتی - اسی طرح سرسوتی کے نام پر بھی گوشت نہیں چڑھایا جاتا گو ویدوں میں بارہا گوشت چڑھانے کا ذکر کیا گیا ہے -

۲۸ सशस्वा ऊर्द्ध मर्द्धरात्रात् । उदित इत्येके ।४,६,२३।

۲۹ ظاہری وجوہ کے سبب سے یہ شرط لازمی طور پر ہمیشہ ادا نہیں ہوسکی -

پھر حسب معمول جانور کی قربانی کرتے ہیں۔ اسکی کلیجی کو جو لکڑی یا پتّے کے دونے میں رکھی جاتی ہے آگ پر چڑھاتے ہیں۔ اس چڑھاوے کے لیے جو منتر ہے وہ سیوا کے بارہ[۲] ناموں پر مشتمل ہے اور وہ یہ ہے "ہرا، مریڑا، سروا، سیوا، بھاوا، مہادیوا، اُگرا، بھیما، پسوپاتی، رُدرا، شنکرا، اور اسانا کو یہ قربانی مبارک ہو"[۱] یہ بات پجاری کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے وہ سارے بچن پڑھے یا صرف آخری چھ بچنوں کو ملا کر یا محض یہ کہے کہ "رُودرا کو یہ قربانی مبارک ہو"۔ اسکے بعد پکے ہوے چاول اور دوسری چیزیں چڑھائی جاتی ہیں۔ کُسا گھاس کے گٹھے قربان گاہوں کے چاروں طرف بکھیر دیے جاتے ہیں اور تھوڑے سے پکے ہوے چاول اور کچھ گوشت اوپر چڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ اسکو چاروں سمتوں کا دیوتا مانتے ہیں۔ اسکے بعد چاروں سمتوں سے اس دیوتا کو مخاطب کرکے بچن پڑھتے جاتے ہیں۔ چاول کی بھوسی اور چاول کا دلیا، چڑھاوے کے چاول، گائے کی دم، کھال، نس، پٹھوں اور کھروں کے ساتھ ملا کر پکائے جاتے تھے پھر اُنکو آگ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ قربانی کرتے وقت جانور کے خون کو ایک برتن میں لے لیتے تھے جو کُسا گھاس پر ڈالا جاتا تھا۔

ایک ایسے زمانے میں جب لوگ جانور کے بال اور کھروں کے استعمال کے فوائد سے ناواقف ہوں، انکا جلا دیا جانا لازمی بات تھی مگر کھال جیسی کارآمد چیز کی بربادی اُس زمانے کے مبصروں سے نہ دیکھی گئی۔ چنانچہ ایک دانشمند مسمی سمباتیہ نے اسکے متعلق یہ تجویز کی کہ اسکے جوتے اور دوسری کارآمد چیزیں بنا کر انسان اپنے کام میں لا سکتا ہے[۲]۔ بہرکیف اسکے بعد پجاری شمال کی طرف اپنا منہ کرکے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھانک کر اُس خون کو جو ذبح کرتے وقت زمین پر گرتا ہے، سانپوں کی نذر کرنے کے لیے کچھ پڑھتا ہے۔ اس خون کے متعلق اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ سانپوں ہی کا حق ہے۔ پھر چڑھاوے (شوسنکرت) کی آخری رسمیں منائی جاتی ہیں اور مرے ہوے جانور کے سینے میں سے سیخ کھینچکر باہر نکال لیجاتی ہے اور پھر رُودرا کی بڑائی اور توصیف وثنا پر رسم ختم کردی جاتی ہے۔ کتاب سدکارا میں مذکور ہے کہ چڑھاوے کی بچی ہوئی چیزوں کو گاؤں میں نہ لانا چاہیے اور نہ بچوں کو مذبح پر جانے دینا چاہیے۔ لیکن اسی کتاب میں لکھا ہے کہ قربانی کرنے والے کو "قربانی کا گوشت حسب معمول

---

[۱] हराय मृडाय सर्वाय शिवाय भवाय महादेवा योग्राय भीमाय पशुपतये रुद्राय शङ्कराये शानाय स्वाहा

[۲] भोगं चर्म्मणा कुर्वीतेति शांवत्यः। शांयस्त्वस्त्वा चार्य्यः चर्म्मणा भोग मुपानदादि कुर्वीतेति मन्यते ४.८, २४

دعائے خیر (سوستیاینا) کے بعد کھانا چاہیے[۳۲]" بعض اس گوشت کو کھانا ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اختیاری ہے[۳۳]۔ چاہے کھاؤ چاہے نہ کھاؤ۔

مذکورہ رسم کو منانے والے شخص کے متعلق یہ یقین دلایا گیا ہے کہ اسکی عمر بڑی ہوتی ہے، دولتمند ہو جاتا ہے، بڑا درجہ پاتا ہے، متقی شخص مانا جاتا ہے۔ اسکے پاس جانوروں کا بڑا گلہ ہوتا ہے، بہت اولاد والا ہوتا ہے۔ اور ہر گھر والے کو یہ رسم اپنی عمر میں کم سے کم ایک مرتبہ ضرور منانی چاہیے کیونکہ یہ نہایت ضروری رسموں میں شمار کی جاتی تھی۔ اسی رسم کی ایک کسی قدر بدلی ہوئی صورت وہ ہے کہ اس رسم کو ڈھور ڈنگروں کے باڑے میں (جہاں جانور رات کو بند کیے جاتے ہیں) منایا جائے اگر جانوروں میں کوئی بیماری پھیل گئی ہو۔

کتاب گرھیا سوترا میں اس رسم کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اگرچہ دوسری حیثیتوں سے مکمل ہے مگر افسوس ہے کہ گوشت کے پکانے کے طریقے کے متعلق قطعی سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم سیخ کا استعمال کرنا، جانوروں کے سینے میں سیخ کا موجود ہونا اور رسم کے اختتام پر اس کا کھینچکر باہر نکالا جانا وغیرہ تفصیلات سے گوشت کے طریقہ پخت کے متعلق بہت کم شک وشبہ رہ جاتا ہے[۳۴]۔ (یعنی اسکو اسی طرح بھونا جاتا تھا جس طرح سیخ کے کباب)۔

اب مجھے ایک دوسری رسم کے متعلق لکھنا ہے جسکو اسناپانا یا ذبح بقر کہتے تھے اور دوسرے الفاظ میں اسکو اشتکا بولتے تھے۔ یہ رسم ماگھ کے مہینے کی آٹھویں تاریخ سے چار روز تک منائی جاتی تھی یا چیت کی چودھویں تاریخ شروع ہونے سے پہلے یا شروع ہوتے ہی چار روز تک منائی جاتی تھی۔ اس رسم کی تمام باتیں کئی حیثیتوں سے معمولی پاسو بندھا رسم سے ملتی جلتی ہیں۔ جن کا تھوڑا سا ذکر آگے کیا جائیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم مہا پلاوا، ادا سہا اور نیز دوسری رسموں کا جزو تھی اور کوئی مستقل رسم نہ تھی۔

اکثر دوسری رسموں کو منانے کے لیے بھی گائے کے گوشت کی فراہمی لازمی ہوا کرتی تھی۔

---

[۳۲] नियोगात्त प्राश्नीयात् स्वस्त्ययन इति ४, ६, १५,

[۳۳] अस्य पशोः हुतशेषं न प्रश्नीयात् । अन्यत्र इच्छातः प्राश्नी-यातु वा ४, ६, २२।

[۳۴] ...क्रुदादि हृदय शूली ह्रासन साहितं होम शेषं समा-...येत् । आश्वलायन गृ० सू० वृत्तिः ४.६.२६।

رسم اتی راتا کے سلسلے میں مصنف کا تیانا تجویز کرتا ہے کہ ماروتوں پر قربانی کے لیے ایک بانجھ گائے
(چیتی دار) کو ترجیح تھی[۳۵] کی ضرورت ہے اور پرجاپتی کے لیے سترہ سیاہ منتخب جوان بیلوں کی ضرورت
ہے - اس قربانی کے لیے اگر ان تین صفات کے بیل نہ مل سکیں[۳۶] تو دو یا ایک ہی خصوصیت رکھنے والے
بیلوں سے یہ رسم ادا کی جا سکتی تھی - ان رسموں کی تفصیل مجھے اب تک دستیاب نہ ہو سکی اور معلوم
نہیں کہ یہ رسمیں اُس زمانے میں کس طرح منائی جاتی تھیں - البتہ نردوا اپس بندھا کے لیے مجھے تین
مختصر سے پریوگ ملے ہیں، جن میں ایک پریوگ سے میں نے اس رسم کے متعلق مندرجہ ذیل اقتباس
لیا ہے (ملاحظہ ہو سنسکرت کالج کلکتہ کی قلمی کتاب ۱۵۵۲)

"یہ رسم اُسوقت منائی چاہیے جب سورج اپنی چھ مہینے کے دور میں شمال کی جانب
اُتار پر ہو اور ایسا اُسوقت ہوتا ہے جب چاند دو چھتر میں ہو یا اس رسم کو اُسوقت ادا کرنا چاہیے
جب چاند پہلی شب رواتی کے بُرج میں ہو - اسکے منانے سے ایک دن پہلے، رسم منانے والے
کو رسم سرادھتیا منانی چاہیے جسکو نندی مُکھا بھی کہتے ہیں - اور اسی رات کو یہ دونوں رسمیں یعنی
ادرک ونتی اور پراتی سارا بندھا منانی چاہیئے - پہلی رسم اس طرح مناتے ہیں کہ کچھ پڑھ کر
صاحب خانہ کے اوپر پانی چھڑکا جاتا ہے - اور دوسری رسم میں یہ ہوتا ہے کہ رسم منانے والا ایک
مقررہ طریقے سے اپنی داہنی کلائی میں تاگا باندھ لیتا ہے اور رسم کے ختم ہونے تک باندھے رہتا
ہے - یہ ڈوری مقررہ طریقے پر باندھی جاتی اور منگلی کی علامت سمجھی جاتی تھی - بنگال میں آجکل یہ ڈوری
صرف شادی کے موقع پر یا جنیو ڈالتے وقت استعمال ہوتی ہے - البتہ شمالی مغربی علاقوں میں دوسرے
موقعوں پر بھی باندھی جاتی ہے -

تقریب کے دن پانچ کام لازمی فرائض میں داخل ہیں یعنی نہانا یا مُردوں کی ارواح

---

[۳۵] ...ाति रात्रि पशूनु पाकृत्य वशां पृश्निं मरुद्भ्य उज्जेषेभ्यः॥
...ा० श्रौ० सू० १४, २, ११। पूर्वं चतुरोति रात्र पशूना ग्रेयादीनु पा-
...त्य वशा वन्ध्या पृश्नि विचित्र वर्णा मुपा करोति।

[۳۶] ...द भावे ऽ पृश्निम का० १४, २, १२'
...ाजा पत्यांश्च सप्त दश श्यामं तूपरान् वस्तान् का० १४, २, १३॥
...यामाश्चते तूपराश्च श्याम तूपराः तनतूपरान् श्रृङ्गहीनान्वस्तान
...कारान् सान्डान् प्रजनयितॄन्।

پانی دینا، وید کا پڑھنا، قربانی کی چیزوں کا گھر کی آگ پر چڑھانا، فقیروں کو بھیک دینا اور دیوتاؤں کیلیے
چاول پکانا۔ اس منتر کو پڑھتے ہوئے جسکا آغاز پریا نام سے ہوتا ہے یہ سوچا جاتا ہے کہ کونسا جانور
قربان کرنا چاہیے۔ پھر اُس آگ کی طرف جاتے ہوئے جسکو گرہپتیا کہتے ہیں، بانیٔ رسم اور اُسکی
بیوی کو کُسا گھاس پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ انکے ہاتھوں میں کُسا گھاس کا ایک ایک گٹھا بھی ہوتا ہے۔ پھر
تین مرتبہ آہستہ آہستہ اور تین مرتبہ زور زور سے بھجنوں کو دوہراتے ہیں بعد ازاں کسی پجاری کو
مقرر کرکے صدقِ نیت کے ساتھ رسم کو ادا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اب ادھوریا آگے آجاتا ہے
اور لکڑی کے دو ٹکڑے پھرتی سے رگڑ کر حسبِ قاعدہ آگ جلاتا اور مقررہ منتر پڑھکر اسکو پوتر کرتا ہے۔
ادھوریا کا آتشدان روشن کرتا ہے اور پھر اُس آگ پر گھی چڑھاتا ہے۔ قربان گاہ کی آگ کو سلگانے
کے لیے اگر معمولی آگ سے کام لیا گیا ہے یعنی رگڑ سے آگ نہیں سلگائی گئی ہے تو اس صورت میں اس
آگ کو پوتر کرنے کے لیے ایک دوسرا ہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو بیان کردہ طریقے سے مختلف ہے۔
چڑھاوے کی چیزیں وہی ہوتی ہیں مگر انکی مقدار پانچ گنی کردی جاتی ہے۔ آخری دو چیزیں، قربانی کی
جگہ اور اس کلھاڑی پر چڑھائی جاتی ہیں جس سے گوشت کاٹا جاتا ہے۔

رسم منانے والا اب شہر کے مشرقی پھاٹک سے اس درخت کے پاس جاتا ہے جس سے لکڑی
کا ڈنڈا کاٹا جائے گا۔ اس درخت کے سامنے کھڑا ہوکر مغرب کی طرف اپنا منہ کرکے، درخت کو
مخاطب کرکے کچھ بھجن پڑھتا ہے اور پھر اُس درخت کے تنہ کو قربانی کے گھی سے لیپ دیتا ہے۔ پھر
کٹی ہوئی لکڑی پر سونے کا ایک ٹکڑا رکھا جاتا ہے۔ اُسپر تھوڑا سا پانی چھڑکتے ہیں اور گھی کو چار مرتبہ
لکڑی پر چڑھاتے ہیں۔ . . . .

. . . . . . (لکڑی کے ڈنڈے، قربان گاہ کی جگہ کے متعلق اس جگہ تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مگر چونکہ یہ باتیں
اس مضمون سے غیر متعلق سی ہیں اس لیے اُنکو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مترجم)

اب ججمان (مالک خانہ) اپنے بالوں کو اُتروا دیتا ہے، جسم پر مسکہ کی مالش کرتا ہے۔
آنکھوں میں کاجل لگاکے کچھ کھاتا ہے اور دوسری رسموں کی ادائی پجاریوں کیلیے چھوڑ دیتا ہے۔

ادھوریا کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ پلکشا درخت کی دو شاخیں کاٹے اور قربانی کے
لیے تمام مطلوبہ چیزوں کو باترتیب کرے جنمیں اور چیزوں کے علاوہ گمبیری درخت کی لکڑی کی ایک

पाठाह्होमश्च्चा तिथीनां सपर्य्या तर्पणं बलि: । ۵۸ء
एते पञ्च महा यज्ञा: ब्रह्मयज्ञादि नामका: ॥

کھونٹی بھی ہوتی ہے - یہ کھونٹی ججمان کے چہرے کے برابر ہوتی ہے اور اسکو ذبح ہونے والے جانور کے سینے میں بھونک دیتے ہیں - (" کاس ماری یالیم ہر یدا سوا لم یجینا لکھا سیمیستم") اب ایک دوسری متبرک آگ پر بہت سی نذریں چڑھائی جاتی ہیں اور دوسرے پجاری نیز ججمان اور اُسکی بیوی بہت سے بچن پڑھتے جاتے ہیں - یہ بچن گو رسم کے نقطۂ نظر سے کیسے ہی اہم ہوں مگر آجکل عوام کے لیے غیر دلچسپ ہونگے اور اسی وجہ سے میں انکو اس مضمون میں درج نہیں کرتا - لیکن اُن رسموں کو تفصیل کے ساتھ یہاں ضرور درج کروں گا جو قربانی کے جانور کے ساتھ کیجاتی ہیں -

مذکورۂ بالا مختلف رسموں کے اختتام پر قربانی کے جانور کو آگے لیجاتے ہیں، اُسکو ہلدی، آنولہ اور تیل سے ملتے ہیں - پھر اسکو چاٹ والا اور انکارا قربان گاہوں کے درمیان میں سے ہوتے ہوے ایک ایسے مقام پر لاتے ہیں جو اہا ونیا آگ اور مذبح کے بیچ میں ہوتا ہے اور اُسکو مذبح کے سامنے لیجاکر مغرب کی طرف اُسکا منہ کرکے کھڑا کر دیتے ہیں - یہ گاے ایسے رنگ کی ہونی چاہیے جو اگنی اور اندرا کو پسند ہو اس وجہ سے کہ یہ تمام رسمیں ان ہی دونوں کے نام پر منائی جاتی ہیں - لیکن اگر اس رنگ کی نہ مل سکے تو بجاے اسکے کوئی صحیح و سالم بیل کام میں لایا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ ان عیوب سے پاک ہو یعنی پھلوت نہ ہو، کن چھدا نہ ہو، دانت ٹوٹا نہ ہو، دُم کٹا نہ ہو، کونا نہ ہو، بہرا گونگا یا غیر موزوں سینگوں والا نہ ہو -

نہانے کی رسم کے بعد ادھوریا کو نیا جیا، ستھالیا جیا اور وستو ماہوائی کے ساتھ پوجا پاٹ کی کچھ چیزیں چڑھانی چاہییں اور ان چیزوں کو چڑھاتے وقت اسکو اگنی، اندرا، وایو پر جاپتی سے دعا کرنی چاہیے - پھر اسکا فرض ہے کہ کُسا گھانس کا ایک ٹکڑا لیکر ججمان کی مدد سے قربانی کے جانور کے سر پر سینگوں کے بیچ میں رکھے اور رکھتے وقت یجرویدکی استیوا وغیرہ پہلی نظم پڑھے - یہ قربانی اپاکارانا یا بھید وانی قربانی کہلاتی ہے - اس رسم کے بعد کچھ بچن پڑھے جاتے ہیں جن سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اب جانور قربان کیا جانے والا ہے

اب کچھ بچن اور پڑھے جاتے ہیں جنکو پڑھتے وقت مختلف آگوں پر کچھ ڈالا جاتا ہے اور قربانی کے برتنوں کو باربار اُلٹ پلٹ کے دیکھا جاتا ہے - اسکے بعد جانور کا داہنا سینگ باندھا جاتا ہے، اس طرف کی آنکھ کو رسی سے دو تین مرتبہ گھیرا دیکر باندھتے ہیں تاکہ دوسرا سینگ آزاد رہے - اسکے بعد قربانی کے جانور پر تھوڑا سا پانی چھڑکا جاتا ہے جسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جانور کو خوب پیٹ بھرکے پانی پلا دیا جائے - اور اسی غرض سے پانی کا بھرا ہوا گھڑا موجود رکھا جاتا ہے - پھر

سروک کے چمچے سے آگ پر گھی ڈالا جاتا ہے اور اسی چمچے کے بچے ہوئے گھی میں سے جانور کے ماتھے، کوہان اور دونوں چوتڑوں پر گھی کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ جب ادھوریو بہت سے بچن پڑھ لیتا ہے اور مختلف پوجا پاٹ یا چڑھاوے چڑھا چکتا ہے تو قربانی کرنیوالے کے ہاتھ میں ایک کلھاڑی دیدی جاتی ہے۔ جس رسّی میں جانور بندھا ہوتا ہے اس میں ایک کیل ٹھونک کر جانور کے اوپر تھوڑا سا مکھن مل دیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو کرنے کے بعد اگنی دھرا، ہون کی قربان گاہ سے ایک جلتی ہوئی لکڑی لیتا ہے اور چاٹ والا اور آنکارا قربان گاہوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا سمترا کی آگ کے سامنے آتا ہے اور ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی لیے ہوے داہنی طرف سے جانور کا تین مرتبہ طواف کرتا ہے اور پھر جلتی ہوئی لکڑی کو ہون کی قربان گاہ کے پاس رکھ کر مکرر طواف کرتا ہے۔ ادھوریو ہر چکر کے ساتھ کچھ بہاتا جاتا ہے۔ اور پھر پرجاپتی، اگنی، دایو اور واسدیو پر متواتر چڑھاوے چڑھاتا ہے۔ اب پراتی پر استھاتا کی باری آتی ہے اور وہ گراہاپاتی کی قربان گاہ میں سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ لیکر سمتی ترا کی قربان گاہ میں ڈالدیتا ہے۔ اگنی دھر قربانی کے جانور کو شمال کی طرف، مذبح اور شمالی قربان گاہ کے درمیان میں لاتا ہے اور اُسکے ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی بھی ہوتی ہے۔ ادھوریو اور ججمان اسکو اس برتن سے چھوتے ہیں جس میں جانور کا جگر (دپاسراپایو) رکھا جاتا ہے پھر اول الذکر ایک بچن پڑھکر جانور کو پوتر کر دیتا ہے اور اگنی دھر قربانی کرنے والے کے سامنے جلتی ہوئی لکڑی ادھوریو کے پاس سے اُٹھاکر رکھدیتا ہے۔ اور یہ وہ شخص ہے جو ایک تقرہ بچن پڑھ کر جو سنجواپایا "ذبح کرو" کے لفظ پر ختم ہوتا ہے، جانور کو ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اب ذبح کرنیوالا قربانی کے جانور کو گسا گھاس پر اس طرح پچھاڑ دیتا ہے کہ اُس کا مُنہ پچھم کی طرف رہے اور پیر شمال کی جانب پھیلے رہیں اور "اب ذبح ہو چکا" (سنجپتا) کا لفظ کہکر ذبح کر ڈالتا ہے۔ قربانی کرنے والے اور پجاری کو چاہیے کہ وہ قربانی کرتے وقت اپنا مُنہ پھیرے ہوے بیٹھے رہیں۔ تاکہ وہ اس بے رحمی کے کام کو نہ دیکھ سکیں۔ اور اسوقت ادھوریو کو کچھ خیر خیرات کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اُس بُرائی سے محفوظ رہے جو جانور کے ڈکارنے، کانپنے یا بھاگ جانے کی کوششوں سے یا اس رسم کی ادائی کے وقت دوسرے اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا مختلف کاموں اور چڑھاووں کے متعلق مشتر کتاب رگ کی سانتھا اور نیز

یجر وید سے بہت سے بچن لکھے گئے ہیں اور اسی طرح اس قربانی کے بعد بہت سی پوجا پاٹ اور چڑھاوے کے دشوار و پیچیدہ طریقے بیان کیے گئے ہیں لیکن اُن کا یہاں درج کرنا اس مضمون سے غیر متعلق ہے - ان جزئیات سے جو لوگ واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اصل کتاب سے جس سے میں نے یہ اقتباس لیا ہے رجوع کرنا چاہیے -

ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھایا جاتا تھا - یہ بات اُن ہدایتوں کو پڑھنے سے بالکل ثابت ہو جاتی ہے جو نذر کی بچی ہوئی چیزوں کے کھانے کے متعلق لکھی ہوئی ہیں - انکی تفصیل اور کتاب اسولیانہ سترا میں درج ہے - لیکن اس غرض سے کہ اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے میں کتاب تاتیا برہمنا کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں جس میں جانور کو ذبح کرکے اُسکے کاٹنے کے متعلق تفصیل سے لکھا ہوا ہے - اس عبارت کو پڑھکر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر گوشت یکے بعد دیگرے یا ریچے کھائے نہ جاتے تو اسکے اس طرح الگ الگ اجزا کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی - وہ عبارت یہ ہے :- " اے آسمانی اور انسانی جلاّدو (سمتیارا) اپنا کام شروع کرو، قربانی کے جانور کو کاٹنے کے لیے لیجاؤ - بانیان قربانی کے لیے جانور کو کاٹنے کی فکر ہے - المکا کی آگ کو جمع کرو اسو جہ سے کہ جانور مذبح میں لایا جاچکا ہے - کُسا گھاس کو بچھاؤ ' جانور کے ماں باپ، باپ ، بھائی ، دوستوں اور جانور کے گلہ کی اجازت لے لو - جانور کو اس طرح بچھاڑ دو کہ اُس کے پیر شمال کی طرف ہوں آنکھیں سورج کی طرف ہوں حواس کو اسکے نفس میں مجتمع ہونے دو - اسکے کان انتہائی جوانب تک پہونچ جائیں ، اور اسکی جان عالم بالا میں اور اسکا جسم زمین پر رہے - اسکی کھال کو جدا کرلو تاکہ وہ بغیر کھال کے رہ جائے - اسکے پیٹ کو بغیر چاک کیے اسکے چمڑے کو علیحدہ کرلو - اسکی سانس کو روک لو (یعنی اُسکا منہ کس دو) کہ وہ اندر گھٹ جائے - اُسکے سینے کو اس طرح چاک کرو کہ وہ اُڑتی ہوئی عقاب معلوم ہو - اُسکے ہاتھوں کو علیحدہ علیحدہ کاٹ لو ' اُسکے ہاتھوں کی بوٹیاں کردو ، اُسکے دست کو کچھوے کی شکل میں قطع کردو - اُسکے ٹھیوں کو اس طرح کاٹ کر نکال لو کہ گوشت میں کوئی خرابی نہ آئے اسکی رانوں کو ہڈی سمیت ایک دروازے کی شکل میں کاٹو یا اُسکو ایسا کاٹو جیسا اولینڈر (ایک پودے) کا پتا ہوتا ہے - کل چھبیسوں پسلیوں کو بہت احتیاط سے صحیح و سالم نکال لو اور مختلف اعضاء کو اس ترکیب سے کاٹو کہ وہ صحیح و سالم ہی نکل آئیں - اسکے فضلے کو دفن کرنے کے لیے ایک گڑھا کھودو - راکشسوں کے لیے خون کو الگ پھینکدو - اُس چیز کو جو شکل میں

آنو کی شکل (یعنی معدہ یا انتڑیاں) ہوتی ہے بالکل صحیح و سالم نکال لو (یعنی اس میں کوئی سوراخ نہ ہونے پائے) تمہاری نسل اور انکے بچے بہت اچھی طرح رہیں گے اور کبھی نہیں روئیں گے (یعنی یہ رسمیں شاستر کے احکام کی بناء پر کی جاتی ہیں اسلیے تمہارے خاندان کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا) اے جانورکش! اے ادھرگو! اپنے کام کو حسب قاعدہ انجام کو پہونچا۔ اے ادھرگو! اپنے کام کو انجام دے[۱]۔

اس رسم کے مختلف حصوں کے متعلق کتاب تاتیا برہمنا میں یہ نہیں لکھا ہے کہ اور کیا کیا کرنا چاہیے۔ مگر اتھا وید کی گوپالا برہمنا میں اس کمی کی تلافی کردی گئی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بالتفصیل مذکور ہے کہ جو مختلف لوگ اس رسم میں مختلف حصے لیتے ہیں انکو اس خدمت کے صلے میں گوشت حسب مراتب ملنا چاہیے۔ قربان کیے ہوئے جانور کے چھتیس[۳۶] حصے کرنے چاہیے اور مندرجہ ذیل اشخاص میں سے ہر ایک کو ایک یا ایک سے زائد حصہ ملنا چاہیے جن کی تفصیل

---

[۱] دैव्या : शीमतार उत मनुष्या आरभध्वं । उपनयत मेध्यादुरः । आशासाना मेध पतिभ्या मेधं । प्रास्मा अग्निं भरत । स्तृणीत बर्हि अन्वेनं माता मन्यतां । अनु पिता । अनु भ्राता सगर्भ्यः । अनु सखा सयूथ्यः । उदीचीनां अस्य पदो निधतात् । सूर्य्यं चक्षुर्गमयतात् । वातं प्राणं मन्व वस्टजतात् । दिशः श्रोत्रं । अन्तरीक्षम सुं । पृथिवीं शरीरं । एक धास्य त्वच माच्छ्यतात् । पुरानाभ्या अपि शसो वपामुत्खिदतात् अन्तरेवोष्माणं वारयतात् । श्येन मस्य वक्षः कृणुतात् । प्रशसा बाहू । शलादोषणी । कश्यपे वांऽसा । अच्छिद्रे श्रोणी । कवषोरू स्रेकपर्णा ष्ठीवन्ता । षड्विंशतिरस्य वङ्क्रयः । ता अनुष्ठ्या आवयतात् । गात्रंगात्रमस्या नूनं कृणतात् । ऊवध्य गोहं पार्थिवं खनतात् । अस्ना रक्षः संसृजतात् वनिष्ठुमस्य माराविष्ट । उरूकं मन्यमानाः । नेद्वस्तोके तनये । रविता रवरच्छमितारः । अध्रिगो शमीध्वं । सुशमि शमीध्वं । शमिध्व मध्रिगा इति ।

یہ ہے :-

"پراس تا تا کو دونوں جبڑے اور زبان ملنی چاہیے - پراتی ہرتا کو گردن اور کوہان دینا چاہیے - اودگا تا کو عقاب کی مانند گوشت کا حصہ یاگاے کا سینہ ملنا چاہیے - ادھوریو کے حصہ میں داہنا دست اور ریڑھ کی ہڈی آنی چاہیے - اُپاگاتی کو بائیں طرف والی ریڑھ کی ہڈی ملنی چاہیے پراتی پراستھاتا کو بایاں دست - برہما اور رتھیا کی بیوی کو بایاں چوتڑ - برہنا چچانسی کو چوتڑ کے نیچے کا گوشت - پوتا کو ایک ٹانگ - ہوتا کو بایاں چوتڑ - میٹ وردنا کو بائیں چوتڑ کا گوشت اچھا کا کو بائیں ٹانگ - نیشتا کو داہنا ہاتھ - سدھاسیا کو بایاں ہاتھ - صاحب خانہ کو گاے کی پشت کا گوشت اور کچھ پیٹ کا گوشت (یعنی ساوااورانوکا) - اُسکی بیوی کو کمر کا گوشت جسے وہ برہمن کو دیدیتی ہے - اگنی دھر کو اوجھ (واشنو) دل، گُردے اور داہنی اگلی ٹانگ (داہو) اترِیا کو بائیں ٹانگ - صاحب خانہ کو جو بانیِ قربانی ہو اُسکو داہنی دونوں ٹانگیں اور اُسکی بیوی کو دونوں بائیں ٹانگیں - اور ان دونوں کو عموماً اوپر کا ہونٹ بھی ملنا چاہیے - گراو سٹوٹ کو گردن کی تین ہڈیاں (ورٹبرا) اور مانجرایا جو کچھ بھی انکا نام ہو - اُس شخص کو جو گاے کو ہانک لاتا ہے گردن کی تین ہڈیاں اور آدھا پزیم - چما سدھا وادوکو شانہ یا پھکنا - سبراہنیا کو سر ملنا چاہیے اُس شخص کو جو سوبا کی قربانی کے لیے لوگوں کو بلاتا ہے کھال ملنی چاہیے - جو لوگ قربانی کے بعد

---

۲۹ स्यथातः सवनी यस्य पशोर्विभागं व्याख्यास्यामः उद्धृत्या वदानानि हनू स जिह्वे प्रस्तोतुः कण्ठः सका कुदः प्रतिहर्तुः श्येने पक्ष उद्गातुः दीक्षणं पार्श्वं सा समध्वर्यो : सव्य सुपगातॄणां सव्यो ऽसः प्रति पस्थातुः दक्षिणा श्रोणीरथ्या स्त्री ब्राह्मणाः अधर सकथं ब्राह्मणा च्छं सिनः ऊरुः पोतुः सव्या श्रोणीर्होतुः अवर सकुथं मैत्रा वरुणास्य उरुरक्षा वाकस्य दक्षिणा दोर्नेष्टुः सव्या सदसस्य सदन्ध्यान कन्ध गृह पते : जा घनी पत्न्याः तां सा ब्राह्मणेन प्रतिग्राहयति वनिष्ठु हृदयं वृक्कौ चाङ्गुलमानि दाक्षिणो वाहुराग्नि घ्रस्य सव्य आत्रेयस्य दक्षिणौ पादौ गृहप त्न्या वृतः प्रादायः सहे वैन यो रोष्ठ स्तं गृहपतिरेवानु मा- स्ति मारीजाभ्यि स्कन्धास्ति सम्ब कीकसा अवस्तुतः ति-

اس طرح گوشت کو تقسیم نہ کریں اُنکے لیے اس کتاب میں بہت سی لعنت ملامت مندرج ہے۔ کتاب اتاریا برہمنا میں بھی بالکل اسی قسم کی ہدایتیں درج ہیں۔

جن لوگوں کو زبان، کوہان، ران اور پشت کا گوشت ملتا تھا وہ لوگ نہایت خوش قسمت سمجھے جاتے تھے لیکن جنھیں پیر، شانہ اور اسی قسم کی چیزیں ملتی تھیں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اس حصہ سے بہت ہی کم کام لے سکتے تھے لیکن ان سب کو سوماشراب کافی مقدار میں دیجاتی تھی۔ وہ گوشت کے حصوں کو اچھی طرح دھو لیں، جانوروں کے ذبح کرنے اور خود جانور کے متعلق بھی، جن عام قوانین کی پابندی ضروری ہے، ان میں سے چند ستراکار اس میں درج ہیں۔ خاص خاص تقریبوں پر ان قواعد میں تھوڑی بہت تبدیلی ہو سکتی تھی مگر ایسا کوئی خاص یا استثنیٰ موقع نہ ہونے کی صورت میں انھیں قواعد کی پابندی ضروری تھی۔ اسوالانا نے ان قواعد کو اپنی پہلی کتاب گڑھیا سوترا کے سترہویں باب میں پروکلپا کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ ان قوانین کے مطابق قربان گاہ کی آگ پر گھی کا چڑھاوا چڑھانے کے بعد، سمترا یا پکانے کی آگ کے شمال میں ایک بھٹی بنائی جاتی تھی۔ بھٹی بنانے کے بعد قربانی کے جانور کو خوب پانی پلایا جاتا ہے پھر نہلاتے ہیں بعد ازاں قربان گاہ کی آگ کے سامنے جانور کا منہ مغرب کی طرف کرکے کھڑا کر دیتے ہیں۔ اسکے بعد کچھ پڑھتے ہوئے گھی کو دو مرتبہ جانور کے اوپر چڑھاتے ہیں۔ وہ منتر دُوتم وغیرہ کے لفظ سے شروع ہوتا ہے۔ پھر جانور کو پتے والی شاخ یا ہری ٹہنی سے چھوتے ہیں اور چھوتے وقت یہ ارادہ بھی ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ فلاں دیوتا (نام لیکر) کی رضا جوئی کے لیے میں تجھے قربان کرتا ہوں"۔ جانور کے اگلے حصے پر اب تھوڑا سا پانی جس میں جَو اور دھان بھیگے ہوئے ہوتے ہیں چھڑکا جاتا ہے اور وہ مقصد جسکا اوپر ذکر ہو چکا ہے پھر دوہرایا جاتا ہے۔ اسکے بعد جانور کو تھوڑا سا پانی پلاتے ہیں اور بچے ہوئے پانی کو جانور کے داہنے اگلے پیر پر ڈالدیتے ہیں۔ پھر جانور کو بغیر کچھ پڑھے آگ کے گرد آہستہ آہستہ تین مرتبہ طواف کراتے ہیں۔ پھر اُسکو شمال کی طرف لیجاتے ہیں۔ اُسکے آگے لکڑیوں کا جلتا ہوا

सुश्चैव कोकसा अर्डख्या पा नश्चोन्नेतु : अत ऊर्द्ध्व यम साध्व य्युरणां क्लोमा : समायितु : शिरः सुब्रह्मरणास्य यच्चसुत्या माह्वयतेतस्य चर्म्म यथा खलु षट त्रिंशत् सम्पद्यन्ते । शट त्रिंशदक्षरा नागो: शट त्रिंशदक्षरा वृहती वार्हसो वै स्वर्गोलोक: वृहत्यावै देवा: स्वर्ग लोके यजन्ते यद्वहत्या स्वर्गे लोके प्रतिष्ठति प्रतितिष्ठति प्रजया पशुभिर्य्यं स्वं विभजन्ते ।

گھٹا لیے رہتے ہیں۔ جب جانور پکانے کی بھٹی کے پاس آجاتا ہے تو لکڑی کے گٹھے کو بھٹی میں ڈال کر خوب آگ روشن کر دیتے ہیں۔ تب قربانی کرنے والا کسمر[1] یا لکڑی کی دو مضبوط چھڑیاں اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے، ایک ہاتھ میں پتوں والی اور دوسرے ہاتھ میں بغیر پتوں کی، اور پہلے بعد دیگرے جانور اور او سور یو کو ان چھڑیوں سے چھوتا جاتا ہے۔ اسکے بعد بانیِ قربانی پچھم کی طرف کسا گھاس بچھا دیتا ہے۔ اس گھاس کے اوپر جانور کو لٹا دیتے ہیں۔ اسکے منہ کو مشرق یا مغرب کی طرف کرتے ہیں اور پیر شمال کی طرف۔ اس جانور کو اب سمتیا ذبح کرتا ہے۔ مارنے یا ذبح کرنے کے اوزار کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی مشتبہ ہے کہ اسکے مارنے کے لیے آیا کوئی چاقو استعمال کیا جاتا تھا یا سخت لکڑی کی میخ؟ بہر حال اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ گمبیری لکڑی جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے جانور کو مارنے کے لیے اُسکے دل کے مقام پر گھسیڑ دیا کرتے تھے۔ ان دونوں طریقوں کے متعلق میں نے کسی جگہ لکھا ہے اور اس لکڑی کو اسفیا کہتے تھے۔ بہرحال جانور کسی طریقے سے بھی مارا جائے مگر قربانی کے بعد ہی رسم منانے والے کو چاہیئے کہ وہ جانور کے داہنے پہلو کو کسا گھاس سے ڈھانک کر اُسکے پیٹ میں ایک آڑا چھا سوراخ کر دے اور اندر سے ایک کارآمد عضو کو نکال لے۔ ذبح کرتے وقت اگر جانور کا منہ مشرق کی طرف ہو گیا ہے تو یہ ضروری ہے کہ اُسکی لاش کو موڑ کر اُسکے اصلی مقام پر کر دیا جائے۔ جو عضو اُسکے پیٹ میں سے نکالا جاتا ہے اسکو وایا کہتے ہیں۔ سنسکرت کی لغات میں اس لفظ کو چربی کا مرادف بتایا ہے۔ بعض لوگ اس کا مطلب پیٹ کے پردے یا رگوں کی جھلی سے لیتے ہیں۔ لیکن اسوالیانا کی کتاب کے محشی نے بیان کیا ہے کہ یہ عضو پیٹ میں اوپر کی طرف، ناف کے داہنی جانب ہوتا ہے۔ اس بیان سے ہمارا خیال بالکل جگر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آجکل کے وہ ہندو جو گوشت کھاتے ہیں، کلیجی کو کیسا شوق سے کھاتے ہیں۔ اس بنا پر مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس عضو سے جگر یا کلیجی مراد ہے۔ ایسی مزیدار غذا ہی دیوتاؤں کے کھانے کے لیے موزوں ہو گی نہ کہ جھلی جو آدمیوں کے بھی مطلب کی

---

[1] کسمر لیٹا ربوریا۔ مشہور ہے کہ اس درخت کی لکڑی ٹھوس، سخت اور نہایت پیوستہ ہوتی ہے۔ اس لکڑی کو اصطلاحاً وا پاس ریانی کہتے ہیں۔ سرا پانی بالعموم پکانے کی ہنڈیا ہوتی ہے۔ چونکہ ایک جگہ सशाखा "بغیر پتوں کی" اور دوسری جگہ सपलाशा "پتوں والی" لکھا ہے۔ اس لیے میں نے شاخوں کا مطلب لیا۔

نہیں ہوتی۔

ہر کیف کلیجی کو نکال کر کاٹتے ہیں اور پھر دونوں گیری کی لکڑیوں میں لگا کر اسے دھو! اور آگ پر بھون لینا چاہیے - پھر قربانی کی آگ پر جا کر کلیجی کے ٹکڑے کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں - اس آگ کے جنوب کی طرف بیٹھ کر گوشت پکاتے ہیں اور پکاتے وقت اس میں گھی ڈالتے جاتے ہیں۔ جب اس طریقے سے گوشت پک جاتا ہے تو پھر اسکو پلکشا درخت کے پتوں پر رکھتے ہیں اور ان

سہ ۵ (حاشیہ صفحہ ۳۰)

शामित्रस्य पश्चिमे देशे बर्हिस्यपार्श्वे स्थानं कर्ता । तथा च निहति शमी भवान्तो नद्ध्वर्युं बर्हिरधस्ता दुपास्यति इति श्रुतिः । ततस्तस्मिन् बर्हिषि प्राक्शिरसं प्रत्यक् शिरसं वोदक् पादं पशुं संज्ञपयति शमिता । उदक् पाद मित्येव सिद्धे प्राक् शिरसं प्रत्यक् शिरसं वेति वचनम् उद्क् शिरसः संज्ञपनं मा भूदित्येव मर्थं । ततः कर्ता पुरा नाभेरवोड् नाभेर्दक्षिणतो नाभे राशीनां वपा स्थानं ज्ञात्वा तत्र क्षुरा मन्तर्धाय तिर्यक् छित्वा वपा मुत्खिदेदुद्धरेत् । वंपास्थानन्तु दक्षिणस्य पार्श्वस्य विभिक्ता प्रदेशः । यदि प्राक् शिराः संज्ञप्तः तथा सति दक्षिणं पार्श्व मुत्तानं कृत्वा तृणान्तर्धानादि कुर्य्यात् । ततो वपा मवदाय श्रव खण्ड्या पुनर्वपाग्रहणं कृत्स्ना वदानार्थं । तेना नेष्वदानेष्व कृतस्नानि ग्रहणानि भवन्ति । ततो वपा श्रपणीभ्यां परिगृह्याद्भि रभिषिच्य प्रक्षाल्य मित्रे प्रताप्य, प्रतापवन्तु धर्म मात्रं श्रपणास्योत रत्र विधानात् । ततः शामित्रस्योत्तरतो गत्वा ऽग्रे तोनभी पासन मग्निं वपां हुत्वा ऽस्य दक्षिणत आसीनः श्रपयित्वा श्रपयिता तां वपा मभिघार्य बर्हिषि लक्ष प्रस्थानुनिधाय उभावप्यग्नो यथा गतं परीत्य जुहुयात् अग्नुभ्यो स्वाहेति ।

دونوں آگوں پر دوسری چیزوں کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اس موقع پر چاول بھی اسی طرح پکائے جاتے ہیں اور جانور کی لاش کے خاص طور پر گیارہ ٹکڑے کاٹے جاتے ہیں مثلاً دل، زبان، سینہ وغیرہ۔ پھر ان حصوں کو اور دوسرے غیر معروف حصوں کے ساتھ ملا کر سمترا کی آگ پر پکاتے ہیں۔ دل کو سیخ پر لگا کر احتیاط سے اسکو بھونتے ہیں کہ وہ گل جائے۔ اور بھونتے وقت پکنے تک اس پر گھی ڈالتے جاتے ہیں۔ اسکے بعد مختلف قسم کا پکا ہوا گوشت اور چاول قربانی کی آگ پر کچھ منتر پڑھکر چڑھائے جاتے ہیں۔ ان منتروں میں سے ہر منتر لفظ سواہا پر ختم ہوتا ہے۔ اگر گوشت اور چاول الگ الگ چڑھائے جائیں تو ایک صدا گانہ سوشٹ کرت یا آخری چڑھاوا ان میں سے ہر ایک کے لیے چڑھایا جاتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو صرف ایک ہی آخری چڑھاوا سب کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ بھنا ہوا گوشت بغیر کسی منتر کو پڑھے چڑھاتے ہیں۔ یہ منتر رگ وید کی کتاب سانھتیا سے اقتباس کیے گئے ہیں۔

یہ قواعد گو بظاہر بہت سادے معلوم ہوتے ہیں مگر جب کوئی معزز مہمان گھر کو رونق بخشے تو اسکی دعوت کے موقع پر بہت ہی پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس غرض کے لیے دوسرے قواعد مرتب کیے گئے ہیں، جن میں مہمان کا رگ وید کے ایک اشلوک کو پڑھکر جانور کے ذبح کرنے کا حکم دینا اور ذبح کرتے وقت دوسرا اشلوک پڑھنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس رسم کو مدھوپرکا یا "شہد کے کھانے" کا چڑھاوا کہتے ہیں۔ جن لوگوں کے لیے اس رسم کا ماننا ضروری تھا وہ یہ تھے:- رتوکس، بادشاہ، دولہا، وید کے طلبہ جو اپنی تعلیم ختم کر کے گھر واپس آئے ہوں۔ اچاریہ یا معلم جو ایک

پशोर्ग्रहणं यानि त्रेता यामे का दशा यदानानि पशो : ۵۳
प्रसिद्धानि तानि यथा स्युरित्येव मर्थं । हृदयं जिह्वा वक्ष
इत्येवमादीनि । सर्वज्ञः ग्रहण मेकादशाभ्यो ऽ न्यान्यपि यान्य
ङ्गानि इष्टानि तेषामपि विकल्पेन ग्रहणार्थं । स्वमवदाय
तानि श्रामित्रः श्रपयाति । हृदयं शूले प्रोत्य प्रतापयाति यथा
शृतं भवाति । ततः शृतान्यभिघार्य्यो द्वास्य ततः स्थाली
पाकस्यैक देशं पूर्व्वं जुहुयात् ततो यदानानि ॥ १२॥

سال کی مدت کے بعد گھر واپس آئیں، خسر، چچا اور تمام وہ لوگ جو مرتبہ میں[۴۳] بڑے ہوں۔ ان لوگوں
میں سے کسی کی آمد پر صاحب خانہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ سلام کرنے کے بعد اُسکو بیٹھنے کے لیے کوئی
چیز دے۔ بیٹھنے کی چیز عموماً کُسا گھاس[۴۴] کی چٹائی ہوتی تھی اور رڈُکس یا انگر انکار بچاری آتا تو اُسکو
بیٹھنے کے لیے کُسا گھاس کی چٹائی کا دیا جانا نہایت مناسب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بیٹھنے کی چیز کے لیے
اسوالیانا نے جو لفظ لکھا ہے وہ وستارا ہے۔ جسکے معنی بستر یا ایک ایسی چیز کے ہیں جسپر بیٹھ سکیں
اور ممکن ہے کہ وہ چٹائی، تپائی، کرسی یا پلنگ ہو۔ مختلف کتابوں میں بیٹھنے کے لیے لکڑی کی چیزیں
خصوصیت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

مہمان کے بیٹھ جانے کے بعد، اُسکو تر و تازہ کرنے کے لیے نہایت موزوں چیز، ہندوستان
جیسے گرم ملک میں یہ ہوتی تھی کہ اُسکو پیر دھونے کے لیے پانی دیدیا جائے۔ اسکو پادیا کہتے تھے۔
اور اسکے لیے قاعدہ یہ تھا کہ برہمن مہمان کو پہلے اپنا داہنا پیر دھونا چاہیے اور پھر بایاں۔ اگر
مہمان شُدر ہے تو یہ قاعدہ اُلٹا ہو جایا کرتا تھا۔ چھتری یا ویش کی مرضی پر منحصر تھا کہ چاہے وہ
اپنا داہنا پیر دھوئے چاہے بایاں۔ پیروں کو تین مرتبہ دھونا پڑتا تھا۔ دوسری چیز مہمان کو
ارگھیا پیش کی جاتی تھی جس میں تھوڑا سا پانی، کچھ خوشبو اور پھولوں کے ہار ہوتے تھے[۴۵]۔ اور ان
چیزوں کا تحفہ حقیقت میں اُن چیزوں سے جو آجکل دیوتاؤں پر چڑھائی جاتی ہیں بہت بہتر ہوتا
تھا کیونکہ آجکل دیوتاؤں پر صندل کی لکڑی کا لیپ چڑھاتے ہیں، تھوڑے سے چاول کے دانے
پھول پر ڈالتے ہیں اور اُنکے اوپر پانی چھڑک دیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کا تحفہ پیش کرتے
وقت تین مرتبہ منتر پڑھا جاتا تھا۔ پھر مُنہ دھونے کے لیے ایک گلاس میں پانی دیا جاتا تھا۔
اور مہمان اس گلاس میں سے جتنا چاہے پانی پی بھی سکتا تھا۔ پھر صحیح معنوں میں مدھو پرکا یا
"شہد کا کھانا" پیش کیا جاتا تھا۔ اس کھانے میں دہی ہوتا تھا اور ایک چھوٹے سے پیالے
میں شہد۔ شہد نہ ہونے کی صورت میں گھی دیا جاتا تھا۔ اس کھانے کو لاتے وقت میزبان سے

ف۴۳ ऋत्विगाचार्य्य श्वसुर- पितृव्य -मातुला दीना मुपस्थाने मधुपर्कः
सम्वत्सरे पुनर्यज्ञ विवाहयो रर्व्वाग राज्ञः श्रोत्रियस्य च ॥
॥१२०॥

ف۴۴ कूर्चै र्दर्भै विनिर्मितं ।

ف۴۵ गन्धमाल्यादि संयुक्त मुदकमुच्यते ।

درخواست کی جاتی کہ وہ اُسکو دیکھکر تین مرتبہ منتر پڑھے - مہمان ایک منتر کو پڑھتے ہوے پیالہ لےلیتا تھا - اسکے کھانے کے بعد پانی کا ایک گھونٹ پینا ضروری تھا جس طرح کھانے سے پہلے پانی کا گھونٹ پیتے وقت وہی منتر پڑھا جاتا تھا جسکا اوپر ذکر ہوچکا ہے، مگر دوسری دفعہ پیتے وقت دوسرا منتر پڑھتے تھے - حکم تھا کہ بچا ہوا جھوٹا کھانا برہمن کو دیا جائے - اور یہ بات خاص طور پر جتانے کے قابل ہے - اس قسم کی اُلُش آجکل اگر کسی برہمن کو پیش کی جائے تو وہ اسے اپنی سخت توہین سمجھے گا -

پھر ایک گاے کو لاکر مہمان کے سامنے پیش کر دیتے تھے جس پر وہ کہتا تھا کہ "میں گناہ سے پاک ہوگیا، میرے گناہ دُھل گئے"۔ اور پھر اوم کرو "اپنا کام کرو"[۵۲۶] کے الفاظ کہکر گاے کو ذبح کرنے کے لیے حکم دیتا تھا - اسپر میزبان کسی مناسب دیوتا کے نام پر گاے کو ذبح کردیتا تھا - اگر یہ خواہش ہوتی کہ گاے کو پُن کرکے چھوڑ دیا جائے تو مہمان کو یہ منتر پڑھنا پڑتا "یہ گاے رُدروں کی ماں ہے، واسوؤں کی بیٹی ہے، ادیتوں کی بہن ہے، ہماری خوشیوں کا مدار ہے اس لیے میں تمام سمجھدار لوگوں سے یہ بات صداقت سے کہتا ہوں کہ بے ضرر مقدس گاے کو ذبح نہ کرو - اسکو پانی پینے دو اور گھاس[۵۲۷] کھانے دو"۔ پھر وہ اسکو چھوڑنے کا حکم دیتا اور ایسا ہی کیا جاتا - لیکن گاے کو چھوڑ دینے کا ذکر سنکر کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اس رسم میں جو دعوت ہوتی وہ بغیر گوشت کے ہوتی تھی - اسوالیانا نے بہت زور کے ساتھ فتوے دیا ہے کہ کوئی مدھوپرکا کی رسم بغیر گوشت[۵۲۸] کے

श्राचान्तो दकाय गांवेद यन्ते ॥ १६ ॥ हतो मे पाप मा [۵۲۶]
मेहत इति जपित्वा श्रों कुरुतेति कारयिष्यन् ॥ २४ ॥
इमं मन्त्रं जपित्वा श्रों कुरुतेति ब्रूयात। यदि कारयिष्यान्
मारयिष्यन भवति तदा च दाता आलभेत। तत्र देवता:
प्रागुक्ता : ॥ २४ ॥

माता रुद्राणां दुहिता वसूनां स्वसा ऽऽदित्या नाम [۵۲۷]
ऋतस्य नाभि: प्रराणु वोचं चिकितुषे जनाय मा गामना
गाद् दितिं वधिष्ठ।
पिवतूदकं तृणान्यत्तु। श्रों सुत स्टजेत।

नामा सो मधुपर्को भवति भवासे ॥ [۵۲۸]

نہ کی جائے اور اسکا شارح گرگنا یارنا یہ کہکر اسکی تائید کرتا ہے کہ "جب جانور ذبح کیا گیا ہے تو اُسکے گوشت سے دعوت کی ضروریات کو پورا کرنا چاہیے۔ گائے چاہے چھوڑ ہی کیوں نہ دیجائے مگر یہ ضروری ہے کہ گوشت کو دوسرے ذرائع سے فراہم کیا جائے اور دعوت میں یہ چیز[۵۰] (گوشت) ضرور ہونی چاہیے۔

اس بارے میں یہ مصنف منو کے فرمان کا اتباع کرتا ہے (جس نے صاف صاف بتادیا ہے کہ جو شخص مدھوپرکا یا دوسری رسموں کو پوری طرح ادا کرے اور اُن رسموں میں گوشت نہ ہو تو وہ اس سزا کا مستحق ہوتا ہے کہ وہ اکیس[۵۱] نسلوں تک جانور ہی پیدا ہو۔ اور چونکہ برہما نے قربانیوں کے لیے جانوروں کو پیدا کیا ہے' تو ویدک کی رسموں کے لیے جانوروں کی قربانی کچھ ضرر رساں نہیں ہو سکتی' بلکہ وہ جانور چوپائے' درخت، کچھوے' اور پرندے جو متبرک رسموں کی بھینٹ چڑھائے گئے ہیں' مرنے کے بعد بہتر جنم لیں[۵۲] گے۔

دعوت کے لیے تو مدھوپرکا کی رسم بہت آسانی سے منائی جا سکتی تھی، مگر جو لوگ گوشت کھانے کے عادی تھے اُنکے لیے یہ رسم دشواری کا باعث نہ تھی۔ پس منو نے اسکے متعلق فتوے دیا ہے کہ جو گوشت قصائی کی دکان سے خریدا جائے وہ بالکل پاک اور پرہیزگار ہندو کے کھانے کے لائق ہوتا ہے۔ مجھے کہیں اس بات کا سراغ نہیں ملا کہ جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے ہندو قصائی کسی ایسی مذہبی رسم کی بھی پابندی کرتے تھے جیسا کہ مسلمانوں میں دستور ہے۔ اسلیے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی خاص رسم نہیں کی جاتی تھی' البتہ یہ قاعدہ ضرور تھا کہ جو شخص کھانے کے لیے گوشت خریدتا وہ اُسے پکوانے کے بعد تھوڑا سا دیوتاؤں کو، مُردوں کی ارواح کو، مہمان یا فقیر کو دیدیتا تھا جو رسم یجنا کے ادا ہونے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ برہمنوں کو قتل کرنا، برہمنوں کا شراب پینا، برہمنوں کا سونا چرانا، روحانی پیشواؤں کا بستر ناپاک کرنا اور ایک سال تک اُن لوگوں کے ساتھ رہنا، جو لوگ

[۴۹] मधुपर्काङ्गभोजन समांसं न भवतीत्यर्थः। कुतः मांसस्य
भोजनाङ्गत्वेन लोके प्रसिद्धत्वात्। अनेनाभ्युपायेन भोजन
मप्यत्र विहितं भवति। पशुकरण पक्षे तन्मांसेन भोजनं।
उत्सर्जन पक्षे मान्सान्तरेण॥

[۵۰] منو۔ جلد ۵۔

[۵۱] ایضاً جلد ۵ صفحہ ۳۱۴۔

ان جرائم کے مرتکب ہوے ہوں تو انکو یجنا والکیا نہایت سنگین مجرم قرار دیتا ہے۔ مگر مہا تپا کا یعنی
مہاغی کو شرارت سے مارنا ادنیٰ درجہ کی (اُپاپاتاکا) خطاؤں میں شمار کرتا ہے اور اسکا کفارہ
بھی مقابلۃً بہت کم ہے۔ چنانچہ ایک برہمن جو شراب پینے کا مجرم ہو اُسکے جرم کا کفارہ بغیر خودکشی کے
ہوتا ہی نہ تھا، اور اُسکو پگھلی ہوئی دھات سے خودکشی کرنی پڑتی تھی۔ مگر ایک گاؤکش کو سموُرتا
صرف اتنی سزا دیکر چھوڑ دیتا کہ گاے کاٹنے والے کو ہفتہ عشرہ کے لیے کھانا کم دیا جائے جس
میں صرف جَو کی روٹی، دودھ، دہی، اور گھی ہو۔ اور وہ برہمنوں کو ایک دعوت دے اور ایک
گاے انکو ہدیۃً پیش کرے۔ یجنا والکیا گاؤکش کے لیے ذرا زیادہ سخت ہے یعنی اسے اصرار ہے کہ گا
کاٹنے والا گاے کی پانچوں پیداوار کھائے (پنچا گویا)۔ اور کسی ایک گاے کے پیچھے جہاں جہاں وہ
جائے پڑا پھرے۔ ایک مہینے تک مسلسل گاے کے باڑے میں سوئے اور آخر میں ایک گاے یا
ضایع کردہ گاے کی قیمت کے برابر جرمانہ ادا کرے۔ وہ (یجنا والکیا) کفارہ کی دوسری صورتیں
بھی تجویز کرتا ہے اور اسی طرح اُسکے ہم چشم سمرتی کاروں نے الگ الگ تجویزیں لکھی ہیں مگر وہ ان
میں سے کوئی یہ سزا تجویز نہیں کرتا کہ گاے کاٹنے والے کو خودکشی کرنی چاہیے۔

کتاب نارسن ہیا پریوگ پرجاتی کے مصنف نے مدھو پرکا کی رسم میں گاے کے گوشت کو
کھانے کی ضرورت کے متعلق اسوالیانا کا قانون لفظ بلفظ نقل کیا ہے لیکن ادتیا پران کی ایک
عبارت بھی نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آجکل کالی کے یگ (عہد) میں مدھو پرکا کی رسم
بغیر گاے کو ذبح کیے منانی چاہیے .... مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ادتیا پران
میں بھی قربانی کی ممانعت صاف اور واضح نہیں کی گئی بلکہ طرز بیان سے مترشح ہوتی ہے اور اُسکا
فقرہ یہ ہے " کیونکہ بعض شریف اور عقلمند لوگ ایسا نہیں کہتے اور اس بارے میں متقی آدمیوں کا
عمل ایسی ہی قوی دلیل ہے جیسا کہ ویدوں کا حکم۔ گویا مصنف کہنا چاہتا ہے کہ ایسا نہ کیا
جائے۔ صاف الفاظ میں بیان نہیں کرتا۔ یہ اقتباس اپا پرانوں سے لیے گئے ہیں جو غالباً

۵۲
शु त्तु या व क मैक्षा शी पयोदधि घृतं शकृत् ।
एतानि क्रम शोऽभ्नीयान् मासर्द्धं सुसमाहित :
आह्मणान् भोजयि त्वातु गां दद्यात्म शुद्धये ॥ संवर्त : ।
पञ्च गव्यंपिवं गोघ्नो मास मासीत संयत : ।
गोष्ठे शयोगो ऽनुगामी गोपदानेन शुध्यति ॥ याज्ञवल्क्य :।

گیارہ یا بارہ سو برس سے زیادہ لکھے ہوئے نہ ہوں گے۔ بقول پروفیسر ولسن کے اپا پران بارھویں صدی سے پہلے کے نہیں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ولالا سینا نے اپنی کتاب دانا ساگر میں کتاب ورہی ہنیا رادھیا کا حوالہ دیا ہے اور یہ مصنف گیارھویں صدی میں موجود تھا، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب کم از کم پانچ صدی پہلے کی ہوگی۔ بایں ہمہ ان پرانوں کی حفاظت میں اس قدر بے احتیاطی برتی گئی ہے، اس قدر تحریفیں کی گئی ہیں اور مجموعی طور پر وہ اس قدر مشتبہ ہیں کہ نہایت خوش اعتقاد ہندو بھی انکو وید، سمرتی اور سوتروں کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی درجہ کی کتابیں سمجھتا ہے۔ چنانچہ پدیک پرجاتی میں مذکور ہے کہ جب سروتی اور سمرتی میں اختلاف ہو تو اس صورت میں سروتی کے قول کو ترجیح دینی چاہئے۔ پھر لکھا ہے کہ البتہ سمرتیاں بھی پرانوں سے زیادہ قابل احترام ہیں اور سمرتیوں میں منو کی سمرتی نہایت معتبر سمرتی ہے[۵۳]

پراستنیا جو ایک سمرتی کا مصنف ہے رائے دیتا ہے کہ منو سمرتی کو بھی کلپا سوتروں کے سامنے نیچا رکھنا چاہئے کیونکہ یہ سوترے براہ راست ویدوں سے ماخوذ ہیں اور سمرتیوں سے[۵۴] زیادہ قدر و استناد رکھتے ہیں۔ اس رائے کو کسی محقق اور محتاط نے منسوخ نہیں کیا۔ پھر یہ کہ اپا پران پرانوں سے بھی کم درجہ کی کتابیں ہیں، اور کسی جگہ بھی پرانوں پر انکو ترجیح نہیں دیگئی ہے بلکہ سروتی اور سمرتی پر۔ انکی برتری کا سلسلہ یہ ہے کہ پہلے درجہ کی کتاب سروتی یا وید ہے۔ دوسرے درجہ کی سوترا۔ تیسرے درجہ کی سمرتی۔ چوتھے درجے کی پران، اور پانچویں درجے کی اپا پران ہے۔ اسلیے یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ گاؤ کشی کے معاملہ میں سب سے آخری چیز یعنی اپا پرانوں کو پہلی چار چیزوں پر ترجیح دی جائے۔ کتاب نرنیا سندھو کا مصنف اسکے متعلق اور بھی اوسنے دلیل دیتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں کسی گمنام شخص کا قول نقل کرتا ہے "ایسے کام جو جنت میں نہ لے جائیں اور جنکو عوام الناس نے قابل ملامت ٹھہرایا ہو، نہیں کرنے چاہئیں" یہ استدلال

[۵۳] श्रुतिस्मृति पुराणानां विरोधो यत्र विद्यते ॥
तत्र श्रौतं प्रमाणन्तु तयोर्द्वैधे स्मृतिर्वरा ॥
वेदार्थोपनिबन्धृत्वात् प्राधान्यं हि मनोः स्मृतम्
मन्वर्थविपरीता या सा स्मृतिर्न प्रशस्यते

[۵۴] कल्पसूत्रस्मृत्योर्विरोधे प्रत्यक्षश्रुतिमूलत्वेन ।
कल्पसूत्रं प्रबलमित्याहुः हेमाद्री संग्रहे पौलस्त्याः ॥

کرتا ہے "بس بڑے سانڈوں اور بڑی بھیڑوں کا برہمنوں کے لیے ذبح کیا جانا، جو ویدوں کے ماہر ہیں، اگرچہ اُنکا حکم شرعًا دیا گیا ہے، نہیں کرنے چاہیئے اس وجہ سے کہ اس سے عوام کو نفرت ہے - پھر کہتا ہے کہ گویہ حکم صریحی ہے کہ ایک گائے جو مترا اور ورونا کی قربانی کے لیے موزوں ہو، یا ایک بانجھ گائے یا وہ گائے جو ایک مرتبہ بیاہ کر پھر بچہ نہ دے، قربان کرنا چاہیئے - تاہم ایسی قربانیاں جو عوام کے احساسات کے خلاف ہوں نہ کرنی چاہیئے"۵۵ - ایسی صورت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام میں وید کے احکام کے خلاف یہ جذبات کہاں سے پیدا ہوئے؟ اسکا صحیح اور مناسب جواب یہ ہے کہ جب برہمنوں کو اُس مذہب سے جنگ کرنی پڑی، جس نے (بُدھ مت) بہت بہت زور شور اور کامیاب طریقہ سے تمام قربانیوں کو بند کر دیا تھا تو اُسوقت برہمنوں نے جانوروں کی حُرمت کے اصول کو ایسا مقبول عام پایا تھا کہ وہ اُس پر غالب نہ آسکے بلکہ بتدریج اور غیر مرئی طور پر اُنھوں نے خود اُسے اس طرح اختیار کیا کہ وہ انکے اپنے قانون یا شاستر کا ایک جزو نظر آنے لگا اُنھوں نے شاستر کے ایسے اشلوکوں کو بہت نمایاں کیا جن سے تمام ذی روح مخلوق کے لیے ہمدردی اور رحم کی تلقین ہوتی تھی اور قربانی کے احکام کو اس قدر پس پشت ڈالا کہ وہ رفتہ رفتہ بالکل نظر سے غائب ہو گئے - یہی عمل آجکل ہندوستان میں عیسائیت کے زیر اثر کام کر رہا ہے اور چونکہ

---

۵۵ अस्वर्ग्यं लोक विद्विष्टं धर्ममप्याचरेत न्नात्विति निषेधात्। यथा महोक्षं वा महाजं वा श्रोत्रियाय प्रकल्पयेदिति विधानेऽपि लोक विद्विष्टत्वादननुष्ठानं। यथा यामैत्रा वरुणीं गां यथा मनु वन्ध्या मालभेत इति गवालम्भन विधानेऽपि लोक विद्विष्टत्वा दननुष्ठानं।

निर्णयसिन्धु

यथा: बृहस्पतिः। उक्तो नियोगो मनुना निषिद्धः स्वयमेव तु
युगक्रमाद्वशक्योऽयं कर्तुमन्यै विधानतः॥
तपो ज्ञान समायुक्ताः कृत त्रेता युगे नराः।
द्वापरे च कलौ नृणां शक्ति हानिर्हि निर्मिता॥
अनेक धा कृता: पुत्रा ऋषिभिर्यैः पुरातनैः।
न शक्यन्तेऽधुनाकर्तुं शक्ति हीनै रिदं जनैः॥ —॥

بدھ مت کے عروج کے زمانہ میں بدھ مت کے پنڈتوں کے وعظ و پند کے اثر سے ہندو طبائع پہلے ہی تیار ہو گئی تھیں کہ قربانی کے متعلق انکے مذہبی احکام میں کوئی تبدیلی ہو تو وہ اسے قبول کرلیں۔ لہذا جب برہمنوں نے ویدوں میں گوشت کے چڑھاوے اور بے حساب قربانیوں کے احکام کی تاویل کرکے انکا مطلب محض خلوص دل ایمان اور حسن اعتقاد لینا شروع کیا تو اسکے ماننے میں لوگوں نے کچھ حجت نہ کی۔ گاؤکشی سے یہ پرہیز بلا شبہ اختیاری تھا گر رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا جسکا سبب کچھ تو قدرتی رحمدلی کو سمجھنا چاہیے اور کچھ بدھ مت کے پیرؤں کے جذبات کے احترام کو جس طرح آجکل بھی بنگال کے بعض حصوں میں مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کی خاطر گائے کے گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ تاآنکہ اہل تصنیف لوگوں کے اس فعل کو ایسی ہی قوی دلیل بنانے لگے جیسا کہ ویدوں کا حکم ہوتا ہے اور تحکم کے ساتھ قربانیوں کو موجودہ زمانہ میں ممنوع قرار دینے لگے۔ جب یہ ہو گیا تو پھر خیالات کی تبدیلی میں کوئی کسر نہیں رہی۔ مختصر یہ کہ ہمدردی نوع انسان سے بدھوں کی فریاد ہندو وید کی بہ نسبت زیادہ قوی الاثر ثابت ہوئی اور پھر رسم و رواج نے اس جذبۂ خوف کو جو جانوروں کی جان لینے سے پیدا ہوتا ہے اتنا سخت کر دیا کہ اب وید بھی اسکو کم نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر راجندر لال مترا کا یہ مضمون اس قابل ہے کہ شمالی ہند کے کثیر التعداد تعلیم یافتہ اہل ہنود کے ملاحظہ سے گزرے تاکہ ان کو کم از کم یہ معلوم ہو جائے کہ بقرعید کے موقع پر جو گائے کی قربانی کا رواج ہے اس کی بنیاد کسی دل آزاری کے جذبہ پر ہی نہیں بلکہ "قربانی" کی رسم قدیم الایام سے تمام مذاہب کے پیرؤوں میں کسی نہ کسی صورت میں رہی ہے اور خود ہندوستان کے باشندے بھی ایک زمانہ میں ایسے موقع پر گائے کی قربانی کرتے رہے ہیں۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ مضمون کتابی صورت میں بھی شایع کیا جا رہا ہے۔ جو صاحب اپنے ہندو احباب کو دکھانا چاہیں وہ دفتر الناظر سے منگالیں۔ قیمت ۲ر زیادہ تعداد میں خریداروں کو ۵ عہ فی صدی کے حساب سے کتابیں ملیں گی۔

ایڈیٹر

مومن دہلوی

منجم کہتے ہیں کہ ساعت سعید میں سم قاتل آبِ حیات کا کام دیتا ہے اور بری گھڑی میں شربت کا گھونٹ زہر کا پیالہ بن جاتا ہے۔ لیکن دانشمندوں کا قول ہے کہ ایک ہی وقت میں چلّو بھر پانی کسی کے حق میں آبِ بقا اور کسی کے لیے جامِ فنا ثابت ہوتا ہے۔ ایک ہی ساعت میں کہیں شادی کے لیے سہرا گوندھا جاتا ہے اور کہیں کفن کی تیاری ہوتی ہے۔ ایک ہی پل میں کہیں نقارے بجتے ہیں اور کہیں ماتم ہوتا ہے۔

نظم اردو کی تاریخ بھی عقلائے زمانہ شناس کے قول کی تائید کرتی اور اختر شناسوں کے دعوے کو جھٹلاتی ہے۔

ہجرت کی تیرھویں صدی تمام ایشیائی حکومتوں کے لیے عموماً اور ہندوستان کیلیے خصوصاً منحوس تھی۔ اجزاے ریاست میں انتشار اور عناصر سلطنت میں بدنظمی نے ملک کو حالتِ نزع تک پہونچا دیا تھا۔ شوکتِ تیمور کا مجاور دلی کے لال قلعہ میں نظربند تھا اور اکبر و جہانگیر کا دبدبہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا تھا۔ لیکن یہی گھڑی اردو شاعری کو راس آئی اور اسکے نسیم اقبال نے اسی ظاہرا منحوس ساعت میں گلستانِ دہلی اور چمنستانِ لکھنؤ کو بہارستانِ ادب بنا دیا۔

مظلوم بہادر شاہ ظفر اور رنگیلے جانِ عالم اختر دہلی اور لکھنؤ کے آخری تاجدار تھے۔ سلطنت و حکومت کا جاہ و جلال تو صرف خواب کی تعبیر تھا لیکن اقلیمِ سخن میں کشورکشائی خوب ہو رہی تھی۔ دلی میں ذوق، غالب، مومن اور لکھنؤ میں رند، صبا، اسیر، انیس، دبیر وغیرہم کا سکہ چل رہا تھا۔

صبح قریب آتی ہے تو تاروں میں غیرمعمولی چمک پیدا ہو جاتی ہے محفل برخاست ہونے لگتی ہے تو پتنگے شمعوں سے گلے مل مل کر جاں نثاری اور وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان کی قومی سلطنت کا چراغ بجھنے لگا تو شمعِ ادب کے پروانوں نے اپنا جوہر کمال اس آہنگ سے دکھایا کہ حاشیہ نشینانِ بزم دنگ ہو گئے اور ان سوختگانِ الفت کے سوز و گداز، راز و نیاز کو سمجھے یا نہ سمجھے مگر سب بیساختہ واہ واہ سبحان اللہ کہنے لگے!!

اس منحوس صدی کا ابتدائی نصف حصہ اردو شاعری کے لیے صباحِ عید تھا اور اس عہد میں ایسے ایسے باکمال دہلی اور لکھنؤ میں موجود تھے کہ اردو زبان جب تک زندہ رہیگی اسکے

بارِ منت سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔

صباحِ عید کہ در بزم گاہِ ناز و نعیم
گدا کلاہ و نمد کج نہاد و شہ دیہیم

فقیر سے لیکر بادشاہ تک ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے افراد نظم اُردو کی خدمت میں سرگرم تھے اور اسی ہمت و کوشش کا ثمرہ تھا کہ وہ تمام اساتذۂ فن جن پر اُردو شاعری کو ناز ہے، اسی نا مبارک زمانہ میں مشہور ہوئے اور اُن میں سے بیشتر اسی غیر مسعود عہد میں پیدا بھی ہوئے۔ اس عصر کے باکمال شعرا میں سے ذوق و غالب کو اُنکے شاگردوں نے خوب چمکایا۔ انیس و دبیر کو مذہب و اخلاق نے حیاتِ جاوید عطا کی۔ رند، صبا، اسیر کو لکھنؤ مرحوم کے زبان پرستوں نے زندہ رکھا لیکن مومن و ظفر کی طرف سے ایک عام بے توجہی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور غفلت کا یہی عالم رہا تو چند روز میں انکی آہ و زاری بالکل فراموش ہوجائیگی۔

ظفر کی درد بھری کہانی انشاءاللہ کسی دوسرے موقع پر بہ تفصیل بیان کیجائیگی اسوقت ہم صرف مومن کے کلام سے ہندوستان کی نئی تعلیمیافتہ جماعت کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

حکیم مومن خاں مومن شاعر بھی تھے اور عالم بھی۔ منجم بھی تھے اور حکیم بھی۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور معنی آفرینوں سے دادِ سخن پاتے تھے۔ فارسی میں اُن کا ایک دیوان موجود ہے جسکی بابت مشہور ہے کہ مرض الموت کے عالم میں مکمل کیا گیا، اور اُردو میں اُن کا کلام جمیع اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ غالب کا سا شعلہ زباں اور نازک مزاج سخن سنج انکی تیز طبعی اور ذکاوت پر ایسا مفتوں تھا کہ اُنکی بے وقت موت پر نہایت درد سے کہتا ہے:-

شرط ست کہ روے دل خراشم ہمہ عمر | خونابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن | چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

مشہور ہے کہ میر انیس علیہ الرحمہ کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے ذوق و مومن کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر ہیں مگر مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم صاحب کا یہ شعر پڑھا:

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی | بگڑنے میں بھی زلف اُسکی بنا کی۔

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی۔ جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے۔ ہوا سے اُسکی زلف اُڑ رہی ہے اور میر صاحب اُسکو دیکھ دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ مرزا غالب

بھی مومن کا حسب ذیل شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اپنے سارے دیوان کے عوض میں خرید کرنے کو تیار تھے۔ راست و دروغ برگردنِ راوی بیسویں صدی عیسوی کے روشن خیال غالب اور انیس کا مرتبہ تمام شعرائے اُردو سے افضل و اعلیٰ قرار دیتے ہیں لیکن یہ دونوں بزرگ مومن کی تعریف میں رطب اللساں ہیں، اس لیے قیاس ہو سکتا ہے کہ مومن کا مرتبۂ شاعری اگر ان خدایانِ سخن سے برتر نہیں ہے تو برابر ضرور ہوگا۔

کلیات مومن کی ورق گردانی کرو تو دو نہایت سخت عیب اُنکے کلام میں فوراً نظر آتے ہیں: ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا بیجا استعمال اور صحت زبان سے بنایت بے پروائی۔ فارسی شاعری کا تو اس زمانہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سمجھنا بہت دشوار ہے لیکن انکی اُردو نظم میں بھی بدرجاج اور خاقانی کا عالم نظر آتا ہے۔ فارسی ترکیبوں کی آمیزش غالب کے یہاں بھی بہت ہے لیکن مومن پر عرب کا جن بھی سوار ہے، اسلیے اُن کا بیشتر کلام اس قدر مغلق ہوگیا ہے کہ اُس سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ فارسی اشعار سے مثالیں کون تلاش کرے، ایک اُردو قصیدہ کے چند شعر سنیے اور اس گلستاں کی دست سے اُسکی بہار کا قیاس کیجیے:-

چشم ستارۂ سحر لون زحل سے سُرمہ سا وشنۂ تُرکِ چرخ سے تیز نگاہ مشتری

سامعہ سوز و دلخراش گریہ فزا و زخم ریز نغمۂ نوکِ عندلیب قہقہۂ گلِ طری

غم نہ سما سکا مرا بسکہ جہان تنگ میں چرخ میں یہ محدّبی آگئی اور مقعری

ہر حرکت محرّکِ شوق و مہیّج ہوس قلقل شیشہ قاہ قاہ مطرب طرفہ زیوری

عطرِ مشام حورِ عیں نہ قابِ نو آفریں ادخنۂ و بخورسے عنبر و بان مجمری

اُسکے ادیم حشمت و مائدۂ جلال پر خستہ ذباب کی طنین طنطنۂ سکندری

جوشِ طراوتِ مشام وجہ عطاس عزوجاہ لطف نسیم مشک بیز خلق شمیم عنبری

تختہ حریف کا تباہ حال و تغیر کعبتین نیل مرام و ششجہت مہرہ و قیدِ ششدری

مجھ کو یہ گل زمیں پسند آگئی اتفاق سے مزرعِ غیر میں کسے ورنہ سر کدیوری

ستم یہ ہے کہ یہ قصیدہ ایک ہندو رئیس کی شان میں کہا گیا تھا جنھوں نے ایک ہتھنی خاں صاحب کو عنایت کی تھی۔ خود فرماتے ہیں:-

فیل نشیں بنا دیا خاک نشیں کو اُسنے اب خاک نہیں فلک کو زیب لاف و گزاف برتری

راجہ اجیت سنگھ نام کام روائے خاص و عام جو دے جسکے بے نظام کا رجہاں کی ابتری

اگر قاموس اور صراح دیکھی جائے تو اس قصیدہ کے اشعار غالباً بے معنی تو نہ ثابت ہونگے لیکن معلوم نہیں کہ ممدوح کا مبلغ علم کس قدر تھا اور وہ عربی لغات سے مستفید ہو سکتے تھے یا نہیں -

اس قصیدہ کی بابت ایک نہایت دلچسپ حکایت مولوی محمد حسین آزاد نے تذکرۂ آب حیات میں لکھی ہے - اور اگرچہ اُسکا یہاں درج کرنا مضمون کے تسلسل میں رخنہ انداز ہوتا ہے لیکن ناظرین کے تفنن طبع کے لیئے قلم شکستہ رقم نقل کرتا ہے :-

"راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ دلّی میں رہتے تھے - اور اُنکی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں - وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سرراہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے - خاں صاحب کا اُدھر سے گذر ہوا - لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں - راجہ صاحب نے آدمی بھیجکر بُلوایا - عزت اور تعظیم سے بٹھایا - کچھ نجوم اور کچھ شعر و سخن کی باتیں ہوئیں اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ - ہتھنی حاضر ہوئی وہ خاں صاحب کو عنایت کی - اُنھوں نے کہا کہ مہاراج میں غریب آدمی ہوں، اسے کہاں سے کھلاؤں گا اور کیونکر رکھوں گا - کہا کہ سَو روپئے اَور دو - خاں صاحب اُسی پر سوار ہوکر گھر آئے اور پہلے اس سے کہ ہتھنی روپیہ کھائے، اُسے بیچ کر فیصلہ کیا -

عبداللہ خاں اَوج دہلوی نے اسی موقع پر کہا تھا

ہتھنوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے نجومی بنکے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے"

ہندو رئیس کی شان میں جو قصیدہ لکھا اُسکا یہ حال ہے تو نعت و منقبت کے قصائد کا کیا پوچھنا، وہاں تو ہر ہر قدم پر لغات کا بادل گرجتا ہے، اور دس پانچ شعر بھی ایسے صاف دستیاب نہیں ہو سکتے جنکے معانی و مطالب کتب طب و لغت کی ورق گردانی کے بغیر اس زمانہ میں حل ہو سکیں -

دشوار پسندی کا تو بیان ہو چکا، اب زبان کی کمزوریاں دیکھیے :-

(۱) ناکامیوں کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے شوقِ وصال و اندوِ ہجراں نہیں رہا

(صحیح لفظ اندوہ ہے)

(۲) اے آرزوے قتل ذرا دل کو تھامنا مشکل پڑا مرا مرے قاتل کو تھامنا

(مرا مرے کی تکرار نامناسب ہے)

(۳) کیا ہوا ہوا اگر وہ بعد امتحاں اپنا بے گنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا

(ہوا ہوا کی تکرار نہایت کریہ ہے)

(۴) ایک ہی جلوۂ مہروں میں ہوا سو ٹکڑے جامۂ صبر جسے کہتے ہیں کتاں ہوگا
(مہرو کون ہے؟ موصوف کے بغیر صفت سے محبوب کی طرف اشارہ کرنا شانِ اُستادی سے بعید ہے)

(۵) نہ چاہوں روز جزا داد یہ ستم دیکھو کب آزماتے ہیں جب وقتِ امتحان نہیں
(کون آزماتے ہیں؟ فاعل ندارد)

(۶) اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زباں غزل جلجائیں جسکے رشک سے عاسد بسانِ شمع
(جب تک شعلہ کو شعلا نہ پڑھیے مصرعۂ اول موزوں نہ ہوگا)

(۷) دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے فلس ماہی کے گُلِ شمع شبستاں ہونگے
(دوسرے مصرعہ نے شعر کو چیستاں بنا دیا)

(۸) وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تیغِ شیشے کی کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشے کی
(سخت تعقید ہے)

اس قسم کی غلطیاں کلیات مومن کے قریب قریب ہر صفحہ پر پائی جاتی ہیں۔ ایسے مقام اگر کسی دوسرے شاعر کے کلام میں اس قدر افراط سے ہوتے تو وہ مسلم الثبوت اُستاد نہ مانا جاتا لیکن مومن کی شاعری میں چند اوصاف ایسے تھے جنھوں نے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا اور جوہر شناسانِ سخن کو اُنکی عظمت کے اعتراف پر مجبور کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ حکیم صاحب باہمہ تبحر علمی اور تقدس ظاہری فطرتًا عاشق مزاج اور حُسن پرست تھے۔ اسلیے وارداتِ عشق کے بیان اور مضامین غزل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُنکے ہمعصر کبھی وصلِ صنم کی فرضی تصویر کھینچتے اور کبھی لذتِ فرقت کی نقالی کرتے تھے مگر وہ اپنی گذری ہوئی کہانی بیان کرتے تھے۔ دوسرے "جگ بیتی" کہتے اور وہ "پر بیتی" سناتے تھے۔ اُن کا دیوان معاملہ بندی اور راز و نیاز عاشقانہ کا گنجینہ ہے۔ اظہار جذبات عشق میں وہ صادق البیان تھے اسوجہ سے میدان تغزل میں اُنکا کلام اپنے ہم مجلسوں سے بہت اعلیٰ ہے۔

ذیل کے چند شعر سُنیے اور سر دُھنیے۔ ان میں سے ہر ایک شعر بعض اساتذہ کے ضخیم دیوانوں کا جواب ہے :-

حال دل یار کو لکھوں کیونکر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال　　　ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

کیسے طوفاں اٹھائے لوگوں نے　　　مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
وصل کی بات کب بن آئی تھی　　　دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نہ دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم　　　منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی　　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن　　　کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

کیسے گلے رقیب کے کیا خوف اقربا　　　تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بتخانہ سے نہ کعبہ کی تکلیف دے مجھے　　　مومن - بس اب معاف - کہ یاں جی بہل گیا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملینگے کسی سے ہم　　　پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گل تو دور اور سوے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو عذر کچھ چاہیے ستانے کو

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

پیہم سجود پاے صنم پر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ایک ہم ہیں کہ ہوے ایسے پشیمان کہ بس ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

اسی قسم کے سیکڑوں اشعار دیوان مومن میں موجود ہیں جو صفائی بیان، صدق جذبات اور تاثیر کلام کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس جوہر کمال کے علاوہ مومن کا طرۂ امتیاز بندش کی چستی، اور ترکیبوں کی دل آویزی ہے۔ فارسی الفاظ کی بقاعدہ اردو جمع بنانا اور اُنکے ذریعہ سے بندش کو شگفتہ کرنا مومن کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں

رشک فغاں کی ہاے رقیب آفریناں محشر نے خفتگان لحد کو جگا دیا

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

بدنامیوں کے ڈر سے عبث تم چلے کہیں ہوں تیرہ روز میری سحر بھی تو رات ہے

فارسی ترکیبوں سے مرزا غالب بھی خوب کام لیتے ہیں لیکن مومن کی شان ہی نرالی ہے ذوق، غالب اور مومن کے انداز کلام کا نمونہ دیکھنا ہو تو ایک ہی بحر اور ایک ہی قافیہ میں ان اساتذہ کی سیف زبانی ملاحظہ فرمائیے:۔

آسماں کے لیے

ذوق۔ بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ — تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لیے
غالب۔ زمانہ عہد میں اُسکے ہے محوِ آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
مومن۔ نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لیے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لیے

آشیاں کے لیے

ذوق۔ صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لیے — قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کے لیے
غالب۔ نشاں یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
مومن۔ کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امنِ قفس — ہے بیمِ برقِ بلا روز آشیاں کے لیے

جہاں کے لیے

ذوق۔ بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لیے
غالب۔ رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
مومن۔ جنونِ عشقِ ازلی کیوں نہ خاک اُڑائیں کہ ہم — جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لیے

جاوداں کے لیے

ذوق۔ اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لیے
غالب۔ دو زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
مومن۔ خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں — اُمید کشتہ ہے یاس جاوداں کے لیے

زباں کے لیے

ذوق۔ بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو — زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے
غالب۔ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
مومن۔ مزا نہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ — میں تلخکام رہا لذتِ زباں کے لیے

امتحاں کے لیے

ذوق۔ وہ مول لیتے ہیں جب دم کوئی نئی تلوار — لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے
غالب۔ فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے
مومن۔ بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے — ہمیں بھی دینی تھی جاں اُسکے امتحاں کے لیے

پاسباں کے لیے

غالب۔ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے / اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
مومن۔ ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا / وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے

ناگہاں کے لیے

ذوق۔ اشارہ چشم کا تیرے یکایک اے قاتل / ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لیے
مومن۔ دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیے / سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیے

مقطع

غالب۔ ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا / صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے
مومن۔ رواں فزائی سحر حلالِ مومن سے / رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لیے

ابنائے زمانہ کی رسم فرسودہ کی پابندی کی جائے تو لازم ہے کہ مومن کے اشعار میں نئے نئے معانی پیدا کیے جائیں اور منطقیانہ دلائل سے اُنکے کلام کی فضیلت ذوق و غالب کے سخن پر ثابت کی جائے لیکن یہ ایک صریح ظلم ہے۔ اُستادی کی حیثیت سے ذوق کا مرتبہ غالب و مومن سے یقیناً افضل ہے۔ اور درد و تاثیر کے اعتبار سے مومن کا مرتبہ غالب کے برابر اور ذوق سے بدرجہا اعلیٰ ہے۔

غالب نے اپنے دیوان کا عطر کھینچ لیا:

ڈیڑھ جزو پہ بھی تو ہے مطلع و مقطع غالب / غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

اگر ایسا ہی انتخاب مومن کے کلیات کا مرتب کیا جاتا تو وہ دیوان غالب سے کم رتبہ نہ ہوتا۔ علاوہ غزلیات کے مومن کے یہاں مثنویاں، واسوخت، اور مرثیے بھی موجود ہیں، اور یہ سب مل جل کر مومن کو آج وہ درجۂ امتیاز عطا کرتے جو مرزا غالب نے غصب کر رکھا ہے۔

مومن کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وہ صرف ترپن (۵۳) سال کی عمر میں ایک ناگہانی چوٹ کے صدمہ سے منزل بقا کی طرف راہی ہوئے۔ اُنکو دیوان پر نظرثانی کرنے اور اُس میں سے بےلطف اور دشوار اشعار خارج کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر وہ "دہ یک" پر عمل کرتے تو اُنکے بیشتر ہم صحبتوں کے چراغ گل ہو جاتے۔

ادب اُردو کے لیے نہایت مفید ہوگا اگر اسوقت کوئی سخن فہم کلیات مومن کا انتخاب اُس نمونہ پر مرتب کرے جیسا کہ مولوی عبد الحق ہاپڑی ثم الحیدرآبادی نے کلیات میر کا شائع کیا ہے۔ مسرت کی

بات ہے کہ جدید تعلیم یافتہ جماعت میں سے مولوی ضیا احمد ایم اے بدایونی کلام مومن کی طرف متوجہ ہوے ہیں اور قصائد مومن کا ایک صاف اور صحیح نسخہ شایع کرنے کی نیت کی ہے مشکل اشعار کی شرح بھی لکھی ہے اور بعض ایسے شعروں میں معنی پیدا کیے ہیں جنکو سواے مومن اور اُنکے خاص احباب کے شاید کوئی نہ سمجھا ہوگا۔ شرحوں کی مدد سے بدر چاچ اور غنیمت کی خیال بندی بھی تحسین اور ستایش کا خراج وصول کرتی ہے لیکن سواے طالبعلموں کے ہندوستان میں اب اُنکو کون پڑھتا ہے۔ قصائد مومن کا بھی وہی انداز ہے۔ مولوی ضیا احمد صاحب کی شرح مومن کے دشوار اشعار کو عام فہم بنا دیتی ہے لیکن سواے خواص کے اُن سے آج کون لطف اندوز ہوگا۔

اگر مولوی صاحب کو قصائد کی شرح لکھنے کا شوق تھا تو اُنکو قصائد ذوق و سودا کا ایڈیشن شایع کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر مومن کے کلام سے الفت تھی تو اُسکے اُن اصناف پر توجہ کرنا مناسب تھا جہاں کہ آفتاب کمال تیز ہے۔

کہتے ہیں کہ مفتی خطا کرتا ہے اور ثواب پاتا ہے۔ مولوی صاحب نے شرح لکھنے کے لیے قصائد مومن کے انتخاب کرنے میں خطا کی، مگر اُنکی نیت ظاہرا صحیح ہے۔ اسلیے ہم دعا کرتے ہیں کہ اُنکی تالیف کو قبولیت نصیب ہو۔ البتہ دل محزوں کی تمنا یہ ہے کہ وہ کلیات مومن کا انتخاب مرتب کریں اور دیوان کا عطر کھینچ کر ملک کو دکھادیں کہ واردات عشق و محبت کی تصویر کشی میں مومن کو اپنے ہمعصروں سے وہی نسبت ہے جو آفتاب کو ماہتاب سے، ستارہ کو جگنو سے، چاندی کو گلٹ سے یا بائیسکوب کو میجک لنٹرن سے

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

امیر احمد علوی

نورِ محبت

تارے بحری مسافر کے ہمراہ ہیں اور اسکی رہنمائی کرتے ہیں۔ جہاں کہیں وہ جاے۔ چاند اپنے اوقات کا پابند ہے۔ سورج کبھی دغا نہیں دے سکتا۔ زمین اور سمندر دنیا کو چاروں طرف سے گھیرے ہوے ہیں۔ اسی طرح محبت عاشق کے ساتھ ہے۔ جہاں کہیں وہ جائے۔ مگر تارے دن کو اپنی روشنی کھو دیتے ہیں۔ چاند اندھیری رات میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے۔ سورج شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ سورج خواہ چھپ ہی کیوں نہ جائے مگر محبت اور نقل محبت ہمیشہ چمکتی رہتی ہے۔ عاشق کی رات تاریک ہوہی نہیں سکتی اور اُسکے دن روشن سے روشن تر ہوتے ہیں (رضیہ)

مقامی مہادیو

"ملکِ خدا تنگ نیست" میں جائے دم زدن نہ ہو! مگر "از صفِ طفلاں وسنگ رہ شدہ برخلق تنگ" میں بھی کوئی کلام نہیں! ملکِ خدا کی تقسیم انسانی فرعون کے ہاتھوں "سنگ آمد و سخت آمد" کے مترادف قرار پاتی ہے! زمینِ وسیع انسانی فرعون کا نظامِ اقتدار قائم رکھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے اجزاء - یا بہ الفاظِ دیگر اضلاع - میں تقسیم ہو جاتی ہے اور خلق خدا کی قسمت اس درجہ انسانی ہاتھ میں آجاتی ہے کہ نہ کھانے کو رزق باقی رہ جاتا ہے نہ مرنے کو زمین!!

فرماں روائی کی عظیم الشان فیکٹری کے چلانے کے لیے ہر ضلع کی مشین میں متعدد چلتے پُرزوں کا وجود اسی قدر ضروری ہے جسقدر کنھیّاجی کے لیے بانسری، آموں کے باغ کے لیے کوئل یا ہندوستان کے لیے مفلسی! اِن مقامی پُرزوں میں ہر ایک اپنے حلقۂ گردش میں بجائے خود ایک زندہ دیوتا ہی، مگر ان تبدیل ہوتے رہنے والے دیوتاؤں میں ایک ذاتِ بزرگ کو مہادیو کا مرتبہ حاصل ہونا امرِ بدیہی ہے! اس مقامی مہادیو کو ضلع کی حکومت و انتظام سے وہی تعلق ہے جو تہذیب و ترقی کو گرانی سے یا گھڑی کو بال کمانی سے!

یہ ضلع کا مہادیو قد و قامت - یا - رنگ و روغن کے اعتبار سے بالشتی سے لیکر شتر قامت تک اور کالے سے لیکر گورے تک ہر قسم کا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے! بعض اوقات آب و ہوا کے زیرِ اثر یا معدہ و بلغم کی امداد سے کچھ ایسی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے جس پر "چھوٹا قد، موٹا بدن، اُسپہ یہ کوتاہ گردن ؛ آدمی ہے کہ مری جان ہے مُنیا بیگم" بالکل صادق آجاتا ہے! اعضائے ظاہری کے لحاظ سے اُس میں اور بقیہ دو پایہ مخلوقات میں کوئی حدِ فاصل نہیں قائم کی جا سکتی البتہ وہ اپنے ایک ایک عضو کو - خصوصاً چشم و ابرو کو - دروغ راست مانند کے اصول پر حسب حاجت استعمال کرنے میں پورا قادر ہوتا ہے! وہ دو آنکھیں رکھنے پر بھی جب چاہے نیک معاش اور بدمعاش کو یکساں طور پر ایک آنکھ سے دیکھ سکتا ہے اور جب چاہے عینک کی امداد سے بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہونیوالے واقعات اُسے نظر نہ آئیں گے! اُس کی آنکھیں مشاہدۂ واقعات کے لیے دُوربین سے لیکر خُردبین تک ہر طرح دیکھ سکتی ہیں، کبھی چیونٹی اُسکو ہاتھی نظر آسکتی ہے اور کبھی ہاتھی بالکل معدوم ہو سکتا ہے! یہ آنکھوں والی کیفیت کم و بیش اُسکے تمام آلاتِ حواس میں

پائی جاتی ہے!

علم الحیوانات کے محققین میں اس ذاتِ بابرکات کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے: بعض اسکو انسان وحیوان کی درمیانی کڑی سمجھتے ہیں اور بعض انسان وشیطان کی؛ بہرصورت اس کے انسان ہونے میں سب کو احتمال ہے! ضلع کی حدودِ اربعہ میں اس کی ذات ایسی عالمگیر ہستی ہے جس سے کسی فردِ بشر کو نجات نہیں۔ مندر کا سنکھ گھڑیال ہو یا مسجد کی اذان، اس کو ہر معاملہ سے براہِ راست۔ یا بر اوِ پیچ۔ کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے! بعض حضرات اس نتیجہ پر پونچے ہیں کہ مہادیو جی کی تمام کائناتِ اقتدار اُنکے چند دیوتاؤں، متعدد "مخطوب وُمسَنَّدْ" (خطاب یافتہ وسند یافتہ) افراد، پشیہ ور خوشامدیوں، آنریری بیگاریوں اور بعض خفیہ نویس محرروں پر مبنی ہے؛ میرے خیال میں یہ نتیجہ ابھی مزید تجربات و مشاہدات کا محتاج ہے!

اس میں شک نہیں کہ عادات و اطوار کے لحاظ سے یہ مہادیو مجمعِ کمالات نظر آتا ہے! علی الصباح صحیفۂ پائنیر کی بلاناغہ تلاوت سے لیکر شام کی کلب والی تفریح تک اس کے اوقات تہذیبِ رائج الوقت کے اصولِ موضوعہ پر منقسم نظر آتے ہیں اور یہ اُن کا اس درجہ پابند ہوتا ہے کہ کبھی آفاتِ ارضی وسماوی کی بدولت اگر ان معمولات میں خفیف سا فرق لازم آیا اور مہادیو کے اُن اعضاء کو جن سے ترک شدہ معمول کا تعلق تھا جمائیاں آنے لگیں! "ہرفن مولا" ہونا بھی مہادیو کے لیے اُسی قدر ضروری ہے جسقدر ہندوستانی کے لیے نفاق پسندی: وہ فن حکمرانی سے لیکر محض راجہ رانی تک اور جہاں بانی سے لیکر صرف بَیرّا بانی تک، تمام فنونِ لطیفہ وکثیفہ میں پوری مہارت رکھتا ہے! دُنیا سازی ہو۔ یا۔ ابلہ نوازی، مقدمہ بازی ہو۔ یا۔ بیٹھک بازی، وہ ہر ایک میں حسب حاجت طاق نظر آتا ہے!

اپنی صفاتِ پسندیدہ کو وہ اپنی ہی ذات تک محدود رکھنے کا بخل کبھی نہیں کرنا چاہتا: وہ آئے دن اپنے ماتحت چیلے چانٹوں کو اُسی رنگ میں رنگ دینے کی عملی تعلیم، چشم وابروسے، آواز کے اُتار چڑھائو سے اور قلم کی جا وبیجا جنبش سے دیتا رہتا ہے اور اس کے ماتحتین کا ایک ایک فرد اپنے اپنے ظرف واستعداد کے لحاظ سے اس فیضِ متعدی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا! اُسکی مجرد صحبت اکثر اوقات اکسیر اثر ثابت ہوتی ہے؛ وہ اپنے ہم نشیں اصحاب کو، کلب کی سرزمین ہو یا ملاقات کے کمرہ کی چہار دیواری، صرف تبادلۂ خیالات سے مستِ مئے پندار بنا دیتا ہے اور اس خوبی کے ساتھ بنا دیتا ہے کہ ظرف قدح خوار سے زیادہ کسی کا حصہ متجاوز نہیں ہوتے پاتا!

اُس کی ذاتِ واحد کے انعکاس سے تمام ضلع کی مخلوق ایک مخصوص طور پر جگمگا اُٹھتی ہے! اسکی تعلیم وصحبت کا اثر بہ لحاظِ جزئیات نہ پورے طور پر ابتک دریافت ہو سکا ہے نہ بیان کیا جاسکتا ہے مگر بعض عادات کا اُسکے حدود اختیار میں بین طور پر سکۂ رائج کی طرح پھیل جانا اکثر وبیشتر تجربہ میں آتا ہے اور اُن ہی کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے! راست گفتاری کا دال میں نمک کی حد تک رہ جانا، تقیۂ مصلحت بنیاد کا شب وروز استعمال، طاقت پرستی وکمزور کشی، ابلہ فریبی وتن پروری، خود بینی وخود فروشی، اُمید افزائی وپیماں شکنی، وہ اوصافِ حمیدہ ہیں جو معاشرتِ موجودہ میں مہادیوجی کے دم قدم سے پورے طور پر سرایت کر گئی ہیں! سب سے زیادہ سودمند اور چوٹی کی خوبی غیر ضروری دیانت داری کا استیصال سمجھ لیجیے! اس میں مطلق شک نہیں کیا جاسکتا کہ دیانت داری کی فرسودہ وافلاس انگیز عادت موٹر اور برقی پنکھے کے اخراجات برداشت کرنے کے زمانہ میں سوسائٹی کے لیے حد درجہ مضر ہے: یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے نذر ونیاز پسند ملک میں گھر کے بیر تیل کے ملیدہ (مالیدہ) پر راضی ہوجائیں مگر باہر کے مُرشد کیک اور پڈنگ سے کم پر ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتے: اپنی ہستی حسب مرضی برقرار رکھنے کے لیے کیک اور پڈنگ کھلانا ایسا ہی ضروری نظر آتا ہے جیسا موٹر چلانے کے لیے پٹرول؛ پھر ایسے گردوپیش میں اور ایسے ناگزیر اخراجات کی موجودگی میں دیانت داری کا دقیانوسی راگ الاپنا بالکل اُسی حد تک عسرت انگیز نظر آتا ہے جس حد تک دوسروں کو سود دینا اور خود سود نہ لینا! دونوں باتیں سوسائٹی کے لیے یکساں طور پر مضر اور یکساں طور پر قابل استیصال! ہزار ہزار شکر ہے کہ مہادیوجی کی نظر میں بھی دیانت داری کی وقعت ایک حماقت آمیز فعل سے زیادہ نہیں ہوتی اور وہ جب اپنے ماتحت افراد کا جائزہ لیتا ہے تو اس ناقابل لحاظ عادت کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا! ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے سرفراز افراد بفضلہ دن دوگنے اور رات چوگنے لحیم وشحیم ہوتے جاتے ہیں! داد وستد کے تحت میں وہ نہایت کھری اسامی ثابت ہوتا ہے اور اُس کی تمام فرماں روائی تجارت کے مسلّمہ اصولِ موضوعہ وعلوم متعارفہ پر مبنی نظر آتی ہے! اُس کی رائے میں دنیا کی ہر چیز مناسب معاوضہ کے ادا کیے جانے پر قابلِ خرید وفروخت ہے! اور تو اور ہر انسان - معہ اپنی زبان کے - اُس کی نظر میں ایک قابلِ خرید جنس ہے: اور واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک کی صحیح قیمت کا اندازہ کرنا اور وقت حاجت بہ آسانی ہر بولتی چڑیا کو مول لے لینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے! زر، زبان، وزور کے معاوضہ پر وہ بڑے بڑے پنڈتوں اور مولویوں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ آئے دن خریدتا رہتا ہے اور

بڑے بڑے جامع المتفرقین و تنبیہ الغافلین اُس کی اُنگلیوں میں آتے ہی موم ہو جاتے ہیں! لطفِ معاملہ یہ ہے کہ روپیہ سے مستغنی ہونے والے متمول افراد اپنی گرہ سے خرچ کر کے محض چند حرف و نمائشی اعزاز کے تبادلہ پر اُسکے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں! ایمان کی تو یہ ہے کہ خود ایمان جیسی کوڑیوں کے مول نہ بِک سکنے والی شے بھی اُسکے دَورِ تجارت بنیا دمیں بڑی بڑی رقموں پر دن دھاڑے بیچی جا سکتی ہے!!

یہ تمام اوصاف حمیدہ کم و بیش ہر مہادیو میں پائے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا تقریبًا محال معلوم ہوتا ہے! البتہ صرف سودیشی و بدیشی کی بنیاد پر ایک بیّن تفریق ضرور ممکن ہے! اس میں کلام نہیں کہ مہادیو کی اونچی جگہ کے فرائض انجام دینے کے لیے ہر سودیشی مہادیو بھی بدیشی کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اِن دونوں میں قابلِ لحاظ حد تک کھرے اور کھوٹے کا فرق برابر نمایاں رہتا ہے! ایک زمانہ کے نبض شناس نے کیا خوب فرمایا ہے:

هر چند زمانه مجمع جهال ست		وز جهل نه حال شاں بیک منوال ست
کودن همه: لیک از یکے تا دگرے		فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

بدیشی مہادیو کہیں ہو اور کسی حالت میں ہو اپنے گھر کے ساتھ ہمیشہ سچا۔ گویا۔ کم از کم۔ گھر کا ہو کر رہتا ہے۔ لیکن سودیشی مہادیو اپنی کوشش نقالی میں دھوبی کے ہمدم کی طرح نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا؛ نہ کرسی کا رہتا ہے نہ کھاٹ کا!

سودیشی مہادیو حصول تعلیم کے لحاظ سے کم و بیش دو اقسام کے دیکھے اور سُنے گئے ہیں! ایک وہ جو بدیشی اسناد کے زعمِ باطل پر اپنی شخصیت کو کسی عنوان سودیشی کے تحت میں لانا پسند نہیں کرتے اور ایک وہ جو صرف سودیشی اسناد پر بحض حسن اتفاق سے مہادیو کے مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں! میرے ایک عنایت فرما قسم اوّل کو قلمی اور دوم کو تخمی سے یاد کرنے کے عادی ہیں۔ میں اِن خطابات مختصر کی کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتا اور غالبًا اسکے سوائے اور کوئی نظر بھی نہیں آتی کہ عنایت فرمائے موصوف کی ساری عمر ان دیہاتوں کو آم کھلاتے گذری ہے اس لیے جو نام سوجھتا ہے وہ بھی اُس رعایت سے خالی نہیں ہوتا! خیر۔ محض آسانی شناخت کی خاطر میں اُنکی اجازت سے یہ دونوں لقب برائے چندے مستعار لے لیتا ہوں!

قلمی مہادیو ظاہری رنگ روپ کی بدولت اکثر بے ریشہ، باریک پوست اور شاداب نظر آتے ہیں۔ البتہ تجربہ و معاملہ فہمی کے تحت میں وہ نسبتًا تخمی سے زیادہ گھٹل۔ یا۔ ثقیل الہضم ہوتے

ہیں! لیکن اس ثقلِ ذہن کا علم خدا کے فضل سے انکے دماغ میں کسی طرح نہیں ٹھونسا جا سکتا اور انکو آئے دن بدیشی تعلیم سے پیدا ہونے والی ناقابلِ برداشت لیاقت کے اجزائے غیر منہضم کا استفراغ ہوتا رہتا ہے! بعض اوقات معدلت گستری کے فرائض انجام دینے میں انکو قانونِ تعزیری کی یہ خامی کہ اس میں ہر جرم کی انتہائی سزا درج ہے اور ابتدائی مفقود ہے بڑی شانِ ہمہ دانی کے ساتھ بھرے اجلاس میں بیان کردینی پڑتی ہے! اُن کے حدودِ اختیارات ربڑ کی طرح کھینچ تان کر حسب حاجت بڑھائے جا سکتے ہیں اور وہ جب چاہیں سشن تک کے احکامات خود ہی صادر فرما سکتے ہیں! سگ اصحاب کہف کی باقیات الصالحات سے انکو از حد شوق ہوتا ہے اور وہ اکثر و بیشتر رفع حاجات کے لیے قطعاً کموڈ کو اپنا قاضی الحاجات سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں! باایں ہمہ وہ اپنی صاف ستھری صورت، چکنی چپڑی باتوں، نکھ سے شکھ تک درست لباس، اور ظاہری نمائش کے اعتبار سے عموماً نظرفریب ہوتے ہیں؛ اب یہ کہ "صورت حرام بھی ہوتے ہیں" ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر اہل الرائے صاف صاف اظہار رائے کرنے سے ہنوز گریز کرتے ہیں!

ٹھیٹھ سودیشی۔یا۔تخمی مہا دیو اکثر اعتبارات سے نہ قلمی سے ملتا ہے نہ بدیشی سے! سب سے پہلے؛ اس ضعیف البنیان کو مہا دیو جی کا مرتبہ حاصل کرنے میں اس قدر عرصہ دراز لگ جاتا ہے کہ جسم مبارک سے عموماً، اور بشرۂ شریف سے خصوصاً "کاروان عمر رفتہ کے نشان" بالکل ہویدا ہو جاتے ہیں! اُسترے کے حدودِ اختیارات میں رہنے والی جلد سیاہی مائل اور کھُردری ہو جاتی ہے اور فرقِ مبارک کی خودرَو کھیتی "بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے" کے ثبوت میں' دو تہائی کے قریب تخم سوختہ ہو جاتی ہے! لباس کے تحت میں، توند پر تنگ ہو جانیوالے کوٹ سے لیکر غرارہ دار پتلون تک اُس کا وجود، الناس باللباس کی زندہ تردید نظر آتا ہے! تخمی مہا دیو اپنی شان کو دیگر حیواناتِ ناطق سے گزوں اونچا سمجھنے میں قلمی مہا دیو سے کسی قدر کم ہو لیکن رعب و داب کے اظہار میں دونوں یکساں طور پر غرفش کا گرامو فون۔یا۔اکرفوں کا میگزین ہوتے ہیں اور دونوں فی الحقیقت کمزور اور ماتحت افراد پر اُٹھتے بیٹھتے گولہ باری کرنے کے اعتبار سے کسی طرح دولہا جو کی بیوی یا سوداگر کے گھوڑے سے کم نہیں اُچھلتے! یوں تو ہر ضلع میں مہا دیو اور تعزیری دیوتا کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے مگر سودیشی مہادیو کے لیے اکثر و بیشتر تعزیری دیوتا آنکھ اور زبان کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے! یہ اگر دیکھتا ہے تو اُسی کی آنکھ سے اور بولتا ہے تو اُسی کی زبان سے! خوبیِ قسمت سے اگر مہادیو اور تعزیری دیوتا دونوں تخمی ہوے تو "کریلا اور نیم چڑھا" کا لطف آجاتا ہے؛

ایسی صورت میں اِن دونوں میں وہی نسبت پیدا ہو جاتی ہے جو پیاٹک اور ریچھ میں۔ یا۔ چچا اور بھتیجے میں ہوتی ہے! پھر ایسے سوراج کے دَور میں ہر حکم اور ہر جملہ دونوں زبانوں کے عمل ورد عمل سے وجود میں آتا ہے۔ گویا۔ فعل فاعل سے مل کر جملۂ فعلیہ مُکلیہ بنتا ہے!

تخمی مہادیو کی بعض عادات کی بناء اُسکی اپنی اصل وطبقۂ معاشرت پر ہوتی ہے۔ مثلاً اُسکے شجرۂ آبائی میں اگر کہیں حجّام یا ڈاکیہ کا نام آتا ہے تو یقیناً اُسکو اپنے ہاتھ سے اپنی اور دوسروں کی حجامت بنانے میں۔ یا۔ زبانی گفتگو سے زیادہ ڈاک کی تحریر پر اعتبار کرنے میں پوری مہارت ہوگی! فرض کیجئے کہ وہ نادار والدین کے اتصال کا ثمر۔ یا۔ تعلیمی حیثیت سے، کسی مسٹر وہائٹ یا مسٹر براؤن کے فیضِ امرد نوازی کا نتیجہ ہو تو جُزرسی اس سے کبھی نظر انداز نہ ہوگی اور وہ اپنی پارٹی جی تک کو مصر کھ نہانے کے لیے تیسرے درجہ سے زیادہ میں نہیں بھیج سکتا۔ بلکہ بھولے چُوکے اگر پارٹی جی اور اُنکی ذرّیات ڈیوڑھے میں سفر کر جائیں تو وہ یقیناً اس فضول خرچی کو ہمراہیوں اور اَردلی کی غفلت سمجھ کر اُنکی جیب سے وصول کرلیگا! لیکن اس سے یہ نہ سمجھیے کہ وہ بے ایمانی پر مائل ہوتا ہے۔ حاشا وکلّا، بے ایمانی سے اور تخمی مہادیو سے باپ مارے کا بَیر ہے: وہ اس درجہ معاملہ کا صاف ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنے اردلی کے رعایتی داموں پر لیے ہوئے آم اگر اُسکی نظر چڑھ جائیں تو وہ فوراً تہائی دام نقد ادا کرنے پر تہائی کا شریک غالب بنجاتا ہے اور عملی طور پر "آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام" ثابت کر دکھاتا ہے!

خشک مزاجی اور مذاق سے تنفر، تخمی مہادیو کی خصوصیات سمجھی جا سکتی ہیں! وہ اپنے آپ کو اس درجہ لیے دیے رہتا ہے کہ محض اتفاقاتِ زمانہ سے پیدا ہو جانے والے شگفتہ واقعات بھی اُس سے برداشت نہیں ہو سکتے! فرض کیجیے۔ ایک بھاری بھرکم مخطوب ہستی جو گاہے ماہے، پوری احتیاطِ رازداری کے ساتھ، محض تبدیل صحبت کے لحاظ سے، نت نئے لطفِ صحبت اُٹھانے پر عامل ہو، ایک مرتبہ اپنے مطلوب عارضی کو طلبی کا فرمان بھیجنے کے ساتھ ہی کچھ مزہ دار باتیں۔ جن میں دنولیا سوپ سے نہانے سے لیکر کیش رنجن تیل سر میں ڈالنے تک، مختلف ہدایات درج ہوں۔ لکھے اور یہ تحریر کرشمہ سازیِ تقدیر کے بدولت بجائے مطلوب دلنواز کے تخمی مہادیو کے پاس پونہچ جائے تو یقیناً ایسے پُرلطف اتفاق کا نتیجہ شگفتگیِ طبع کے عوض پژمردگیِ خاطر ہوگا اور تخمی مہادیو کا گول چہرہ تکدّر و تنفر سے بالکل ایسا ہو جائیگا جیسا گولا بھدئیاں (آم) پختہ ہونے پر ہو جاتا ہے! وہ اس اتفاقی لطف کو اِرادی گستاخی تصور کریگا اور اُس بھاری بھرکم شخصیت کو کسی نہ کسی

داخلی یا خارجی سزا دینے کی ٹھان لیگا - اب اگر اُسکو چشم نمائی کا موقع ہاتھ نہ آیا - یا - اس قدر ہمت نہ ہوسکی تو وہ - اور کچھ نہیں تو - کسی داخلخارج کی اپیل میں عین ایمان داری کے ساتھ اُس گستاخ شخصیت کو محض تادیب کی خاطر اپنے قلم کی کُند چھُری سے ایسا حلال کریگا کہ بایدوشاید! ماننا پڑتا ہے کہ "شیطاں بھی اماں مانگتا ہے اِنکے عمل سے + کیا حضرت آدم کی بھی اولاد غضب ہے" !

اس میں شک نہیں کہ بدیشی افراد ازسرتاپا مجمعِ کمالات ہوتے ہیں لیکن سودیشی ہستیاں بھی آٹھوں گانٹھ کُمیت ہونے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتیں :

مانا کہ بدیشی کا عمل نقص سے لبریز! پر جنس سودیشی کی بھی روداد غضب ہے!!

جسمانی خوبیوں سے لیکر دماغی قابلیت تک تھمی مہادیو اکثروبیشتر اپنی نظیر آپ ہی ہوتا ہے ! یہ عبارت آرائی نہیں، واقعہ ہے کہ بعض اوقات تھمی مہادیو کی ایسی ذہین، سریع الاحساس، معاملہ فہم، لیاقت بنیاد اور ذکاوت لب ریز مثال مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہے کہ بے ساختہ مرزا مرحوم کا وہ قطعہ یاد آجاتا ہے جس کے آخری اشعار یہ ہیں :

ہیچو تو ناقابلے در صُلبِ آدم دیدہ بود   زاں سبب ابلیس ملعون سجدہ بر آدم نہ کرد!

حاش للہ! بودنت در صُلبِ آدم تہمت است   پیشِ ہرکس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نہ کرد!!

"ریفائیل"

نرگس اور مَیں

اے نرگس کے پھول - تیری چند لمحہ کی زندگی سے میں اشک بداماں ہوں، تو اسقدر جلد مُرجھا جاتا ہے کہ سورج نصف النہار تک نہیں پہنچنے پاتا - آہ - ٹھہر-ٹھہر جبتک کہ جلد ختم ہونے والا دن آخر نہ ہو جائے - پھر رات کی عبادت کے بعد میں بھی تیرے ہمراہ چلوں گا - میری زندگی بھی مثل تیرے چند لمحوں کی ہے - میری بہار تیری بہار کی طرح مختصر ہے - میری بالیدگی اسی طرح جلد خزاں قبول کرنیوالی ہے جیسے تیری - میری موت تیرے شاداب گھنٹوں کے مانند ہے جو اس طرح خشک ہو جاتے ہیں جس طرح موسم گرما میں بارش یا صبح کی شبنم کے گوہر نما قطرے - زمیدیقی،

سیر انصار

(مؤلفۂ[1] مولوی سعید انصاری سابق رفیق دار المصنفین، اعظم گڈھ)

(۱)

حجاز کا ریگستانی ملک ہے اور ساتویں صدی عیسوی کا ابتدائی حصہ - حج کا موسم ہے، مختلف قبائل کے افراد اپنی قدیم روایات کے مطابق معبدِ ابراہیمی کی پرستش کو آئے ہوئے ہیں۔ خیموں ڈیروں کا جنگل اور مذہبی میلہ کی ہر طرف دھوم دھام ہے - اس مجمع عام میں خدا کا ایک برگزیدہ بندہ خلق اللہ کو کلمۃ الحق سناتا ہے، کوئی سماعت نہیں کرتا - اصنام پرستی سے منع کرتا ہے، کوئی مانتا نہیں - افعال قبیحہ سے روکتا ہے کوئی باز آتا نہیں - اسی پر بس نہیں، بلکہ اُسکے وعظ و تلقین، پند و نصائح کا اینٹ پتھر سے جواب دیا جاتا ہے - تمام ملک میں ایک چپہ بھر بھی ایسی زمین نہیں جہاں اس واجب التعظیم مقدس مصلح قوم کو امن مل سکے ——— جنگل میں چرند، ہوا میں پرند، سمندر میں مچھلیاں اور شہر میں قزاق، راہزن، بدکار آرام و اطمینان سے رہ سکتے ہیں لیکن تکلیف ہے تو محض "ذات مقدس" کے لیے، جو ملاہی و مناہی سے منع کرتا ہے - خالق اکبر کی بارگاہ کی دعوت دیتا ہے، گمراہی و ضلالت کے قعر مذلت سے نکال کر راہِ حق کی رہبری و ہدایت کرنا چاہتا ہے!!!

اِدھر بے کسی و بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ابنائے وطن میں کوئی یار و مددگار نہیں - اُدھر سروش غیبی بہ زبانِ حال یہ کہہ رہا ہے کہ اے شاہوں کے شاہ، ان تکالیف عارضی سے آزردہ نہ ہوجیے - یہی اہل عرب جو آج نافرمان اور آپ کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، کل پروانہ وار شمع رسالت پر نثار ہوں گے - اپنی عزیز جانوں کو آپ کے اشارے پر قربان کرنا سعادتِ ابدی سمجھیں گے اور افعال ماضیہ پر شرمسار ہو کر بندۂ بے درم بنجائیں گے!!!

(ii)

مقدس ناصح کریم کارساز کی بارگاہ کی جانب عوام کو بلاتا ہے - ناقابل برداشت مصائب

[1] قیمت ہے - صفحات ۲۶۲ مع ٹائٹل پیج - لکھائی چھپائی دیدہ زیب - ملنے کا پتہ: دار المصنفین اعظم گڈھ - یو پی -

کا سامنا نہایت کشادہ پیشانی سے کرتا اور اپنی تکالیف سے عاجز آکر امم سابقہ کی طرح بددعا کے لیے جناب احدیت میں ہاتھ نہیں اُٹھاتا، بلکہ بار بار یہی عرض کرتا ہے کہ اے خالق ارض وسما میرے ہم وطنوں کو ہدایت کیجیے وہ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں۔

بالآخر اپنے اہل ملک سے مایوس ہوکر اُن پردیسیوں اور اجنبیوں کی ہدایت کے لیے تیار ہوتا ہے جو دور دراز مقامات سے معبد خلیلی کی پرستش یا مذہبی میلہ کی شان کو دوبالا کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ میثاقِ ربانی کے ایفا کا وقت قریب آتا ہے، قدسیت کفر پر غالب ہوتی ہے، نافرمانی وجہالت کے بادل چھنٹ جاتے ہیں اور زائرین میں سے منتخب نفوس قدسیہ جو خلیل بُت شکن کے معبد میں آذر بت تراش کی قدیم رسم پرستش کو زندہ کرنے کے لیے حاضر ہوئے تھے وہ اپنی آنکھوں کو برق ایمانی سے خیرہ پاکر گلزار خلیلی کے خالق کے حضور میں سربسجود ہوتے ہیں اور اس ناصح مشفق کی صوتِ روح افزا پر لبیک کہکر حمایت کا وعدہ کرتے ہیں۔

یہ قابلِ ستائش نفوس چشمۂ توحید سے سیراب ہوکر وطن جاتے ہیں اور اپنے کہربائی اثر سے اُس ملک میں جہاں موسیِ عمران اور مسیح ناصری کا فانوس ہدایت باوجود سالہا سال کی جدوجہد کے کفر وضلالت کی باد صرصر سے بار بار بجھ چکا تھا گیارگی نور ایمان کی معجز نما شمعیں روشن کر دیتے ہیں۔ قبائل کے قبائل صحیفۂ اخلاق کا درس ان مبلغین سے حاصل کرکے اپنے اُستاذ المدارین کی بارگاہ میں زانوے ادب تہ کرنے کے شرف کو طرۂ امتیاز سمجھ کر دوسرے سال پھر حج کو آتے ہیں اور اس واجب الحترام ہستی کے حضور میں شرفِ باریابی پاتے ہیں۔

(iii)

جب شب کا ثلث حصہ گذر جاتا ہے تو پردیسیوں کا گروہ عقبہ کی گھاٹی میں ایک درخت کے سائے میں جمع ہوتا ہے۔ ایک مقدس بزرگ مع ایک عزیز کے تشریف لاتا ہے اور تعارف کے بعد بزرگ معظم کا ہمراہی حسب ذیل گفتگو شروع کرتا ہے:-

"تم کو معلوم ہے یہ عالی مرتبت بزرگ ہم میں جس درجہ کے آدمی ہیں۔ اُنکی حفاظت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے اگر تم اپنے وعدوں پر قائم رہ سکتے ہو تو بہت بہتر ورنہ ابھی صاف صاف کہدو اگر تمھارا چھوڑ دینے کا ارادہ ہو تو بتلا دو......"

"داعیِ معظم" تکلم کا آغاز حضرت خالقِ دوجہاں کے کلام سے فرماتا ہے اور راہ مستقیم کی تعلیم کے بعد ارشاد کرتا ہے کہ "میں اس شرط پر بیعت لیتا ہوں کہ میری حفاظت اپنی جانوں کے برابر کروگے...."

رئیس قوم واجب التوصیف ہستی کا ہاتھ تھام کر عرض کرتا ہے کہ
"بیشک ہم اُسی طرح حفاظت کریں گے۔ آپ ہم سے بیعت لیں ہم نسلاً بعد نسلٍ سپہگرد جنگجو واقع ہوئے ہیں۔..........."
ایک دوسرا امیرِ قبیلہ کہتا ہے کہ
"..... اے معلم مشفق ہم یہودیوں کے ہم عہد ہیں اور اب اُن تعلقات کو منقطع کر دیں گے اس بنا، پر اگر آپ غلبہ پائیں تو کیا ہم کو چھوڑ کر اپنی قوم میں جا ملیں گے ...."
مبلغِ توحید کے لب مبارک پر تبسم نمودار ہوکر ارشاد ہوتا ہے:
"... میرا خون تمھارا خون، میرا ذمہ تمھارا ذمہ ہے۔ میں تم سے ہوں تم مجھ سے۔ تم جس سے لڑوگے میں بھی اُس سے لڑوں گا جس سے تم صلح کروگے میں بھی صلح کروں گا......"
واجب التقدیس بزرگ کا ہمراہی کہتا ہے کہ
"...... اے اہلِ جماعت تم کو خبر ہے کہ تم ان سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ تم ان سے عرب وعجم کی جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ خوب سمجھ لو اس بیعت میں تمھاری جانیں ضائع ہونگی، شرفا قتل ہونگے۔ اگر اُس حالت میں تم نے انکو چھوڑا تو قسم ہے اُس خدا کی کہ اس میں دین و دنیا دونوں میں تمھاری رُسوائی ہے اور اگر تم وعدہ پر قائم رہے اور وعدہ کو پورا کیا تو یہ بات دین و دنیا دونوں میں باعث سرخروئی ہے اور اس سرخروئی کو تم حاصل کر سکتے ہو......."
رئیس قوم نے عرض کیا کہ
"اے ہادیِ برحق ہمکو حکم دیجیے کہ کیا کریں؟ اپنے رب کے لیے جو شے چاہے طلب کیجیے اور اپنے اصحاب کے لیے جو پسند ہو ارشاد فرمائیے اور ہمکو بتلائیے کہ اسکا معاوضہ کیا ملے گا؟"
نہایت مختصر و موثر الفاظ میں ارشاد ہوتا ہے:-
"..... تم سے خدا کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ اُسکی عبادت کرو، اُسکا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ اور اپنے اور اپنے اصحاب کے لیے کہتا ہوں کہ ہمکو پناہ دو اور مدد کرو، اور جس طرح اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری بھی کرو......."
یہ فصیح و بلیغ خطبہ سنکر جماعت دریافت کرتی ہے کہ "اگر ہم یہ تمام باتیں کریں تو خالق دوجہان کی سرکار سے کیا اجر ملے گا؟" جواب ملتا ہے "جنت"۔ جماعت عرض کرتی ہے کہ "جو کچھ ارشاد ہوا

ہم تیار ہیں اور راضی ہیں"۔

جاننا چاہیے کہ یہ مصلح اعظم ہمارے آقائے محترم سرکار دو عالم حضور سرور کائنات مفخر موجودات پیمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اور ہمراہی جناب عباسؓ عم حضور سرور کائنات صلعم کی ذات والا صفات تھی۔ اور جماعت جس نے سرکار دو عالم صلعم کا ساتھ اُسوقت دیا جب تمام ملک آپ کا دشمن تھا، انصارِ مدینہ تھے

(نظارہ)

اب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ ہو۔

"...... جمعہ کا دن ہے۔ موکب رسالت قبا سے روانہ ہو رہا ہے۔ شہر یثرب کے در و دیوار طلعت اقدس سے جگمگا اُٹھے ہیں۔ اللہ اکبر! مدینہ منورہ کی تاریخ میں کتنا مبارک دن ہے۔ انصار کے تمام قبیلے شہنشاہ رسالت کے انتظار میں ہتھیاروں سے آراستہ دو رویہ صف بستہ ہیں۔ رؤسا اپنے محلوں میں قرینہ قرینہ سے ایستادہ ہیں۔ پردہ نشیں خواتین گھر سے باہر نکل آئی ہیں۔ مدینہ کے حبشی غلام جوش مسرت میں اپنے اپنے فوجی کرتب دکھا رہے ہیں۔ اور خاندان نجار کی لڑکیاں دف بجا بجا کر "طلع البدر" کا ترانۂ خیر مقدم گا رہی ہیں۔ غرض اس شان و شکوہ سے آنحضرتؐ کا داخلہ ہوتا ہے کہ وداع کی گھاٹیاں مسرت کے ترانوں سے گونج اُٹھی ہیں اور مدینہ کے روزن ہائے دیوار اپنی آنکھوں سے وہ دیکھتے ہیں جو کبھی نہ دیکھا تھا ...."

"..... ہر شخص منتظر ہے کہ دیکھیے میزبانِ دو عالم کی مہمانی کا شرف کس کو حاصل ہوتا ہے۔ رؤسائے شہر اَہلاً و سہلاً کہتے ہیں اور اپنی اپنی اقامت گاہیں پیش کرتے ہیں۔ متعدد رئیس قوم آتے ہیں اور اس نعمت عظمیٰ کو اپنے گھر میں اُتارنا چاہتے ہیں لیکن کارکنان قضا و قدر نے اس شرف کے لیے جس گھر کو منتخب کیا ہے وہ حضرت ایوبؓ کا کاشانہ ہے' اس لیے جو شخص مکان پیش کرتا ہے اور حضور سرور عالمؐ کے ناقہ مبارک کی مُہار تھامتا ہے ارشاد ہوتا ہے".... میرے ناقہ کو چھوڑ دو یہ حکم کی پابند ہے"۔

(اے کاش اُس ناقہ مبارک کے قدموں کی خاک راقم سیہ کار کی آنکھوں کا سُرمہ ہوتی۔

تو خاک اپنے قدم کی دے نکر محتاج کُندن کا کسے ملتی ہے یہ دولت میں اس اکسیر کے قرباں)

آخر نزلے وحی منزل اقامت متعین کرتی ہے اور محمل مبارک جس گھر کے سامنے دَم لیتا ہے وہ خوش قسمتی سے عشرتکدۂ ایوب ہے۔ حضرت ایوب آتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں "جاں نثار کا

یہ مکان ہے اور وہ دروازہ ہے " حریم رسالت سے اجازت ملتی ہے ؎

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

(۸)

"..... حضور سرور کائنات صلعم ابو ایوبؓ کے گھر میں تقریباً چھ ماہ تک فروکش رہتے ہیں۔ اس عرصہ میں حضرت ایوب نہایت عقیدتمندانہ جوش کے ساتھ آپ کی میزبانی کا حق بجا لاتے ہیں۔ اُنکے مکان کے بالائی اور زیریں دو حصے ہیں۔ وہ اوپر کا حصہ آنحضرت صلعم کے لیے مخصوص کردیتے ہیں مگر آپ اپنی زائرین کی آسانی کی غرض سے نیچے کا حصہ پسند فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ اتفاق سے کوٹھے پر پانی کا گھڑا ٹوٹ جاتا ہے، چھت معمولی ہے، ڈر ہے کہ پانی نیچے ٹپکے، اور مبادا حضور سرور عالمؐ کو تکلیف ہو، گھر میں میاں بیوی کے اوڑھنے کو ایک ہی لحاف ہے، لحاف پانی پر ڈالدیتے ہیں کہ پانی جذب ہو جائے۔ اگرچہ یہ تکلیف ان میزبانوں کے لیے کوئی بڑی زحمت نہیں ہے کیونکہ اسلام کی خاطر اس سے بھی بڑی بڑی اور شدید تکالیف کا وہ ارادہ کرچکے ہیں تاہم یہ خیال کہ وہ اوپر اور خود حامل وحی نیچے، ایسا سوہانِ روح ہے جو میاں بیوی کو شب بھر بیدار رکھتاہے، دونوں سوء ادب کے خوف سے چھت کے کونوں پر بیٹھ کر رات بسر کرتے ہیں۔ علی الصباح حضرت ابو ایوب حضور سرور کائنات کی خدمت میں حاضر ہوکر واقعۂ شب عرض کرتے ہیں اور ملتجی ہوتے ہیں کہ حضور اوپر آرام فرمائیں جان نثار نیچے رہیں گے..... " آنحضرت صلعم درخواست منظور فرماتے ہیں "

(۱۸)

تیسرا مرقع ملاحظہ ہو

"...... حضور سرور کائنات صلعم حضرت انسؓ کے دولتکدہ پر تشریف رکھتے ہیں۔ انصار و مہاجرین کی جماعت ۹۰ کی تعداد میں حاضر ہے اور آج ان پردیسیوں اور اجنبیوں میں رشتۂ الفت قائم کیا جاتا ہے اور محبت و شفقت کے بیج وہ یا خوشبودار پھول حکم رسولؐ سے سلکِ اخوۃ میں پر وئے جاتے ہیں یعنی انصار و مہاجرین بھائی بھائی بنائے جاتے ہیں۔

.... عام انصار کے ساتھ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے مواخاۃ کا عجیب وغریب منظر پیش کیا۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اُنکے اسلامی بھائی بنائے گئے تو انھوں نے درخواست کی کہ میرا آدھا مال لے لیں، اور دو بیویوں میں ایک بیوی بھی منتخب کرلیں۔ حضرت عبد الرحمٰن نے جب یہ الفاظ سُنے تو اُنکے لیے خیر و برکت کی دعا کی ...."

(۱۱ ۸)

ایک دوسرا جلوہ ملاحظہ ہو

احوال حضرت ابو درداءؓ

''...... دمشق میں انکا وقت زیادہ تر درس وتدریس، احکام شریعت کی تلقین اور عبادت وریاضت میں گذرتا تھا۔ صحابہ کرام میں اکثر ایسے تھے جنکی زاہدانہ اور سادہ زندگی پر شام کی خصوصیات وتکلفات کا رنگ و روغن چڑھ گیا تھا لیکن آپ اپنی اصلی بے تکلفی وسادگی پر قائم تھے۔ حضرت عمرؓ نے شام کا سفر کیا ...... سب صحابیوں کے مکانوں پر جاکر ملاقات کی تو سب کے شاہانہ ٹھاٹھ دیکھے۔ ...... آپ کے گھر پہونچے تو یہاں لاؤلشکر، خدم وحشم، نقیب وچاؤش، تزک واحتشام، زینت وآرائش ایک طرف، مکان میں چراغ تک نہ تھا۔ کشور دین وملت کا تاجدار تاریک مکان میں ایک کمبل اوڑھے پڑا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ پوچھا اس قدر عسرت سے زندگی بسر کرنے کا کیا سبب ہے؟ حضرتؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ ''دنیا میں ہمکو اتنا سازوسامان رکھنا چاہیے جس قدر ایک مسافر کے لیے درکار ہے۔ آہ! آنحضرت صلعم کے بعد ہم لوگ کیا سے کیا ہوگئے''۔ اس فقرہ نے یہ عالم کردیا کہ دونوں حضرات نے روتے روتے صبح کردی۔''

(۱۱۱ ۸)

ہندوستان میں سخت ضرورت تھی کہ اس وفادار گروہ کی نیاز مندیاں ملکی زبان میں لکھی جائیں جسکو زمانۂ حال کے تعلیم یافتہ نوجوان اپنے لیے شمع ہدایت بناتے اور معترضین کو معلوم ہوتا کہ اساس اسلام محض عمل اور اخلاق پر قائم ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ دار المصنفین اعظمگڈھ نے قوم کی اس ضرورت کو محسوس کرکے ان بزرگان دین کی سوانح عمریوں کی طرف توجہ کی اور انکے احوال میں ایک ضخیم کتاب ''سیر الانصار'' مرتب کی جسکا پہلا حصہ شایع کیا ہے۔ اسی کتاب کے اقتباسات خفیف تغیر و تبدل سے اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ فاضل مولف جنابؐ مولوی سعید انصاری حقیقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ گراں بہا تالیف مرتب کرکے امت مرحومہ پر احسان اور ادب اردو میں بیش بہا اضافہ کیا۔ حصۂ اول میں محض انھیں انصار کرام کے قابل تقلید سوانح لکھے گئے ہیں جنکے اسماے گرامی باعتبار حروف تہجی الف سے ز تک ہیں اور بقیہ حضرات کے سوانح حصہ دوم میں شایع کرنے کا وعدہ ہے[ف] یہ مجموعہ انصار کرام کے سوانح اور انکے علمی، مذہبی، اخلاقی وسیاسی کارناموں کا ایک بہترین مرقع ہے۔ واقعات کتب احادیث اور سیر ورجال کی مستند کتب سے سیکڑوں ہزاروں

ف حصہ دوم بھی اب شایع ہوگیا ہے۔ قیمت عہ (ایڈیٹر)

صفحات کی ورق گردانی کا بہترین نتیجہ ہیں۔ آغاز کتاب میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں انصار کی قبل از اسلام کی مفصل تاریخ ہے۔ اُنکے نسب نامے، اور معاشرتی و اخلاقی، سیاسی، روحانی و ذہنی ترقیات کی جیتی جاگتی تصویر ایک خاص پیرایہ میں کھینچی گئی ہے۔ مضامین میں تسلسل قائم ہے حضور سرکار دو عالم صلعم کا جب ذکر مبارک مؤلف کرتے ہیں تو ایک ایک لفظ سے عقیدت و احترام ٹپکتا ہے۔ زبان میں شیرینی اور ادبی چاشنی ہر جگہ نمایاں ہے۔ جس ادیبانہ و انشاپردازانہ عبارت میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اُسکا اندازہ اقتباسات ذیل سے ہوگا۔

(ی أ)

(ا) احوال حضرت انس

"...... ۱۰ سال کی عمر ہوگی کہ وہ یوم مسعود آیا جسکے انتظار میں اہل یثرب نے مہینوں راتیں کاٹی ہیں یعنی رسول اللہ صلعم یثرب تشریف لائے اور شہر یثرب کو مدینۃ النبی ہونے کا شرف عطا ہوا۔ حضرت انس اسوقت گو صغیر السن تھے لیکن پُرجوش .... جس ساعت سعید میں مدینۂ طیبہ کا افق آفتاب نبوت کی نورانی شعاعوں سے منور ہو رہا تھا۔ حضرت انس اور بہت سے کمسن لڑکے "جاء رسول اللہ" "جاء رسول اللہ" کا مژدۂ جاں بخش اہل یثرب کو سُنا رہے تھے اور نہایت جوش میں خوشی خوشی شہر کا گشت لگا رہے تھے۔ جب "جاء محمد" کی آواز کان میں آتی مڑ کر دیکھتے کہ شاید کاروانِ قدس منزل مقصود پر خیمہ زن ہوا ہے لیکن گرد کاروان کے سوا کچھ نظر نہ آتا ......
اتنے میں گرد ہٹی اور نہایت شوکت و شان سے کوکبۂ نبوت نمودار ہوا۔ حضرت انس کی عقیدت مند نگاہ رُخِ انور پر پڑی اور تصدیق قلبی اور اقرار لسانی نے صحابیت کا ممتاز شرف بارگاہ نبوت سے حاصل کیا .... (ص ۱۱۱)

(ی)

(ب) حضرت خبیبؓ بن عدی کی شہادت:-

"....... آہ یہ کیسا عجیب منظر تھا۔ اسلام کے ایک غریب الوطن فرزند پر غربت میں کیسے ظلم و ستم ہو رہے ہیں۔ بطحاے کفر کا خونی قاتل توحید کو کس طرح ذبح کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن مجسمۂ اسلام اب بھی پیکر رضا و صبر بنا ہوا تھا۔ مسیح ناصری سے اس فرزند توحید کا مقابلہ کرو تو اسلام و نصرانیت کی اخلاقی تعلیم پر صاف روشنی پڑ گی وہاں زبان پر تھا "خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" اور یہاں خدا کی رضا جوئی میں اطمینان و مسرت کا اظہار تھا......."

(ii)

"...... حضور سرور کائنات کو اس فاجعۂ عظمیٰ کی خبر وحی کے ذریعہ سے ہوئی فرمایا اے خبیب تجھ پر سلام !! ...... اس "شہید وفا" کی لاش کا پتہ لگانے کے لیے عمرو بن اُمیہ کو بھیجے گئے ...... عمرو رات کو سولی کے پاس ڈرتے ڈرتے گئے اور درخت پر جا کر رسی کاٹی۔ جسد اطہر ...... زمین پر گرا، چاہا کہ اُٹھا لیں لیکن یہ جسم زمین کے قابل نہ تھا فرشتوں نے اُٹھا کر اُسی مقام پر پہونچا دیا جہاں شہیدانِ راہِ خدا کی روحیں رہتی ہیں۔ عمرو بن اُمیہ کو سخت حیرت ہوئی۔ بولے کیا زمین تو نہیں نگل گئی !! جو لوگ اس قتل میں شریک تھے نہایت بیکسی و بے بسی کی حالت میں مارے گئے۔ ......

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را   چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

(iii)

(ج) عشقِ رسولؐ

"...... ایامِ شباب میں ان (حضرت انسؓ) کی محبت کی کوئی حد نہ تھی ...... وہ شمعِ نبوت پر پروانہ وار شیفتہ تھے ...... ایک نگاہ کرم ...... باعثِ صد طمانیت و تسلی تھی۔ آقائے نامدار کی ایک آواز اُنکے قالبِ عقیدت میں نئی روح پھونکنے کا سبب بنتی تھی ...... "حضور سرورِ عالم" ...... کے وصال کے بعد اگرچہ ظاہری آنکھیں دیدارِ محبوب کو ترس گئی تھیں لیکن محبت کی معنوی آنکھوں پر بابِ فیض اب تک بند نہ تھا ...... کُشتۂ عشقِ نبوت ...... خواب میں زیارت سے مشرف ہوتا تھا ...... صبح کو واقعات شبینہ کی یاد تازہ کرکے گریۂ وزاری ...... کیا کرتے تھے ...... عاشقِ صادق ...... کے تلملانے کے لیے ...... ایک ایک چیز نشتر کا کام کرتی تھی ...... تاجدارِ مدینہ کا ذکر کرتے تھے فرطِ محبت سے بیقرار ہو جاتے تھے ...... ہر مجلس ...... حضور سرکارِ دو عالم کے ذکرِ خیر سے لبریز ہوتی ...... عہدِ نبوت کے واقعات اپنے تلامذہ کے گوش گزار کیا کرتے تھے ...... اثنائے ذکر میں دل میں ایک ٹیس اُٹھتی ...... بیچین ہو جاتے۔ لیکن یہ درد وہ درد تھا جس پر ہزار ہا درد قرباں ہیں !! جس کا علاج طبیبوں کے ...... قبضۂ قدرت سے باہر تھا ...... "ص ۱۲۰

(iiii)

اقتباسات کہاں تک درج کیے جائیں، ہر صفحہ پر رنگینیٔ عبارت اور فاضل مولف کی تحقیق و تدقیق کا و شوں کا بیش بہا نمونہ موجود ہے۔ تحقیقاتِ علمی کا میدان کتاب کا وہ حصہ ہے جس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انصار قریش ہیں اور نابت[1] کی اولاد ہیں۔ گو یہ بحث زیادہ دلچسپ

---

[1] نابت اولاد اسمٰعیل علیہ السلام۔

نہیں لیکن طلبا کے لیے نہایت مفید ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے دینیات کے نصاب میں شامل کردی جائے ......

طبع ثانی کے وقت اگر امور ذیل کا لحاظ رکھا جائے تو کتاب کی خوبی دوبالا ہوجائیگی

(ا) صفحہ ۹۷ پر عبارت ذیل درج ہے

آخر وہ وقت آیا کہ اسلام کا خدائے قدوس اپنے پورے جاہ وجلال اور اُسکی آتشیں شریعت اپنی پوری آب وتاب سے نمایاں ہو۔ ......" (ص ۹۷)

مذہب اسلام کو شریعتِ آتشیں سے کیا تعلق ہے۔ مزید تشریح کی ضرورت ہے ورنہ الفاظ کی اصلاح کیجائے

(ب) اس قسم کے فقروں سے احتیاط کی ضرورت ہے

(i) تمھاری ہجرت گاہ خواب میں دیکھا (ص ۹۸)

(ii) کارکنانِ قضا وقدر نے جس گھر کو تاکا تھا (ص ۲۲)

(iii) ازار کھسک گیا (ص ۱۱۳)

(ج) اب موجودہ نسل زبان عربی سے قطعاً اور فارسی سے نسبتاً بے بہرہ ہے اور ہوتی جاتی ہے اسلیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولف کل اشعار عربی، ابیات فارسی، نصوص قرآنی وغیرہ کا اُردو ترجمہ بھی شامل کردیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر جناب سعید انصاری کو اُنکی اس "اختراع فائقہ" پر جو ہر طرح قابل ستائش ہے سچی مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہر مسلمان بھائی کے گھر میں اس مفید کتاب کی ایک جلد ضرور ہوگی۔

مشیر احمد علوی۔ متعلم بی اے کلاس مسلم یونیورسٹی (علیگڈھ)

غزل

کہنے کو آپ کہیے اک کھیل عشقبازی — اس میں ہے دلفگاری اس میں ہے جانگدازی

میں نے کہاں سے سیکھا جز نیازمندی — تم نے کہاں سے پائی یہ شانِ بے نیازی

آنکھوں میں آگئے ہیں کمبخت اشک خونیں — کس طرح اب چھپاؤں میں رنگ دلگدازی

میری نیازمندی کیا نازآفریں ہے — تم کو سکھا رہی ہے انداز بے نیازی

سجدہ بتوں کو کرنا اب تک تمھیں نہ آیا — مانا کہ شیخ صاحب تم ہو بڑے نمازی

اس عشق طرفہ تر کو اے شیخ کیا کہیں گے — جب سوز ہو حقیقی اور ساز ہو مجازی

ہم نے اجل کی بابت اکثر سنا ہے باسط — بیمار غم کی آکر کرتی ہے چارہ سازی

رباعیاتِ رواں

ہر ناز ترا نیاز سے بالا ہے — یہ راز اخفائے راز سے بالا ہے
انساں معذور فکرِ انساں معذور — نغمہ آواز ساز سے بالا ہے

مذہب ناز و نیاز سے بالا ہے — ایماں سوز و گداز سے بالا ہے
تو کیا ہے تر انظامِ ہستی کیا ہے؟ — یہ راز کشودِ راز سے بالا ہے

دُنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے — سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکر فنا نے کھولدی ہیں آنکھیں — کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

یہ روح نہ بندِ غم سے آزاد ہوئی — دم بھر بھی نہ طبع مضمحل شاد ہوئی
خالی نہ رہی ہمارے دل کی بستی — اُمید گئی تو یاس آباد ہوئی

شیریں نغموں سے آشنا ہیں لب و گوش — تفریحِ حواس سے ہے دل بھی مدہوش
اے مایۂ حسن پھر سنا دے مجھکو — چشمِ گویا کی اک نوائے خاموش!

اے وعدۂ وصل کرکے جانے والے — دامن مرے ہاتھ سے چھڑانے والے
اس طرح نہ توڑ شیشۂ نازکِ دل — اے چاکِ جگر پہ مسکرانے والے

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے؟ — نِٹلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے؟
اس سوچ میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواں — یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے؟

رواں (ایم اے)

نظرے خوش گزرے

یہ پرچہ بہت تاخیر کے بعد شایع ہو رہا ہے۔ باعث تاخیر یہ ہوا کہ جب رسالہ کی کتابت قریب قریب ختم ہو گئی اور نصف حصہ چھپ چکا، تو گاسے کے گوشت والے مضمون کی دو کاپیاں مع سنسکرت کے حوالہ جات کی اصل کے اتفاقاً تلف ہو گئیں صاحب مضمون کو حیدرآباد خط لکھا گیا تو وہاں سے حوالے دوبارہ نقل ہو کر آئے۔ اس اثنا میں مسلۂ حجاز کے متعلق لکھنؤ میں ایک جلسہ کے انتظامات میرے سپرد کر دیے گئے اور کئی ہفتے تک میں اپنے ذاتی کاموں پر کافی توجہ نہ کر سکا۔

الناظر کے موجودہ دور میں بار بار ایسے اتفاقات پیش آتے رہے ہیں کہ رسالہ کو وقت پر شایع کرنے کی اُمید میں دو دو پرچے ساتھ نکالے گئے۔ اب اتنی تاخیر ہو گئی ہے کہ شاید دو مہینے کے بجائے پوری سہ ماہی کا ایک نمبر شایع کرنا پڑے۔

جولائی کے پرچے میں دوسرے انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور مقابلہ میں شرکت کرنے والے اصحاب کے لیے ۱۵۔ نومبر تک کی میعاد رکھی گئی تھی۔ مختلف ذرائع سے جو خبریں موصول ہوئیں اُن سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس دفعہ بہت سے اصحاب اس مقابلہ میں شریک ہوں گے۔ مگر اب تک صرف دو صاحبوں کے مضامین وصول ہوے ہیں۔ چونکہ میری دلی تمنا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اہل قلم اس ادبی مقابلہ میں شریک ہوں۔ اس لیے سابقہ میعاد میں توسیع کی جاتی ہے اور اعلان کیا جاتا ہے کہ آخر دسمبر تک جو مضامین وصول ہونگے وہ مجلس انتخاب کے روبرو پیش کر دیے جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ جو اصحاب مضامین تیار کر رہے ہیں، وہ اس مدت کے اندر اندر اپنے مضامین ضرور بھیج دیں گے۔

'خافی خاں' کے جو دلچسپ مضامین گذشتہ ششماہی میں شایع ہوے تھے، وہ آخری جز کے اضافہ کے بعد اب "تاریخ اندور" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں جن صاحب کو مطلوب ہوں الناظر ایجنسی سے طلب فرمالیں۔ قیمت عہ ر ہے

میرے دیرینہ کرم فرما سید مقبول حسن وصل بلگرامی شروع سال سے ایک رسالہ ادیب (الہ آباد) اور العصر (لکھنؤ) کے انداز پر نکالنے والے ہیں۔ رسالہ کا نام مرقع تجویز کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا اگرچہ اس قسم کے پرچوں کے لیے بظاہر ناموافق ہے تاہم وصل صاحب قابل ستایش ہیں کہ اُنھوں نے ایک اعلیٰ درجے کا مصور رسالہ جاری کرنے کی ہمت فرمائی۔ اللہ تعالےٰ اُنکی کوششوں کو کامیاب کریں۔

ہماری درخواست پر ایک عزیز مخلص نے ہندوستان کی جدید تمدنی زندگی کے متعلق الناظر میں ایک سلسلۂ مضامین تحریر فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ جسکی پہلی قسط "جہاد یہ" کے نام سے اسی نمبر میں نذر ناظرین کی جاتی ہے۔ "ریف" مین امیر عبدالکریم برسر جہاد نہ ہوتے تو شاید "ریفایل" کا نام "عزرائیل" کا ہموزن ہونے کے باوجود بھی زیادہ خوفناک نہ معلوم ہوتا۔ اور اس میں کسی تبدیل کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی۔ لیکن حالاتِ موجودہ میں قطعاً اندیشہ ہے کہ بعض طبعیتوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ اور بدیسیوں کے مقابلہ میں نہیں تو دیسیوں کے خلاف تحریری جہاد کا الزام الناظر اور اُسکے قلمی معاون پر عائد کیا جائے۔ اس لیے آیندہ اس سلسلہ کے مضامین ریفایل کے بجائے "رفیل" کے نام سے شایع ہوں گے جو ایک مشہور مصور کا نام ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں جبکہ فنون لطیفہ کو وحی والہام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے، زیادہ مقبول ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

الناظر کے انتخابات شایع کرنے کا عرصہ سے خیال تھا۔ گذشتہ سال چند جلدیں مرتب کی گئی تھیں جن میں سے پہلی جلد چھپنا شروع ہو گئی تھی اور جیسا کہ جنوری نمبر میں لکھا گیا خیال تھا کہ عبدالماجد صاحب کا مجموعہ مضامین مارچ اپریل تک شایع ہو جائیگا۔ مگر بعض اسباب سے طباعت میں تاخیر ہوئی۔ اب مضامین طبع ہو گئے ہیں، صرف دیباچہ، فرہنگ اصطلاحات اور فہرست اسماء وغیرہ چھپنا باقی ہیں۔ کتابت ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ ۱۵- دسمبر تک مجموعہ مکمل ہو جائیگا۔ "فلسفیانہ مضامین" کا حجم ۳۰۰ صفحے سے زائد ہوگا۔ قیمت عہ تجویز کی گئی ہے۔ دوسرے مجموعہ میں مسٹر سلطان حیدر جوش کے افسانے اور ادبی مضامین ہیں۔ اسکا حجم ۴۰۰ صفحے سے اوپر ہے۔ تقریباً نصف چھپ چکا ہے اور اُمید ہے کہ جنوری ۱۹۲۶ء میں شایع کیا جا سکے۔ قیمت عہ ہوگی۔ تیسرا مجموعہ "بزرگان دین" کے نام سے مرتب ہو رہا ہے۔ اس میں حضرت عبداللہ کے وہ مضامین ہیں جن میں اولیائے کرام کے حالات لکھے گئے ہیں۔ قیمت غالباً عہ ہوگی۔ اسکے بعد جو مجموعے مرتب ہونگے اُنکا اعلان انشاءاللہ سال آیندہ ہوگا

البتہ اُن علوم سے مستبد لرزہ براندام رہتا ہے جو ظلم کی گھنگھور گھٹاؤں کو چھانٹتے ہیں، جہالت کی تاریکیوں کو چاک کرتے ہیں، دماغوں کو روشن کرتے ہیں، دلوں کو سنگ خارا بناتے ہیں، خمیدہ سروں کو اُٹھا کر بلند کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فلسفہ و حکمت، سائنس، قوانین دول، علم حقوق الانسان، علوم سیاست، مفصل تاریخ، اور ادبی خطابت وغیرہ حریت پرور علوم و فنون اسکے لیے سوہان روح ہوتے ہیں۔ وہ اُن تمام علوم سے ڈرتا ہے جو انسان کو بتاتے ہیں کہ انسان کیا ہے؟ اُس کے حقوق کیا ہیں؟ وہ مظلوم تو نہیں ہے؟ کس طرح حقوق طلبی کرنا چاہیے؟ کس طرح حقوق کی حفاظت کرنا چاہیے؟

مستبد، خیانت کا "عاشق" ہوتا ہے اور علماء اسکے "ناصح" ہیں۔ مستبد بزدل ہوتا ہے اور علماء، حق کی بے باک گرج ہیں۔ مستبد، خود غرضی کا مجسمہ ہوتا ہے اور علماء صداقت کی بے پناہ ضرب ہیں۔ اس طرح مستبد حکمرانوں اور علماء حق کے مابین ایک وسیع خلیج حائل ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ دونوں کا اجتماع آگ پانی کا اجتماع ہے۔

مستبد علم کو جس طرح اُسکے نتائج کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے۔ اسی طرح خود اُسکی ذات سے بھی نفرت کرتا ہے، اور یہ اس لیے کہ علم کا دبدبہ سب دبدبوں سے زیادہ ہوتا ہے، اُسکے عظمت و جلال کے آگے دنیا کے تمام جاہ و جلال پست ہو جاتے ہیں۔ مستبد جب اپنے سے زیادہ کسی میں علم دیکھتا ہے تو اُداس ہو جاتا ہے اور اپنے تئیں اُسکے مقابلہ میں حقیر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہرگز کسی ذہین عالم کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور اگر کسی ڈاکٹر، انجینیر ... کی طرف رجوع ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے تو کوشش کرکے کسی خوشامدی اور ذلیل النفس کو منتخب کرتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ مستبد جس کسی کی عزت افزائی کرے، سمجھ لو کہ وہ انتہا درجہ کا خوشامدی، چاپلوس، اور ناکارہ ہے، گو ظاہر میں کتنا ہی دانا و علامہ معلوم ہوتا ہو۔

غرضکہ استبداد اور علم میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ برپا ہے، اہل علم کی کوشش ہوتی ہے کہ علم کی روشنی ہر جگہ پھیلے، اور مستبد حکام اُسکے بجھانے میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں، عوام درمیان میں ہیں جنھیں فریقین اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں، کون عوام؟ وہ جو اگر جاہل ہوتے ہیں، ڈرتے ہیں، اگر ڈرتے ہیں تو جھک جاتے ہیں، لیکن جب علم سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں تو بولتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو کر گزرتے ہیں۔

عوام، مستبد کی غذا اور اسکا زور بازو ہیں، وہ انھیں کے بوتے پر کودتا اور خود انھیں پر

ظلم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ وہ کبھی اس درجہ ذلیل ہو جاتے ہیں کہ اگر مستبد اُنھیں قید کر دیتا ہے تو اُسکے جاہ و جلال کے ترانے گاتے ہیں، اگر توہین کرتا ہے تو اُسکی مدح سرائی میں رطب اللساں ہوتے ہین، اگر آپس میں لڑاتا ہے تو اُسکے تدبر کی تعریف کرتے ہیں، اگر اُنکے مال و دولت میں تصرف کرتا ہے تو اُسے سخی کہتے ہیں، اگر قتل کرتا ہے اور لاش کی بے حرمتی نہیں کرتا تو اُسے رحمدل قرار دیتے ہین، اگر موت کی طرف لیجاتا ہے تو سزا کے خوف سے دوڑے چلے جاتے ہین، اور اگر کوئی غیرتمند اُسکی مخالفت و مقاومت پر کمربستہ ہوتا ہے تو اُسے "باغی" کہکر قتل کرنے لپکتے ہین۔

غرضکہ عوام محض خوف اور وہم کی وجہ سے اپنے گلے پر آپ چھری پھیرتے ہین۔ وہم و خوف صرف جہالت کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر آفتاب علم طلوع ہوکر اُنکی آنکھوں سے جہالت کے پردے اُٹھادے تو وہ بے خوف اور نڈر ہو جائیں اور دیکھتے دیکھتے مستبد حکومت کی کایا پلیٹ دیں، یعنی مستبد کو مجبور کر دیں کہ ظلم و استبداد کے بجاے قوم کا ایسا امین و وکیل بن جائے جو بازپرس سے ڈرتا ہے، منصف سردار ہو جائے جو قوم کے انتقام سے خائف رہتا ہے، اور شفیق باپ بن جائے جسے اپنی اولاد کے پیار کرنے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔

جب قوم اس منزل مین پہونچ جاتی ہے کہ جہالت کی تاریکی کے بجاے علم کی شمع اُس کی رہنمائی کرنے لگتی ہے تو اُسے ہر طرح کی آسایش، ترقی، عزت، سعادت اور پُرمسرت زندگی حاصل ہوجاتی ہے، اسکے سردار اور حاکم کو بھی انتہائی مسرت ہوتی ہے، بلکہ سب سے زیادہ راحت و اطمینان اُسکے حصہ میں آتا ہے کیونکہ عہد استبداد مین وہی سب سے زیادہ بدبخت ہوتا ہے، ہمیشہ دشمنون سے گھرا رہتا ہے، نفرت و عداوت کی نظرون سے دیکھا جاتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی چین نہین پاتا۔

یہ مسلم ہے کہ مستبد اپنی رعایا سے اتنا ڈرتا ہے جتنا خود رعایا اُس سے نہیں ڈرتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے، مستبد کو رعایا کی قوت کا صحیح علم ہوتا ہے اس لیے ڈرتا ہے، مگر رعایا چونکہ اپنی قوت سے بیخبر ہوتی ہے اس لیے استبداد کے ہونے سے مری جاتی ہے۔ مستبد حق کے ہیبت انتقام سے لرزہ براندام رہتا ہے اور رعایا آپس کی خیالی نااتفاقی سے خائف رہتی ہے۔ مستبد اپنی زندگی اور جاہ و جلال کے زوال سے کانپتا ہے، اور رعایا روٹی کے چند ٹکڑون سے محرومی اور وطن سے علیحدگی کے خطرہ سے ڈرتی ہے۔ دونون کے خوف مین جو فرق ہے، ظاہر ہے۔

یہ حقیقت اُسوقت اور بھی زیادہ روشن ہوجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہین کہ جون جون استبداد مین زیادتی ہوتی جاتی ہے، مستبد کی وحشت و دہشت بھی بڑھتی جاتی ہے، رعایا کی ہیبت اُسے

بےچین کیے رکھتی ہے، اپنے خاص مصاحبوں سے بھی اُسے ڈر لگنے لگتا ہے، حتیٰ کہ آخر میں خود اپنے سایہ اور اپنے دل کے خیالات و وساوس سے بھی کانپنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمزور دل مستبدوں کا خاتمہ اکثر جنون پر ہوتا ہے۔

اسی بنا پر محقق مورخ جب نیروں اور تیمور جیسے ظالم فرماں رواؤں کے مابین موازنہ کرنے لگتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں اُن میں کون اپنی زندگی کو زیادہ عزیز رکھتا اور اسکی حفاظت میں زیادہ احتیاط برتتا تھا۔ اسی طرح نوشیروان اور صلاح الدین جیسے منصف بادشاہوں کا مقابلہ یوں کرتے ہیں کہ ان میں اپنی زندگی کی طرف سے کون زیادہ بےپروا اور مطمئن رہا کرتا تھا۔ کیونکہ حاکم کو اپنی جان کا زیادہ خطرہ اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ ظالم اور مستبد ہوتا ہے۔

اسی سبب سے اکثر قدیم مذاہب نے، جو عقیدۂ "خیر و شر" کو مانتے اور روشنی و تاریکی، آفتاب و زحل اور عقل و شیطان کے علٰحدہ علٰحدہ دیوتا تسلیم کرتے تھے، اپنے حلقہ بگوشوں کو بتایا کہ انسان کے حق میں سب سے زیادہ مہلک چیز جہالت ہے، اور جہالت کا سب سے زیادہ مضر نتیجہ خوف ہے۔ لہٰذا انھوں نے خوف کا ایک خاص دیوتا قرار دیا اور اُسکی پرستش میں لگ گئے، تاکہ اُسکے شر سے محفوظ رہیں۔

اسی دیوتا کی مناسبت سے کسی سیاسی انشاپرداز نے کہا ہے کہ میرے نزدیک ہر زمانہ میں مستبد کی مجلس، خوف کی وہی قدیم ہیکل ہے جس میں ظالم بادشاہ دیوتا ہے، اُسکے مصاحب کاہن ہیں، اُسکا میز قربان گاہ ہے، اُسکے قلم جھڑ ماین ہیں، اُسکے تعظیمی القاب دعائیں اور مناجاتیں ہیں، اُسکی رعایا قیدی ہے جسے پکڑ پکڑ کر اُس معبود پر بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔

انسانی طبیعت کے رازداں کہتے ہیں، کہ ہر قوم کی سیاسی استعداد یہ دیکھ کر بخوبی معلوم کیجا سکتی ہے کہ وہ بادشاہ سے کہاں تک مانوس یا متنفر ہے؟ اُسکے ہاں شاہی محل کتنے عالیشان ہیں، شاہی دربار کیسے شاندار ہیں؟ اور دربار کے آداب کہاں تک وسیع ہیں؟ اسی طرح قوم کی زبان بھی اُسکی جبلت پر روشنی ڈالتی ہے۔ جس زبان میں تکریم و تعظیم اور عجز و انکسار کے الفاظ زیادہ ہوں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قوم غلامی کی زیادہ خوگر ہے، اور جس زبان کا دامن اُن سے خالی ہو، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قوم بھی آزادی کی زیادہ دلدادہ ہے۔

غرضکہ استبداد اور علم کے مابین ایک عظیم جنگ برپا ہے۔ ہر مستبد حکومت، علم کی روشنی بجھاتے اور رعایا کو جہالت کے اندھیرے گھپ میں رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے، اسکے مقابلہ میں

علماے حق، جو استبداد ہی کی سنگلاخ چٹانوں سے پیدا ہوتے ہیں، علم کی روشنی تیز کرنے اور عوام کو روشن خیال بنانے کی جد وجہد برابر کرتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے علماء استبداد کے ہاتھوں سخت مصائب میں پڑجاتے ہیں، خوش نصیب ہیں وہ جو مصائب پر مصائب جھیلتے ہیں مگر نہ حق سے منہ موڑتے ہیں اور نہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں! اُنھیں وطن سے بوطن ہونا پڑتا ہے، دربدر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں، مگر پاے استقلال کو ذرا بھی جنبش ہونے نہیں پاتی۔

محققین نے مغربی ومشرقی ظالموں کا فرقِ مراتب بتایا ہے، مغربیوں کی نسبت اُنکی رائے ہے کہ وہ صرف اس علم سے ڈرتے ہیں جو انسان کو بتاتا ہے کہ آزادی کی موت بھی غلامی کی زندگی سے بہتر ہے۔ انسان کیا ہے؟ خودداری کسے کہتے ہیں؟ شرافت کے کیا معنی ہیں؟ حقوقِ انسانی کیا ہیں؟ کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں؟ کس طرح محفوظ رکھے جاسکتے ہیں؟ ظلم دفع کرنے کے طریقے کیا ہیں؟

برخلاف ان کے مشرقی مستبد علم کے نام ہی سے لرزاں وترساں رہتے ہیں، گویا اُنکا جسم بارود ہے اور علم ایک آگ ہے کہ قریب ہوتے ہی اُڑادیگی۔ وہ ہر علم سے ڈرتے ہیں، حتیٰ کہ کلمۂ توحید کے صحیح علم سے بھی بدحواس ہوجاتے ہیں، کیونکہ اُسکے معنی بجز اسکے اور کیا ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کیجائے۔ پرستش اظہارِ تذلل وخشوع کو کہتے ہیں، پس کلمۂ لاالٰہ الا اللہ کے معنی یہ ہوے کہ اللہ قادر کے علاوہ کسی اور کے سامنے اظہارِ ذلت ومسکنت وطاعت نہ کیا جائے ظاہر ہے مستبد حکمراں کسی طرح بھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اُس کی رعایا میں یہ روح پیدا ہو۔

بڑے بڑے مستبد ہی نہیں بلکہ معمولی درجہ کے مستبد بھی (جیسے مذہبی پیشوا، جاہل والدین، احمق شوہر، کمزور جماعتوں کے سردار) ہرگز پسند نہیں کرتے کہ انکے ماتحت لوگ سچے خداپرست بنیں، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جس قوم میں توحید علم ہوگئی، پھر وہ غلامی میں نہیں رہی اور اپنی ہتکڑیاں بیڑیاں توڑکر آزاد ہوگئی۔ لیکن بُرا ہو انسان کا کہ یہ سب جاننے پر بھی پروردگار کی طرف رجوع نہیں کرتا، اُسکی بیشمار نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا، سب کو چھوڑکر صرف اُسی کی چوکھٹ پر سر نہیں رکھتا، بلکہ نافرمانی وناشکری سے اپنے اور اپنے ہمجنسوں پر ظلم کرتا ہے۔

استبداد اور عزت

حکماء نے سچ کہا ہے کہ استبداد ہر فساد کی جڑ ہے۔ جب انسان کی شخصی اجتماعی زندگی میں

گہری بحث کی جاتی ہے تو یہ حقیقت اور بھی زیادہ روشن نظر آتی ہے کہ وہ استبداد ہی ہے جس نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو برباد کر رکھا ہے۔

پہلے بیان ہو چکا کہ استبداد پتھر کی سِل رکھکر عقل کو کس طرح دباتا ہے، مذہب کو اپنے ہاتھوں میں لیکر کس کس طرح بگاڑتا ہے اور علم کو جنگ کرکے کتنا نقصان پہونچاتا ہے۔ اس فصل میں یہ دکھانا ہے کہ انسانی عزت و شرافت کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتا ہے، کس طرح اُسپر چھاپہ مارتا ہے اور کیونکر اُسے اصلیت سے ہٹا کر جھوٹی عزت اور مصنوعی شرافت کا جامہ پہنا دیتا ہے؟

عزت کے کیا معنی ہیں؟ دنیا میں محبت و احترام حاصل کرنا۔ ظاہر ہے یہ مقصد نہایت اعلیٰ اور فطرت انسانی کا ایک قاعدہ ہے۔ ہر انسان کو اُسکی جستجو ہے، ہر کوئی اُسکا دلدادہ و شیدا ہے، انبیاء و اولیاء کو بھی اُسکی طلب تھی، اور معمولی سے معمولی اور غبی سے غبی کو بھی اُسکی دُھن ہے۔ عزت میں ایک خاص روحانی لذت ہے جو انسان کو اُتنی ہی مرغوب ہے جتنی ولی کامل کو عبادت، فلسفی کو حکمت، بادشاہ کو ہفت اقلیم کی حکومت، اور فاقہ مست کو پڑی ہوئی دولت۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی راہ میں انسان اپنا تن من دھن سب کچھ لُٹا دیتا ہے۔

مدت تک علماء میں بحث رہی کہ زندگی کی خواہش زیادہ قوی ہے یا عزت کی؟ بالآخر متاخرین نے یہی فیصلہ کیا کہ آزاد اور غیور انسان عزت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، اور غلاموں کی نظر میں زندگی کا رتبہ عزت سے اونچا ہے۔

عزت کا راستہ یہ ہے کہ انسان جماعت کے فائدہ کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی کرے۔ اس حقیقت کو مشرقی حکماء اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ خدا یا مذہب کی راہ میں قربانی کی جائے۔ اور مغربی اسے انسانیت اور وطنیت کی راہ میں قربانی کہتے ہیں۔ لیکن مقصد دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی جب فرد جماعت کیلئے اپنا کچھ نقصان کرتا ہے تو جماعت کی نظروں میں عزت حاصل کر لیتا ہے۔

جماعت کے لیے فرد کی قربانی کئی قسم کی ہوتی ہے: مال کی، اور یہ ادنیٰ ترین قربانی ہے۔ علم کی، اور یہ متوسط درجہ کی قربانی ہے۔ حق و انسانیت کے نام پر جان کی، اور یہ اعلیٰ ترین قربانی ہے۔ اسی کی کشش حوصلہ مندوں کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی اور من چلوں سے جان و دل کا نذرانہ مانگتی ہے۔ نہیں معلوم اسکا حسن کس غضب کا دل رُبا ہے کہ ہزاروں پروانوں کی طرح دیوانہ وار اُس پر سے قربان ہو گئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے کسی کی زبان پر اُف تک نہیں، سب خاموش ہیں مگر بیتابانہ اُس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن اِس متفرد نازنین

کے عشق کا دعوٰی ہر کس و ناکس نہین کر سکتا، اُسکی راہ کانٹون سے بھری ہے، قدم قدم پر اژدہے مُنہ پھاڑے کھڑے ہین، اِس راہ کے رہرو کو سر کے بھل چلنا پڑتا ہے، کُلیوں خون تھوکنا ہوتا ہے، اسکی جرأت اکثر وہی کرتے ہین جنکی خاندانی شرافت صدیون سے بے داغ ہے یا جن میں مجاہدوں اور فدائیون کا سلسلہ بالکل منقطع نہین ہوگیا ہے۔

عزت! ہان عزت ہی وہ اوجِ انسانیت ہے جسکی راہ مین بہادر ہمیشہ سر فروشیان کرتے اور اپنے خون سے اُسے گلگشت بناتے آئے ہین۔ "نیرو" نے "اگرین" شاعر سے خنجر کے نیچے پوچھا "سب سے زیادہ بدبخت کون ہے؟" ظالم شاہنشاہ کا خیال تھا کہ شاعر خود اپنی طرف اشارہ کرے گا مگر اُس بہادر نے حقارت کے ساتھ مُنہ پھیرتے ہوے کہا: "سب سے زیادہ بدبخت وہ ہے جو اپنے ظلم کیلیے دنیا بھر مین ضرب المثل ہو رہا ہے!" (یعنی خود نیرو)۔ عدل پرور "ٹراجان" کا دستور تھا کہ جب اپنے کسی سپہ سالار کی کمر مین تلوار باندھتا تو کہتا "یہ قوم کی تلوار ہے، مجھے امید ہے کہ قانون شکنی نہ کر کے میں اپنی گردن ہمیشہ اس سے بچائے رکھون گا" ولید بن عبد الملک کا استبداد معلوم ہے لیکن ایک مرتبہ قیس برہم ہوکر اسکے یہ کہتے ہوے اُٹھ گئے: "کیا تو جبار بننا چاہتا ہے؟ واللہ ایک تہیدست فقیر کی جوتی تیری تلوار سے بہتر ہے!" ایک اوالوالعزم سے کہا گیا: "تیری تمام جد وجہد کا نتیجہ بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ اور زیادہ پریشانی مول لے" اُس نے جواب دیا: "مرحبا، وہ پریشانی کس قدر لذیذ ہے جو ظالمون کی زندگی تلخ کرنے سے حاصل ہوتی ہے!" ایک اور فدائی سے اسی قسم کا سوال کیا گیا، اُس نے کہا: "مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے، نتیجہ سے بحث کرنا میرے لیے غیر ضروری ہے"۔ ایک اور سر فروش سے کہا گیا: "گھر کیون نہیں بناتے؟" بولا: "گھر میں کون رہے گا جبکہ میرا مسکن یا گھوڑے کی پیٹھ پر ہے یا قید خانہ کی کوٹھری مین یا قبر کے گوشہ مین؟" اسماء بنت ابی بکر بوڑھی ہو چکی تھیں، پیری نے کمر جھکا دی تھی مگر دل اُسی طرح قوی تھا، بیٹے کو یہ کہکر شہادت کے لیے رخصت کرتی ہیں: "اگر حق پر ہے تو جا حجاج سے لڑ یہان تک کہ موت آ جائے!"

غرضکہ عزت ہی وہ گوہر مقصود ہے جس پر ہر دل فریفتہ اور ہر آنکھ للچائی ہوئی ہے! عدل و انصاف کے زمانہ مین اسکا حصول آسان ہے اور ہر کوئی اپنی استعداد کے مطابق اُس سے اپنا حصہ لے لیتا ہے، لیکن عہد ظلم و استبداد مین اُسکی اگر کوئی سبیل ہے تو صرف یہی کہ ظلم کی مقاومت اور قیام حق کے لیے سر فروشی کی جائے

یہ تو حقیقی عزت ہے، لیکن اسکے مقابلہ میں ایک اور بھی عزت ہے جسے جھوٹی عزت کہتے ہیں

وہ کیا ہے؟ ایک نہایت بُری اور شرمناک چیز! میرا قلم آگے بڑھتے ہوے جھجکتا ہے کہ مبادا بعض ناظرین کے احساس کو ٹھیس لگے۔ لیکن میں اُنکے ضمیر سے اپیل کرتا اور مظلوم حق کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہون کہ ایک لمحہ کے لیے ذاتیات سے الگ ہوکر میرے بیان پر غور کرین۔

جھوٹی عزت، مستبد پایۂ تختوں میں پائی جاتی ہے اور مستبد بادشاہون کی قربت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ قربت یا تو عملاً ہوتی ہے مثلاً بادشاہ کی مصاحبت و ملازمت نصیب ہو جائے، یا بالقوۃ ہوتی ہے مثلاً اعزازی خطاب، تمغے یا انعامی تلوارین ملجائیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہین کہ جھوٹی عزت مستبد کے تکبر و تجبر کی جہنم کا ایک بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جو اپنے طلبگار کو اسلیے ملجاتا ہے کہ انسانیت و شرافت کو جلا کر خاکستر کر دے۔ یا زیادہ صحیح طور پر یوں کہو کہ جھوٹی عزت یہ ہے کہ اُسکا شیدائی ظلم پیشہ بادشاہ کی طرف سے تلوار باندھ کر ثابت کرتا ہے کہ استبدادی حکومت کا جلاد بن گیا، سینے پر تمغہ لگا کر ظاہر کرتا ہے کہ اُسکے اندر ایک ظلم پسند دل ہے، یا کلابتونی فیتہ لگا کر بتاتا ہے کہ وہ مرد ہونیکے بجاے عورت ہے۔ مختصر یہ کہ جھوٹی عزت وہ ہے جسکے حاصل ہو جانے کے بعد انسان بڑے مستبد کے زیرسایہ چھوٹا مستبد بنجاتا ہے۔

مستبد حکومتوں کے ہاں صرف جھوٹی عزت ہوتی ہے، یہ اس لیے کہ آزاد حکومت یعنی قوم کی سچی نمایندہ حکومت کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اصولِ مساوات توڑ کر قوم کے افراد مین کوئی امتیاز پیدا کرے۔ وہ صرف اُنھین لوگون کو خطاب یا تمغے دیتی ہے جو اپنی ملکی و قومی خدمات سے اپنے تئین اسکا اہل ثابت کر دیتے ہین، نااہلوں کے لیے ایسی حکومت مین کوئی جگہ نہین ہوتی۔

انگلستان میں "لارڈ" کا خطاب گو عہدِ استبداد کی یادگار ہے مگر چونکہ ملک بیدار ہے اور حکومت مین بہت زیادہ دخل رکھتا ہے اس لیے یہ خطاب اکثر ایسے ہی لوگون کو ملتا ہے جو قوم کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دے چکتے ہین، نیز اپنے اخلاق، دولت اور ذاتی قابلیت کی بنا پر مزید خدمت کے اہل ہوتے ہین۔ لیکن بایں ہمہ انگریزون کی نظر مین اِس خطاب کی کوئی خاص وقعت نہیں، وہ کسی شخص کی عزت محض اُسکے لارڈ ہونے کی وجہ سے نہین کرتے جب تک اُسکی پیشانی پر حب الوطنی کے قلم اور غیرت ملی کی روشنائی سے ایک تحریر نہ لکھی ہو کہ "شرافت کی قسم! مین قومی ناموس اور قومی آزادی کا ہمیشہ نگہبان رہون گا!"

جھوٹی عزت کا وجود قدیم قومون میں نہ تھا اور اگر کچھ تھا تو صرف بادشاہوں کے دوسرے اہلِ بیت اور شاہزادون اور نوابون کے فرزند اور متعلقین تک محدود تھا۔ لیکن قرونِ وسطیٰ مین اسکی خوب گرم بازاری

ہوئی اور سیاہ بادل کی طرح وہ تمام فضائے انسانیت پر چھاگئی، یہاں تک کہ اب آفتاب حریت نے طلوع ہوکر اُسے ہرطرف سے چھانٹنا شروع کر دیا ہے۔

جھوٹی عزت والے یہ ظاہر کرکے پبلک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے معاملات میں ہر طرح آزاد ہیں، جو طرز عمل چاہیں اختیار کرسکتے ہیں، ہماری عزت بالکل محفوظ ہے! آبرو بے داغ ہے۔ حالانکہ یہ ایک سفید جھوٹ ہے، یہ لوگ نہ تو آزاد ہوتے ہیں اور نہ انکی عزت و آبرو ہی محفوظ ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنی جھوٹی عزت قائم رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ مجبور رہتے ہیں کہ مستبدوں کی ہر قسم کی اہانتیں برداشت کریں، صرف برداشت ہی نہیں بلکہ انھیں ہرطرح چھپائیں؛ اگر چھپا نہ سکیں تو سراہیں، حقیقت کی پردہ پوشی کریں، اور ہر اُس شخص کی مخالفت کریں جو حقیقت کو ظاہر کرے۔ یہی نہیں بلکہ مستبد کی رضا جوئی کے لیے قوم پر جبر و تشدد کریں اور دماغوں کو اس تصور سے بھی بجبر باز رکھیں کہ مستبد سے ظلم سرزد ہو سکتا ہے۔

اس طرح یہ جھوٹی عزت کے شیدائی عدل و انصاف کے دشمن اور ظلم و جور کے حامی ہوتے ہیں، اور مستبد بادشاہوں کی غرض بھی انھیں جھوٹی عزت دینے اور سالانہ انکی تعداد بڑھانے سے یہی ہوتی ہے کہ انکے ذریعہ پبلک کو بآسانی دھوکہ دے سکیں اور قومی مصلحت کے نام سے خود اسے قومی بربادی کا ذریعہ بنا سکیں۔ چنانچہ اگر مستبد محض اپنا استبداد اور ہوا و ہوس پوری کرنے کے لیے ملک کو جنگ کے تنور میں جھونک دیتا ہے تو بھی یہ جھوٹی عزت والے قوم سے یہی کہتے ہیں کہ یہ لڑائی حق و انصاف اور مذہب کی تائید میں ہے۔ اگر وہ قوم کا لاکھوں روپیہ اپنی خواہشاتِ نفسانی اور ظلم و استبداد کی تقویت میں صرف کر دیتا ہے تو بھی یہ قوم سے یہی کہتے ہیں کہ قومی عظمت کی نمائش کے لیے بادشاہ کی یہ شان و شوکت ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے شخصی دشمنوں کو قومی فوج کے ذریعہ پامال کر ڈالتا ہے تو بھی یہ قوم سے یہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملک کے دشمن تھے اور انکا صفایا ضروری تھا۔ اگر وہ ملک میں ہرطرح کے ظلم و استبداد سے حکومت کرتا ہے تو بھی یہ قوم کو یہی سمجھاتے ہیں کہ مصلحت و سیاست کا مقتضا یہی ہے، ملک کی ترقی کا راستہ یہی ہے، بددل نہ ہو، شکر کرو اور اپنے حاکم پر بھروسہ رکھو۔

مستبد بادشاہ کبھی چند ایسے لوگوں کو بھی جھوٹی عزت دیدیتا ہے جو بالکل بے ضرر اور نیک ہوتے ہیں۔ وہ انھیں اُسی ضرورت سے اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے جس ضرورت سے دغاباز تاجر اپنی دوکان میں چند اچھے نمونے رکھتا ہے تاکہ خریداروں کو دھوکہ دے سکے۔ ورنہ مستبد عموماً انھیں لوگوں کو منہ لگاتا ہے جو حد سے زیادہ رذیل اور بدنفس ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ عہد استبداد "عہد رذالت و سفالت" ہے۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- مکرم مہدوی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت جنید
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام

میر علی اسعد بی اے
- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- 〃 جلد دوم
- 〃 جلد سوم
- 〃 جلد چہارم

سید اس مسعود بی اے
- آفتاب زرین
- نصاب اردو
- باغ تعلیمی نظم

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کلیات دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر
- زہرا

مسٹر مظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفۂ سائنس
- بادل کے بچے
- خونابۂ عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت
- مینا

منشی عبد المجید سالک بی اے
- [illegible]
- چمپا و دیگر افسانے
- [illegible]

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- [illegible]

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلائیو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفے
- صحف سماوی
- شمع سخن

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- اسرار حق
- جذبات فطرت
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان
- خلافت اور دنیائے اسلام

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرت عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ
- سیر الانصار
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق
- اسوۂ حسنہ
- میلاد نامہ جدید
- ترکی اور یورپ

مولوی محمد یونس فرنگی محلی
- [illegible]
- ابن رشد

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- سیپارۂ دل
- گم نو موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی
- خطوط نظامی
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جنگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- سیر دہلی
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو کی دعائیں
- تسکین احساس
- روزنامچہ ہند
- قیدیوں کے غیبی نوشتے
- اسلام کا انجام
- تسخیر مہر و قمر

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی
- در شہوار
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- بنت الوقت
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- آفتاب دمشق
- سمرنا کا چاند

نیاز فتحپوری
- گیتانجلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس

ملنے کا پتہ:۔ النّاظر بک ایجنسی لکھنؤ